پنجگور

تاریخ و شخصیات



خالد بلوچ

پنجگور

تاریخ و شخصیات

خالد بلوچ

پبلشر

عزت اکیڈمی پنجگور بلوچستان

نام کتاب .... پنجگور تاریخ وشخصیات

مصنف .... خالد بلوچ

سن اشاعت 2012

تعداد 500

قیمت .... -/300

کمپوزنگ .... بلوچستان گرافکس پنجگور

.... بالٹک کمپیوٹر چتکان پنجگور

پرنٹرز .... یونائیٹڈ پرنٹرز، کوئٹہ

پبلشر .... عزت اکیڈمی پنجگور

ISBN : 978-969-9812-00-2

فہرست

بٹتے رہوگے تو اپنا یونہی بہے گا لہو
ہوئے منہ ایک تو منزل نہ بن سکے گا لہو

(حبیب جالب)

عرض مصنف

یہ کتاب لکھنے کا بنیادی مقصد اس خطے کی تہذیب و تمدن ثقافت اور رسم رواج اور تاریخ سے جڑی ان حالات و واقعات کو تاریخی تناظر میں اجاگر کرنا ہے جو کہ بلوچ و بلوچستان کی تاریخ کے بنیادی محور و منبع ہیں اور دوئم اس پورے خطے کے اندر اور خاص کر بلوچستان کی تاریخ میں اس خطہ کو وہ تاریخی اہمیت حاصل ہے جو شاید کسی علاقے کو حاصل ہو، اور یوں درست اور صحیح سمتوں سے روشناس کرانا مقصود ہے۔ یہ تاریخی لحاظ سے قدیم تہذیبی، ثقافتی، تجارتی اور عسکری لحاظ سے ایک اہم علاقہ جانا جاتا ہے۔ جس کے تاریخی اور تہذیبی آثار ہزاروں سال قدیم ہیں۔ اس پورے خطے میں مکران ایک قدیم ترین خطہ ہے جو کہ پانچ ہزار سے سات ہزار سالوں پر محیط ہے۔ اور یہ خطہ بلوچ و بلوچستان کی تاریخ و قدیم تہذیب و تمدن میں ایک نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں بہت زیادہ تحقیق و تجسس کی گئی ہے اور بہت سی نئی اور قدیم کتابیں تحریر ہو چکی ہیں مگر اس بارے میں مزید حد درجہ تحقیق و تجسس و معلومات کی ضرورت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس خطے کے اندر بلوچ قوم کے وارد و سکونت، عروج و زوال، جداگانہ شناخت و تشخص، تہذیب و تمدن اور ثقافت سے قدیم تاریخ کے ساتھ ایک جدید تاریخ بھی معرض وجود میں آئی تھی۔ بلوچ سرزمین جن کی سرحدیں جنوب میں بحیرہ بلوچ (بحیرہ عرب) مشرق میں دریاء سندھ، شمال میں کوہ تکتو سے دریاء ہلمند اور مغرب میں دشت لوط تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ خطہ جغرافیائی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے قدیم عہد سے جدید عہد تک یکساں طور پر غیر معمولی اہمیت کا حامل خطہ رہا ہے۔

وسیع بلوچ ساحلی پٹی جو لسبیلہ سے چابہار تک اس خطے کو جغرافیائی، سیاسی، معاشی اور عسکری نقطہ نظر سے عالمی اہمیت کا حامل بناتا ہے۔ اور دوسری جانب عالمی اہمیت کا آبنائے ہرمز جہاں اس وقت دنیا کا ستر فیصد تیل گزرتا ہے جس پر چین، جاپان اور یورپ کی معیشتوں کا انحصار ہے۔ جو ساحل بلوچستان سے محظ صرف 185 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ اس لئے اس ساحل پر جس کا جتنا غلبہ ہو دنیا کی بڑی معیشت اسی کے دسترس میں ہوگا۔

علاوہ ازیں یورپ و ایشیاء کے درمیان تیل کی ترسیل، تجارت عسکری ساز و سامان بھی اسی واحد آبی گزرگاہ کی مرہون منت ہے۔ یہ یقینی طور پر دنیا کی طاقت ور ترین اور معاشی طور پر ابھرتی ہوئی ممالک کیلئے ریڈھ کی ہڈی کی حیثیت سے کم نہیں یہ خطہ Geo stratagics اہمیت کی وجہ سے ماضی اور حال کے برعکس مستقبل میں شدت سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا۔

اس بلوچ خطے کے عالمی اہمیت کا اندازہ بخوبی یوں لگایا جاسکتا ہے کہ مشرق وسطیٰ سمیت چین و افغانستان کو زمینی راستے سے ملانے کا ذریعہ مکران ہی سے گزر کر جاتا ہے۔

گوادر پورٹ کو مکران کے راستے مشرق وسطی سے ملانے اور ریلوے لائن جیسے عظیم منصوبے اور مستقبل قریب میں اس سے گزرنے والی تین ملکی گیس پائپ لائن بھی کم اہمیت کا حامل نہیں۔ اسی طرح عسکری و فوجی لحاظ سے اہمیت کا حامل اورماڑہ نیول بیس (Ormara Neval Base) جو بحیرہ بلوچ کے اس مقام پر واقع ہے جہاں سے ایران و خلیجی ممالک سمیت دنیا کے ایک تہائی حصے کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

قدرتی وسائل سے مالا مال اس خطے کے عوام اپنی سرزمین اور قومی شناخت و تشخص کیلئے بارہا ملکی و غیر ملکی قبضہ گیروں اور تسلط پسندوں و توسیع پسندوں سے نبرد آزما رہے ہیں۔

اس خطے کے باسی نہ صرف مہم و لشکر کشیوں، جنگوں میں تابناک اور طویل تاریخ رکھتے ہیں بلکہ یہ مٹی پیار و محبت کی خوشنما رنگت و خوشبو اپنے اندر سمیٹتی رہی ہے جس سے ایثارِ وفاء، قول و قرار اور ان پر مر مٹنے کی عظیم روایتیں عہد بہ عہد رچی بسی عظیم قومی روایات رکھتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے اس خطے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہاں سے اسلام کی شمع اس پورے خطے کے اندر روشن ہوئی تھی۔ حقیقی معنوں میں یہ خطہ باب الاسلام بھی ہے۔

مگر تاریخی نقطہ نظر سے اس اہم خطہ کے ساتھ کبھی بھی اور کسی بھی طرح انصاف روا نہ رکھی گئی۔ چند محققین و مورخین جن میں ملکی و غیر ملکی بھی شامل تھے۔ بلوچستان اور خاص کر مکران کی صحیح و سچی تاریخی منظر کشی نہیں کی بلکہ بلوچ قوم کو نسلی، لسانی طبقوں اور گروہوں میں

منقسم ظاہر کر کے خود ساختہ و من گھڑت تضادات کو ابھارنے کی کوششیں کی ہیں۔ حالانکہ اِس میں کوئی دورائے نہیں کہ قومی لحاظ سے دنیا کے زیادہ تر اقوام میں یکسانیت نہیں ہوتی اور اسی حوالے سے بلوچ مورّخ و دانشور سردار خان گشکوری کے مطابق بلوچ ایک کثیر الجہتی نسل سے ہے جس میں بحیثیت قوم ابھرنے کی بھرپور صلاحیتیں موجود ہیں۔

اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ مکران ویسے ہی قبل از تاریخ اور ثانوی دور تک اندھیرے اور جہالت و تاریکی ہی میں رہی ہے اور بعد میں جدید دور کے ساتھ قدم رکھتے ہی قومی یکجہتی، اتحاد تنظیم اور بحیثیت قوم پرورش پانے کے فطری عمل سے بھی گزری ہے اور یوں قبضہ گیری و تسلط سے آزادی و خود مختار کی سوچ وفکر انہیں قومی شعور کے ابھارنے میں مدد دیتی رہی ہے۔ دراصل بلوچستان میں ان تمام معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں کے پس منظر میں پہلی عالمی جنگ کے بعد ابھرنے والی تحریکیں بھی بلوچ قوم پرستانہ سوچ وفکر کے بنیاد و ابتداء جانے جاتے ہیں جو وقت کے ساتھ بدلتی دنیا کے حالات و واقعات میں ڈھل کر بتدریج مستحکم ہوتا رہا ہے۔

یہ اپنی جگہ علمی و تحقیقی لحاظ سے ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی علاقے کی تاریخ، تہذیب وتمدن، زبان و ثقافت تک پہنچنے میں تحریری و غیر تحریری مستند دستاویزات، آثار قدیمہ، طرز زندگی اور قومی روایات اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ تاہم اس خطہ میں ذاتی آراء یا سماجی تقسیم و تعلقات کو بنیاد بنا کر اسے قبائلی گروہوں میں منقسم کر کے ضبط تحریر میں لا کر جامع و سچی تاریخ سے محروم رکھا گیا ہے۔

چونکہ اس سے بھی انکار نہیں کہ کچھ مورخین و محققین نے سچی و مستند جامع تاریخی حقائق کو بھی اجاگر کرنے کی کوششیں کی ہیں جو خود اپنی جگہ ایک الگ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو آج بلوچستان اور مکران کی سچی و حقیقی تاریخ کے نمائندہ عکاس ہیں۔ مکران ایک قدیم تاریخی خطہ ہے جس نے بڑے بڑے عروج و زوال و نشیب و فراز سے زمانہ قدیم سے زمانہ جدید تک تاریخی منزلیں طے کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں مختلف اقوام کی تہذیب

وتمدن وسنج نمارنگوں کی حسین امتزاج اوررسم ورواج کواپنے دامن میں سمیٹتا ہوااس دور میں داخل ہو چکا ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی بھی قوم مختلف علاقوں، خطوں اور سرحدوں میں منقسم ہونے کے باوجوداپنی قومی شناخت، تہذیب وتمدن، زبان وثقافت اورالگ شناخت کے ساتھ بحثیت قوم ایک مضبوط ومستحکم بندھن میں جڑا رہتا ہے۔ چونکہ بلوچ قوم اپنی جداگانہ شناخت وقومی تشخص کے ساتھ ایک بڑی اور وسیع قوم ہے جو دنیا کے مختلف علاقوں اور خطوں میں واضح طور پر منقسم ہے۔ تاہم بطور قوم اُن تمام مصائب ومشکلات وکھٹن طویل تاریخی سفر کے باوجوداپنی جداگانہ پہچان وشناخت کو برقرار رکھی ہوئی ہے۔

چونکہ یہ کتاب پنجگور کی تاریخ اور علمی وادبی شخصیات کے تذکروں کے باوجود مجموعی طور پران موضوعات کا تاریخی پس منظر میں احاطہ کریگی جو بلوچستان اور بلوچ قوم سے جڑے ہوئے ہیں۔ بلوچ قوم اور بلوچستان کا کوئی حصہ جہاں جہاں جس خطوں اور علاقوں میں واقع ہوں ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط ومستحکم قومی رشتوں میں مربوط ومنسلک ایک ہی لڑی میں پیوسط ہیں۔

اور مجھے یہ کتاب لکھتے ہوئے اس کا بار بار احساس ہوتا رہا کہ بلوچستان کے جن علاقوں، مقامات اورزبان، ثقافت، تہذیب وتمدن اورقومی روایات کا تذکرہ یقیناً ماضی کے ان تسلسل سے جاکرملتا ہے جو بحثیت قوم ہماری سب سے بڑی پہچان وشناخت ہے۔ اسی بناء پر میں بھی اس کتاب کومحظ پنجگور کی تاریخ وروایات تک محدود نہ کرسکا۔

بہرحال میں نے اس کتاب کو مجموعی تناظر میں تحریر کی ہے اور امید رکھتا ہوں اسے آپ بھی اسی تناظر میں پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرینگے اور میں نے ہرحال میں یہ کوشش کی کہ ماضی بعید میں رونما ہونے والے تاریخ، حالات اور واقعات کومستند وجامع حوالوں کی روشنی میں تحریرکروں تاکہ تحقیق وتجسس وتاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کے علم ومعلومات میں اضافے کا باعث ہو۔

جبکہ عام طور پر پنجگور کے ذکر کے ساتھ پنجگور کے وجہ تسمیہ کے متعلق بہت سے

سوالات اٹھائے جاتے ہیں جو کہ اس خطے کے متعلق آراء، حالات و واقعات پر مبنی تاریخی حوالے ہی خود اس علاقے کو قدیم زمانے سے ان کی تاریخی تعلق و رشتوں کو ظاہر کرتی ہیں۔

بہر حال پنجگور اپنی وجہ تسمیہ سے قطع نظر ایک ایسی عظیم اور قدیم تاریخ رکھتا ہے جس سے اس پورے خطے کی تاریخ، تہذیب و تمدن کی کھوج اور تحقیق و تجسس کیلئے نئی و درست راہیں متعین ہوتی ہیں اور اسی بناء پر ہمیشہ سے مورخین و محققین و اہل دانش کو اپنی جانب متوجہ کرتی رہی ہے۔

یہ خطہ اپنی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے بناء پر عہد قدیم سے جدید عہد تک یکساں طور پر بہت اہم ہے اور تیزی کے ساتھ بدلتی دنیا کے تناظر میں روز بروز اہم سے اہم تر ہوتا جارہا ہے جو کہ عالمی قوتوں کے لئے بہت پرکشش اثر و اہمیت رکھتا ہے۔

چونکہ تمام حوالوں سے اس قدیم تاریخی خطے کا احاطہ اتنا آسان اور ممکن نہیں۔ پھر بھی یہ کتاب ''پنجگور تاریخ و شخصیات'' اس کا برملا اظہار ہے کہ علمی و تحقیقی نقطہ نظر سے ایک جامع و مستند دستاویز تو نہیں، لیکن ذاتی طور پر اس رائے پر قائم ہوں کہ تمام تر ذاتی رائے و سوچ و فکر سے بالاتر ہو کر اختصار سے اس علاقے کی قدیم تاریخ کے ساتھ تہذیب و تمدن، سیاست ثقافت اور اس سے جُڑی تمام ان حالات و واقعات کو مخصوص پیمانے پر اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی نقطہ نظر سے یہ یقینی طور نہایت ہی مستند و مفید اور نتیجہ خیز تاریخی کتاب ہے۔ ''پنجگور تاریخ و شخصیات'' لکھتے ہوئے مجھے شخصیات کے انتخاب میں کافی دشواریاں پیش آئے۔ لیکن بالا آخر میں نے محظ ان علمی و ادبی شخصیات کا انتخاب کیا جنہیں یقینی طور پر علمی و ادبی پیمانے پر اپنا آئیڈیل گردانتا رہا ہوں۔ اور میں اس سے بخوبی واقف ہوں کہ میری ذہنیت و سوچ کے پیمانے سے باہر بھی قابل احترام و معتبر علمی و ادبی شخصیت ہونگیں جو کہ ممکن ہے ان پر لکھنے اور ان کے شخصیات کے مختلف پہلوؤں کو جانچنے کی ضرورت ہے۔

بہر حال مجھے قوی یقین ہے کہ یہ زمین کبھی بھی بانجھ ہے نہ ہوگی۔ اور مستقبل میں بھی ایسے علمی و ادبی شخصیات ابھر کر سامنے آئینگیں جن پر نہ صرف پنجگور بلکہ پورا خطہ ہی ناز

کریگی۔ ''پنجگور تاریخ وشخصیات'' یقیناً تاریخی پس منظر اور اس خطے سے جڑی ہوئی حالات وواقعات کا مکمل نہ سہی اختصار سے ضرور احاطہ کریگی۔ مجھے امید ہے کہ یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے پنجگور پر تحریر ہونے والی پہلی کتاب کے طور پر تاریخ کا حصہ بنے گی۔

بس اتنا ہی کافی نہیں......

اسے محظ کھلی فضاء میں بارش کی پہلی بوندھ جان لینا ہی کافی ہے۔

سفر میں قدم بڑھے ، تو دھوپ سائبان بنے
زمین نہ ہو قدم تلے ، تو کیسے آسمان ملے

خالد بلوچ

یکم مارچ2012

پنجگور بلوچستان

پیش لفظ

خالد بلوچ پنجگور کے جانے پہچانے سیاسی اور سماجی نوجوانوں میں سے ایک ہیں۔ جو زیرک بھی ہے اور محنتی بھی، اور ان کو شروع ہی سے لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کا شوق رہا ہے۔ اس کے مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ کتاب ان کی انتھک کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ کتاب لکھنے کی ان کی یہ پہلی کوشش ہے۔ امید ہے قارئین کیلئے بہت دلچسپی کا حامل ہوگا۔ ان کی یہ کتاب بہت سے اہم موضوعات پر محیط ہے۔ جس سے ہر طبقہ فکر کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں۔ پڑھتے وقت ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ہر بات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ یہ کس حد تک مفید ہے۔ یہ کتاب خالد جان کی علمی محنتوں کا نچوڑ ہے۔ انہوں نے اپنی محدود علمی اور تکنیکی وسائل کے باوجود اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ یہ ایک قابل ستائش بات ہے۔

سال بھر کی بات ہے کہ خالد بلوچ نے کہا تھا کہ وہ پنجگور پر ایک کتاب تحریر کر رہے ہیں، جو انہوں نے کر ہی دی۔ اور اس کے مسودے کی ایک صاف کاپی مجھے بھیج دی۔ اس سلسلے میں ان سے وقتاً فوقتاً بات چیت بھی ہوتی رہتی رہی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ کس انہماک اور جانفشانی کے ساتھ اس کتاب کو تکمیل تک پہنچایا ہے۔ بہت سے اور ممانعات کے علاوہ فنی وسائل کی کمی اس میں آڑے آتی رہی ہے۔۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب لکھنا ایک تحقیقی کام ہے۔ اور ایسے کام میں بنیادی بات جو ذہن میں ہوتی ہے وہ ہے معیار اور اس کے لئے محنت اور وقت درکار ہوتا ہے۔

پنجگور ایک دور آفتادہ خطہ ہے۔ اور آج کل گھمبیر حالات میں گرا ہوا ہے، جس کی وجہ سے ایک ہیجانی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ اور ایسے ماحول میں مطالعہ و تحریر کا ماحول پیدا کرنا کارے دارد۔ کتاب لکھنے کیلئے کتابوں کا میسر ہونا لازمی بات ہے۔ جو اس خطے میں نایاب اور مفقود ہیں لیکن اس کے باوجود خالد بلوچ نے بہت محنت کر کے کتاب کیلئے اچھا مواد اکٹھا کیا ہے۔

کتاب موضوعات کے حساب سے کئی ابواب پر مشتمل ہے۔اس نے اس کتاب میں قارئین کو ماضی کے تاریخی جھروکوں سے گزار کر حال کے حالات سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔جو بہت محنت طلب کام ہے۔اس نے ابتدائیاں کے ابواب میں قارئین کو مکران اور پنجگور کی مختصر تاریخ سے روشناس کرایا ہے۔

پنجگور مکران کا ایک تاریخی اور اہم حصہ ہے۔اور مکران بلوچ کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔اور سچ تو یہ ہے کہ بلوچستان کی ابتدائی تاریخ کا گہوارہ رہا ہے۔جیسے کہ باور کیا جاتا ہے کہ بلوچ صدیوں پہلے حلب اور کردستان کے پہاڑی سلسلہ سے نقل مکانی کر کے caspian Sea کے جنوبی علاقوں میں بستے اور پھیلتے ہوئے موجودہ کرمان اور مکران کے علاقوں کو آباد کرتے رہے۔اور ہزاروں سال یہاں بودوباش کیا اور وقت کو حالات کے ساتھ آگے بڑھتے بڑھتے موجودہ بلوچستان کے علاوہ سندھ و ہند اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں پھیل گئے۔

مکران بہت قدیم خطہ ہے۔ایک لحاظ سے ہم کہ سکتے ہیں کہ کرمان مکران وسیستان کے علاقے ہی بلوچ کا ابتدائی ہنکین (مسکن) رہے ہیں۔قدیم زمانے سے مکران کو ایران کے علاقہ کرمان اور سیستان سے نسبت رہا ہے۔بلکہ سیستان آج بھی اسی طرح بلوچ ایریا ہے جتنا مکران۔اسلئے اس نسبت کو تاریخی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے اور پرکھا جائے۔

مکران جس کو ہم آج دیکھتے ہیں یا مکران کے جس دور کے تاریخ کا خالد بلوچ ذکر کرتے ہیں یا کوئی اور کرتا ہے۔یقیناً وہ موجودہ مکران نہیں ہے۔مکران عملاً مغربی اور مشرقی دو حصوں میں بٹ چکا ہے بلکہ صرف یہ نہیں مکران دونوں طرف کئی حصوں میں بٹ چکا ہے۔ کئی حوالوں سے ایک وقت مکران کی سرحدیں دریائے سندھ کے جنوب سے لیکر بحیرہ عرب کے ساتھ مغرب میں گلف آف اومان میں سے ہوتے ہوئے سیستان کے کوہ ملک سیاہ تک پھیلا ہوا تھا اور پھر افغانستان کے گرم سیل کے صحرا کو سمیٹے ہوئے مشرق میں قلات کے سطح مرتفع تک چلا جاتا تھا۔یہاں میں یہ کہتے ہوئے نہیں ہچکچاتا ہوں کہ دراصل ایک وقت مکران

ہی بلوچستان تھا جو بعد میں یہاں کے علاوہ سندھ اور پنجاب میں دور دراز تک پھیل گیا اور حصے بخرے ہو کر موجودہ شکل میں ہے۔

سائرس اور ہخا منشی دور میں ایک خودمختار علاقے کا نام ماکا تھا۔ جہاں کی زبان اوستا رہی تھی۔ اور ماکا سے یہ (ماکا کا جمع ماکاران) ماکاران سے پھر مکران بن گیا۔ مکران کے نام کے حوالے سے بہت سے آرا سامنے آئے ہیں۔ اکثریت نے اس نام کو فوقیت دیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت ماکا ایک اہم تجارتی گزرگاہ تھا۔ بابلیوں نے بھی ہندوستان جاتے ہوئے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ یونانی تاریخ دان ہیرودوتس (Herodutus) کے مطابق سائرس کے بیٹے دارا کو ایشیائی ملکوں خصوصاً سندھ کے بارے میں معلومات کا شوق تھا۔ دریائے سندھ جہاں سے کروکوڈائل کے کھال حاصل ہوتے تھے، ان کی دلچسپی کا مرکز رہا۔ اس سلطنت کے بعد سکندر اعظم نے بھی اس راستے کو اختیار کیا۔ کہتے ہیں کاریز کی دریافت اسی دور میں ہوئی۔ جس کے بعد مکران میں زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت کو بہت فروغ ملا۔ خوشحالی بڑھی، تہذیب وتمدن کا دور دورہ رہا۔ یہاں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مکران کی پہلی تصدیق شدہ بود و باش اسی خطے میں تھی ۔مکران کے حوالے سے بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ بہر کیف اس کتاب میں مکران کے حوالے سے خالد بلوچ کی تحریر یقیناً بہت معلوماتی ہے۔

جہاں تک پنجگور کا تعلق ہے۔ یہ صدیوں سے مکران کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ جس طرح خالد بلوچ نے ذکر کیا ہے۔ اس کا نام بہت متنازعہ رہا ہے۔ پنجگور کا موجودہ نام بہت تبدیلیوں کے بعد یہاں تک پہنچا ہے۔ فارسی زبان کی رشتہ داری کی وجہ سے اس کی تشریح پانچ قبروں (گور) کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ دراصل یہ بات تاریخ اور اس کے ارتقائی عمل سے ناواقف ہونے کی بناء پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر بہت سے لکھاری اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا نام کنزبور سے بدل کر پنجگور ہو گیا ہوگا۔

آج کا پنجگو رخشانی اور مکرانی تہذیب کے سنگم پر واقع ہونے کے ناطے دونوں کا

امتزاج مانا جاتا ہے۔آب وہوا کے حوالے سے یہ رخشان سے قریب تر ہیں۔، جنوبی مکران کی طرح نہ سخت گرم ہے نہ ہی رخشان کے بالائی علاقوں کی طرح ٹھنڈا ہے۔اس کو معتدل کہہ سکتے ہیں۔اسی حوالے سے یہاں فصلیں گرم اور سرد دونوں علاقوں کی پیدا ہوتی ہیں۔ اور اسی آب وہوا کی وجہ سے خان قلات، انگریز اور بعد میں عرصہ دراز تک پنجگور کو سرکاری حکمرانوں کیلئے صدر مقام کا درجہ حاصل رہا ہے۔

پنجگور ایک شہر اور انتظامی ضلع بھی ہے۔دراصل یہ ایک تاریخی خطہ ارض اور مکران کا ایک قدیمی حصہ ہے۔ بہت سے تاریخی تغیر اور تبدیلی کے باوجود اس کی ثقافتی اور لسانی بنیادیں آج تک برقرار ہیں۔پنجگور کی زمین کو دریائے رخشاں سیراب کرتا ہے اور اس کا انحصار ہی اس دریاء پر ہے۔جس کے دونوں کناروں پر میلوں تک سرسبز وشاداب باغات ، گھنے نخلستان اور لہلہاتے کھیت ہیں۔جو ہر گزرنے والوں کے دل لبھاتے ہیں۔

جیسے خالد بلوچ تحریر کرتے ہیں کہ پنجگور زمانہ قدیم سے ایک تجارتی راہ گزر رہا ہے۔ اور اپنی آب وہوا اور زرعی خوشحالی کی وجہ سے اسے ایک تجارتی منڈی ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔تہذیب وتمدن کے حساب سے یہ ایک نمایاں حیثیت کا حامل رہا ہے۔تاریخ دان کہتے ہیں کہ پنجگور قدیم دور میں بہت زرخیز ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔سندھ کا نامور محقق اور تاریخ دان ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا ماننا ہے کہ پنجگور بلوچ تہذیب کا مرکز اور حب ہے۔

اپنے گرد وپیش کی نسبت سے پنجگور کی اپنی ایک منفرد شناخت ہے۔ بلوچوں کی قدیم تاریخی حیثیت کا امین ہے۔تاریخی اور انتظامی حیثیت سے یہ قدیم زمانے سے مکران سے جڑا رہا ہے۔تاریخ میں جہاں ایران کا نام آتا ہے وہاں توران کا نام بھی آتا ہے اور پھر سیستان اور بلوچستان کا، وہاں پنجگور کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کسی خطہ کے اندر رہنے والے صاحب فکر ونظر وعلم وہنر بڑی اہمیت کے حامل ہوتے

ہیں۔اوراس خطے کا ذکران کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔خالد بلوچ نے اپنی کتاب کے ایک باب میں پنجگور کے چند اشخاص کا ذکر کیا ہے۔خالد جان نے اپنی سوچ کے مطابق پنجگور کے چند نامور شخصیات کے ذکر سے اس کتاب کو مزین کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ چند نامور شعراء کے اشعار سے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔جو بڑی دلچسپی کا حامل ہے۔اس حوالے سے ایک بات خصوصیت کے ساتھ میرے لئے باعث مسرت ہے۔وہ یہ کہ انہوں نے محمد حسین عنقا کی پنجگور سے نسبت اوراس کی شخصیت کواجاگر کیا ہے۔اور پنجگور والوں کو اس سے روشناس کرایا ہے۔جو اکثر نظر انداز ہوتے رہے ہے۔عنقا نہ صرف ایک ادیب صحافی اور پائے کے شاعر تھے، بلکہ بلوچستان کی قومی سیاست کے اولین مشاہیر میں سے ایک تھے۔جو بہت ہر دل عزیز شخص تھے۔اور یوں عزت پنجگوری کی شہرہ آفاق عشقی داستان اور شاعری کا ذکر بھی کتاب میں ایک حسین اضافہ ہے۔اور سچ پوچھیں تو عزت اور مہرک کی داستان کے بغیر پنجگور کی تاریخ نامکمل ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اس کتاب میں ایک اور بات کا ذکر بہت اہم ہے۔وہ ہے میر علی محمد باران زئی اوراس کے فرزند میر دوست محمد (شاہ بلوچستان) کی حاکمیت اوراس کی شکست اوراس کے ساتھ ایران میں بلوچوں کی حاکمیت کے اختتام کی داستان۔ یادرہے کہ جب انیسویں صدی کے آخری ایام میں انگریز سامراج نے بلوچ گل زمین کا بٹوارہ کیا تو بلوچ بغاوت پر اتر آیا۔ بلوچستان کے شورش کو زیر کرنے کے لئے انگریز نے اپنے سامراجی مقاصد کے پیش نظر ایران کے قاچار حکومت کو اکسایا اور انہوں نے انگریز کی مدد سے بلوچوں پر پے در پے کئی حملے کئے۔اور یہ سلسلہ قاچار حکمرانوں کے دور تک جاری رہا۔جب ۱۹۲۵ میں پہلوی برسر اقتدار آگئے تو انہوں نے ایران کی بلوچ حکومت پر یلغار کیا۔ایرانی بلوچستان کے حاکم میر دوست محمد کی پہلوی شاہ کے ہاتھوں شکست ہوئی اور اس کو تیر باراں (فائرنگ اسکواڈ) کے ذریعے موت کے گاٹ اتار دیا گیا۔تو ان کے بزرگ والد کو

عزیز واقارب کے ساتھ جلاوطن کر کے پنجگور کے شاپاتان میں پناہ گزین ہونے پر مجبور کیا تو اس کے ساتھ ہی ایران میں بلوچوں کی قومی عظمت کی موت بھی واقع ہوتی ہے۔ میر علی محمد خان یہیں فوت ہوگئے۔ ان کی قبر خالد جاں نے بڑی تگ ودو کے بعد ڈھونڈ نکالی ہے۔ مگر افسوس کہ اب اس کے اوپر کی تحریر مسخ ہوچکی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وقت نشان مٹا دیتی ہے مگر نام تاریخ کے اوراق سے مٹ نہیں سکتا۔

انہوں نے پنجگور کے موجودہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی پہلوؤں پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ یہ وہ حالات اور واقعات ہیں جس کو اس نے قریب سے دیکھا ہے اس کا مشاہدہ کیا ہے اور میں یہ کہنے میں غلط نہیں ہونگا کہ وہ خود اس کا حصہ رہے ہیں۔ پنجگور کے دور حاظر میں رونما ہونے والے سیاسی اتار چڑھاؤ کو ان سے بہتر کون بیان کر سکتا ہے۔

خالد بلوچ نے پنجگور کے بہت سے اہم اور قدیم مقامات کا ذکر کیا ہے۔ ان مقامات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے میر کمبر کی بہادری کی داستان پر تبصرہ کیا ہے۔ جو کتاب میں ایک مفید اضافہ ہے۔ یہاں میں یہ ذکر کرتا چلوں کہ کمبر دمب جسے وہ میر کمبر کا جائے رہائش بتاتے ہیں، اس علاقے سے میری ایک نسبت بھی بنتی ہے۔ میرے خاندان کے خشکاوا زمینیں اسی مقام پر ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر خالد بلوچ کچھ ہمت کر کے اس سے ہماری کوئی نسبت کو ثابت کرتے۔

دنیا کے ہر علاقے میں بہت سے مقامات ایسے ہوتے ہیں جو کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح پنجگور میں بھی چند ایسے مقامات ہیں۔ خالد بلوچ نے اس کتاب میں چند ایسے مقامات کا ذکر کیا ہے۔ جو مقامی طور پر جانی پہچانی جاتی ہیں اور یقیناً پنجگور کے حوالے سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ اور شاید کسی محقق کیلئے کارآمد ثابت ہوں۔ خالد جان نے ذائقہ بدلنے کیلئے آخر میں ان نباتات میں سے چند مشہور درخت اور جڑی بوٹیوں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ مگر اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

گوریچ: کوئی شخص اگر پنجگور کا ذکر کرے اور گوریچ کو نظرانداز کرے تو یہ ایک بڑی بے

مروّتی ہوگی۔ گوریچ شمال سے چلنے والے ایک تند و تیز ہوا کا نام ہے۔ سردی ہو یا گرمی یہ جب بھی چلے، اپنا رنگ ضرور دکھا دیتی ہے۔ اس لئے زبان زد خلق ہے۔ موسم کے تغیر و تبدیلی کا انحصار اسی کے دم سے ہے۔ فصلوں کی بوائی و کٹائی اور کھجور کے پکنے کا دار و مدار اس کے مزاج سے وابستہ ہے۔ صرف پنجگور نہیں پورے بلوچستان خصوصاً بلوچستان کے مغربی حصوں میں اپنی شہرت رکھتی ہے۔ پنجگور میں موسم سرما کا دار و مدار اسی کے دم خم سے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پنجگور پر یہ کتاب پڑھنے والوں کیلئے بہت مفید اور کارآمد ہوگا۔ اس کام کیلئے خالد بلوچ مبارک باد کا مستحق ہے۔

ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی

کوئٹہ

۹ اکتوبر ۲۰۱۲

ہدیہ تشکر

تحقیق وتحریر کا عمل خاصہ مشکل اور وقت طلب ہے ۔اسے یقیناً علم وعمل اور وسیع مطالعے ،اپنے اردگرد کے حالات ومشاہدات ، تجربات کے ساتھ مستند حوالوں اور تاریخی کتابوں ہی سے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔اور ساتھ ہی یہ عمل ہمیشہ سے تحقیق وتجسس اور وسیع علم کا متقاضی بھی رہا ہے۔

چونکہ ابتداء ہی سے بلوچ ادیب ودانشور ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی سے علمی اور ادبی ناطہ رشتہ ہے۔ میں ان کی پرمغز تحریروں، مکالموں اور بلوچی افسانوں کا بغور مطالعہ کرتا آرہا ہوں۔ بہرحال وہ اس خطے کی تاریخ تہذیب وتمدن وثقافت علم وادب پر وسیع علم ومشاہدہ رکھتے ہیں۔وہ صحیح معنوں میں اس زمین کے حقیقی دوست وروح پرور عاشق ہیں جو ان کی سوچ وفکر اور اس کتاب کے موضوع سے گہری دلچسپی وسیع وجامع پیش لفظ سے بھی عیاں ہے کہ وہ بلوچ خطے سے نفسیاتی وروحانی طور پر کتنے نزدیک ہیں۔اگر اس مناسبت سے ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی شامل نہ ہوتی تو شاید اس وسیع موضوع کو سمیٹنے اور اس قدر احاطہ کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی۔

اِسی حوالے سے واجہ پروفیسر ریاض احمد بلوچ کا کافی ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے ماضی کے روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس کتاب کے تحریر میں بھی میری بہتر رہنمائی فرمائی جوان کی ماضی سے حال تک علم دوستی وقوم دوستی کا سب سے بڑا مظہر ہے۔اور بالاچ غنی کا اس مناسبت سے شکریہ ادانہ کرنا مناسب نہیں کہ انہوں نے کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کے مرحلے تک سخت ذہنی اذیت وکرب برداشت کرکے بارِگراں کو سحل بنانے میں بھرپور کردار ادا کی۔

کامریڈ مجیب بلوچ نے بھی ہمیشہ کی طرح دوستی کا بھرم نبھاتے ہوئے تمام مرحلوں کے ساتھی وہمنوا رہے۔عزت اکیڈمی پنجگور کے فعال رکن اور ہردل عزیز شاعر حمزہ بلوچ نے کتاب کے موضوعات کے مناسبت سے مواد فراہم کرکے اسے جامع اور وسعت دینے میں اپنی خدمات سے نوازا۔ان کے علاوہ ان تمام کا ممنوں ومشکور ہوں کہ جن کے حوصلہ وہمت افزائیوں کے بدولت یہاں تک کامیابی نصیب ہوئی۔

خالد بلوچ

بابِ اوّل

مکران

تاریخی پس منظر

مکران وجہ تسمیہ:

مکران قبل مسیح ہی کے ادوار سے اپنے منفرد تہذیب و تمدن، رسم رواج اور جغرافیائی، سیاسی و سماجی اہمیت کی وجہ سے بہت اہم تاریخی خطّہ رہا ہے۔ اس خطّے کو یونانیوں، پرتگیزیوں اور انگریزوں کے علاوہ مسلم حکمرانوں نے بھی اپنی بالادستی، وسائل و دولت کی لوٹ مار، جنگی مہموں، لشکرکشیوں کے ساتھ تجارتی مقاصد کیلئے اہم گذرگاہ کے طور پر بھی استعمال کی۔ لیکن درحقیقت ان میں سے کوئی بھی مستقل طور پر اس خطے کو مکمل طور پر اپنے قبضے و تصرف میں لانے میں زیادہ دیر تک کامیاب نہ رہی۔ اسی تناظر میں اس خطے کا قدیم یونانی، سنسکرت و دیگر مستند و جامع قدیم تاریخی اور نایاب کتابوں کے اندر وضاحت و تفصیلی ذکر موجود ہے۔ جس کی وجہ سے یہ خطہ محققین اور مورخوں کیلئے کبھی بھی دلچسپی سے خالی نہ رہی۔

مکران کے نام حوالے سے مختلف تاریخی آراء موجود ہیں جو کہ اس خطے کے نام کے حوالے سے مذید تحقیق و تجسس کے طلب گار ہیں۔ کچھ مورخین جس میں مقامی اور کچھ غیر مقامی بھی شامل ہیں اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں کہ بلوچی میں اسطرح مک، مجھور، مکجور اور ران باقاعدہ طور پر جگہ کیلئے مستعمل ہے۔ یہ دو لفظوں کی ترکیب سے مکران کہلایا اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مہ معنی شہر، کران بمعنی شور استعمال ہوتا ہے اسی لئے نام مکران پڑ گیا۔

لیکن اس آراء یا خیال سے اس لئے زیادہ تر اتفاق نہیں ہوسکتا ہے کہ قبل مسیح سے یعنی جس وقت سے یہاں بلوچ وارد نہیں ہوئے تھے تو تاریخ اس علاقے کو مکران کے نام سے یاد کرتی ہے اور قدیم تاریخی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اور یونانی اس علاقے کا

ذکراچھتیا فیگوئی(Ichthyophaghi) کے نام سے کرتے ہیں یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی ماہی خور،، چونکہ اس خطے کے لوگوں کا زیادہ تر گذارہ مچھلیوں پر تھا اس لئے یونانیوں نے انہیں اپنی زبان میں ماہی خور قرار دیا تھا اور اسی بناء پر یہ علاقہ ماہی خوروں کے علاقے کے طور پر مشہور ہوا۔

یہ علاقہ موجودہ راس سیلان سے گدروشیاء کی آخری مغربی حد تک تھا۔اس کے دو حصے تھے ایک بلوچستانی مکران اور دوسرا ایرانی مکران۔

قاضی عبدالرحیم صابر کے مطابق جو کہ اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں " مکران کا نام اس وجہ سے مکران رکھا گیا ہے کہ اس میں مکران بن فارک بن سام بن نوح کرمان کے بھائی تھے جس نے فروکش ہو کر اس کو اپنا وطن بنایا تھا۔جبکہ بابل میں دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ علحیدگی ہوئی تھی۔

سام بن نوحؑ کے پوتے مسمی بہ مکران نے اس ملک سے فروکش ہو کر اسے اپنا وطن عزیز بنایا۔ پھر ان کا یہ وطن مالوف انکے نام پر ''مکران'' مشہور ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ان کے ایک محترم بھائی ''کرمان'' نے کرمان میں فروکش ہو کر اسے اپنا وطن بسایہ تھا۔ ان کی وطن ان ہی کے نام پر کرمان مشہور ہوا۔ جو حضرات یہ رائے رکھتے ہیکہ بلوچی زبان میں ''مک'' کھجور کو کہتے ہیں۔ گویا مکران نخلستان کا مترادف ہے اور اسی طرح بعض مورخین کا خیال ہے کہ ایرانیوں اور یونانیوں کا بخشا ہوا ''ماہی خوران'' جو امتداد زمانہ سے مکران ہو گیا جو کہ غلط اور بے بنیاد مفروضے پر قائم ہیں۔ حالانکہ مکران ایک عظیم شخصیت کا نام ہے جس کا ماہی خوران ''مک ران'' سے کوئی تعلق نہیں۔

معجم البلدان لکھتے ہیں کہ بعض مورخین نے کہا ہے کہ مکران کا نام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں مکران بن فارک بن سام بن نوح علیہ السلام کرمان کے بھائی نے فروکش ہو کر اس کو اپنا وطن بنایا تھا۔ ان تاریخی حوالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ سام بن نوح کے پوتے مسمیٰ بہ مکران نے اس ملک میں فروکش ہو کر اسے اپنا وطن عزیز بنایا پھر ان کا وطن

مالوف ان کے نام پر مکران مشہور ہوگیا۔ جیسا کہ ان کے ایک محترم بھائی کرمان نے ''کرمان'' میں فروکش ہوکرا سے اپناوطن بنایااوران کاوطن ان کے نام پر کرمان مشہور ہوا۔

ڈاکٹر حمید بلوچ کی کتاب ''مکران عہد قدیم سے عہد جدید تک'' سے ماخوذ ہے کہ گدروشیا کے متعلق جغرافیہ دان (Starbo) رقم طراز ہیں کہ گدروشیاء (موجودہ مکران) انڈیا کی بہ نسبت زیادہ گرم نہیں اور یہاں پر کوئی خاص قسم کے پھل نہیں پائے جاتے ہیں اور پانی کی کمی ہے۔ یہ علاقہ ماہی خوروں کی ساحلی علاقے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن اس علاقے کی خاص بات یہاں پر بننے والے لوبان ہے جو کہ اتنی زیادہ مقدار میں تیار ہوتا ہے کہ سکندر اعظم کے ساتھ آنے والے یونانی فوج کے سپاہیوں نے اس کو اپنے خیموں کو معطر رکھنے کی خاطر ان کا بے دریغ استعمال کیا۔

محل وقوع:۔(Area)

اس علاقے کے محل وقوع سے متعلق یونانی جغرافیہ دان Ptolemey لکھتے ہیں کہ گدروشیاء کے مغرب میں Karmania (کرمان) شمال میں Deragine (ایران) اور Arakhasia (افغانستان) جبکہ مشرق میں ہندوستان کی سرحدیں ملتی ہیں۔ Ptolemey کے بیان کردہ جغرافیائی محل وقوع کے مطابق گدروشیاء صرف مکران ہی کونہیں بلکہ پورے بلوچستان گدروشیاء کہلاتا ہے۔ گدروشیاء کو صرف مکران سے جوڑنا درست نہیں اگرچہ Ptolemey مکران کے عظیم ساحلی پٹی کے بیشتر حصّے کو کرمان کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ اس کے برعکس Arrian گدروشیا کو صرف اندرون مکران کا حصّہ بناتے ہیں۔ جغرافیہ خلافت مشرق صفحہ 492 میں درج ہے کہ مکران کی سب سے بڑی پیداوار شکر تھی اور خاص قسم کی سفید شکر جسے عرب ''الفانید'' کہتے تھے یہاں بنائی جاتی تھی اور قرب جوار کے ملکوں میں بھیجی جاتی تھی۔ مکران کی جس فانید کا تذکرہ تواریخ میں آیا ہے وہ کجھور کا شیرہ (جوس) جسے مقامی بلوچی میں شیرگ کہتے ہیں۔ یعنی کھجور کا رس معلوم ہوتا ہے جو کہ ایک خاص طریقے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور یہ خاص کر مکران ہی میں بنتا ہے۔

سرباز (ایرانی بلوچستان) اور پنجگور کا شیر گی خرما بہت مشہور ہیں۔ فانید شکر کی ایک قسم ہے اور مکران ہی سے تمام ممالک میں بھیجا جاتا ہے۔

مارکو پولو نے 1292ء میں اس علاقے کا سفر کیا تھا۔ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ مکران ایک خودمختار بادشاہ کی فرمانروائی میں ہے۔ اور اٹلی کے ایک مشہور و معروف آثار قدیمہ کے ماہر پروفیسر ویلیر یا پاسٹنی نے اپنی تحقیق کیلئے ایرانی بلوچستان اور مکران کا انتخاب کیا تھا۔ اپنی تحقیق کے نتیجے میں قدیم و نایاب آثار و نئی معلومات سے دنیا کو روشناس کرائی تھی۔

سکندر اعظم اور مکران:۔(The Alexander & Mekran)

سکندر اعظم نے اس راستے کو استعمال کیا۔ جہاں اس نے اپنے بہت سے سپاہی گنوا دیئے۔ مگر ایک روایت ہے کہ بلوچوں سے کہیں پر بھی مدبھیڑ نہ ہوا۔ اور رسد و رسائل کی کمی اس کو کمزور کرنے میں کافی تھا۔ ہیرودوتس (Herodous) نے مکران کے لوگوں کا ذکر کیا ہے جو ہخامنشی خط (Daiva) کے لکھائی میں دیکھے جاتے رہے ہیں۔ (Kanath) کہتے ہیں کہ کاریز (Makians) کا کارنامہ ہے۔ اس سلطنت کی کامیابی کی وجہ یہی ایجاد تھا جس سے ملک سرسبز و شاداب تھا۔

اغلب ہے کہ قدیم ماکا دوسری طرف جہاں سندھ و بلوچستان کے دوسرے علاقے پڑتے ہیں جو پہلی سلطنت سے آزادی حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے ان کا ذکر (Aqian of Nicomadi) کی کتاب میں نہیں ہے۔ جو اس نے سکندر اعظم کی فتوحات کے بارے میں لکھی۔ اس کتاب میں قدیم ماکا کے اومان کے طرف کا ذکر ہے۔ جیسے کہ چچ کے زمانے میں مکران کے اکثر علاقے بدھ ازم کے زیر اثر تھے۔

325 قبل مسیح میں سکندر اعظم اس سرزمین کو روندتے ہوئے گزرا تھا۔ بعض مقامات پر مقامی لوگوں سے اس کی شدید لڑائی بھی ہوئی تھی جس میں اسے کافی پریشانیوں کا سامنا ہوا۔ اس بناء پر یونانی لشکر نے آبادیوں کے بجائے ویران علاقوں سے ہوتے ہوئے پیش قدمی کی۔

تفصیل کے مطابق سکندر اعظم (325-356) تو مقدونیا کا بادشاہ تھا۔اس نے ایک حکمت عملی کے تحت اپنی بکھری ہوئی قوم کو آپس میں اکھٹا کیا بلکہ اس میں ایک ایسی روح پھونکی کہ وہ ایرانی حملہ آوروں کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرنے کو تیار ہوئیں۔اس بات کا ثبوت وہ خط ہے جوانہوں نے ایران کے آخری ہخامنشی بادشاہ دارا سوئم کو بھیجا کہ ''تمہارے آباؤاجداد آئے دن مقدونیا اور یونان کے دیگر ریاستوں پر حملہ کرتے چلے آئے ہیں اور بغیر کسی اشتعال کے ہمیں تباہ وبرباد کرتے رہے،حملوں نے ہمیں اشتعال میں ڈالا ہے۔اور میں یونانیوں کا بادشاہ ہوں اور میں ایشیاء میں ان زیادتیوں کا بدلہ لینے کیلئے آرہاہوں۔اوراس ضمن میں تم پہلے ہونگے جو میرے حملے کا نشانہ ہونگے''

اسی طرح ایک مشکل لڑائی کے بعد دریا آلو سے لیکر کابل تک کا علاقہ سکندر کے زیرنگین آگیا۔اس کے بعد سکندر نے راجہ پورس اور مکران کے اور ٹیو(Oritae) کو سبق سکھانے کیلئے پیش قدمی کی۔گدروشیاء سے پیش قدمی یونانی فوج کو نڈھال کررہی تھیں اور پانی کی کمی کی وجہ سے سفر انتہائی سست روی کا شکار ہورہا تھا۔وہ عموماً رات کو سفر کرتے تھے کیونکہ دن کے وقت دھوپ کی تمازت جسموں کو جھلسادیتی تھی۔جب پانی کا ذخیرہ دیکھتا تو وہ واپس پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیتا تھا۔دوران سفر بھوک سے نڈھال ہوکر فوج نے مال برداری کے جانوروں کو کاٹ کر چٹ گئے اور بہانہ یہ بناتے تھے کہ یہ جانور پیاس سے نڈھال ہوکر مر گئے ہیں۔چونکہ سکندر ایک معاملہ فہم ودانہ شخص تھا۔اچھی طرح جانتا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے لیکن انہوں نے چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظر انداز کیا۔

سکندر کی فوج کا خاصہ بڑا حصّہ دوران سفر پیاس سے سسک سسک کر جان کی بازی ہار گیا۔بڑی مصیبت ومشکلات سے دوچار رہے۔جب رات کو سفر کے دوران کچھ سپاہی نیند کے ہاتھوں مجبور ہوکر سوگئے اور جب بیدار ہوئے تو انہوں نے اپنے آپ کو بیابان میں اکیلا پایا کیونکہ انکے تمام ساتھی جاچکے تھے۔بہت کم لوگ واپس سکندر کے کاروان میں آکر شامل ہوسکے اور بہت سے لوگ صحرا میں بھٹک کر اپنی جانوں سے ہاتھ دو بیٹھے۔

اسی طرح مکران کے علاقوں کے متعلق صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے بے خبر سکندری فوج رات کو اندھیرے میں اچانک طغیانی گھیر بھی لیتی ہے اور اپنے ساتھ بہت سارے سپاہیوں کو بہا کر لے جاتی ہے۔ خود سکندر بڑی مشکل سے بارہا جان بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ سکندر عموماً اپنا پڑاؤ پانی کے چشمے سے دور لگا لیتے تھے کیونکہ پانی کو قریب پا کر سپاہی بے قابو ہو جاتے تھے۔ اور وہ اس قدر پانی پیتے تھے کہ ان کا پیٹ پانی کی زیادتی سے پھول جاتا تھا اور وہ اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ اس کے علاوہ مال برداری کے جانور بھی پیاس سے نڈھال ہوئے تھے۔ لہٰذا پانی کو قریب پا کر جانور بھی بے قابو ہو جاتے تھے اور کئی سپاہی اس طرح اپنے جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ دوسری جانب پانی کی کمی بھی ایک اہم مشکل تھی جو پیش قدمی کے دوران فوج کو مشکلات سے دوچار کرتی رہی۔

پیش قدمی کے دوران سکندر اعظم اور اسکی فوج تپتی دھوپ میں تشنگی اور پیاس سے بڑی بے حال ہو رہا تھا تو کافی تلاش اور سرگردانی کے بعد انکے فوج کے چند سپاہیوں کو پہاڑی ندی سے تھوڑا سا پانی دستیاب ہوا تو انہوں نے ایک برتن میں بھر کر اپنے جرنیل کو پیش کر دی۔ لیکن سکندر اعظم نے اپنی پیاس بجھانے کے بجائے پانی زمین پر گرا دیا۔ اپنے جرنیل کے اس جرأت مندانہ اقدام اور ہمت و جوان مردی نے فوج کے حوصلے بلند کئے۔ وہ تمام نے ایک نئے جذبہ ولولہ کے ساتھ تمام مشکلات کے باوجود بھی پیش قدمی کی۔ پانی کی کمی کے علاوہ ریت کے ٹیلے جس میں مال برداری کے جانور دھنس جاتے تھے۔ جس سے سپاہیوں کی کافی ہلاکتیں ہوتی تھیں۔ زہریلے سانپ بھی سپاہیوں کیلئے موت کے پیغام لاتے تھے۔ یہ زہریلے سانپ ان علاقوں میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ان سانپوں کی ڈسنے سے کئی سپاہی موت کے آغوش میں چلے جاتے اور کئی بنیادی اور دیگر بیماریوں کے شکار ہوئیں اور اس طرح کئی اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ ان کے علاوہ نامعلوم راستے اور ویرانے بھی کسی آفت سے کم نہ تھے۔ اگر کوئی فوجی راستہ بھٹک جاتا اور راستے سے دور نکل

جاتا تو وہ موت کی وادی میں پہنچ جاتا۔اور زہریلے پودے کھانے سے مال بردار جانور سسک سسک کر مرتے رہے۔

سکندر اعظم کی فوج کو کسی بھی مہم اور لڑائی ولشکر کشی میں اس قدر کافی نقصان نہیں ہوا تھا جس قدر اُسے اس سفر کے دوران مکران کی ویران سفاک آب وہوا کے ہاتھوں اٹھانا پڑا۔

وہ ایک بڑے ذہین وجنگجو تھے۔مثلاً اورٹی قبیلے کے ساتھ جنگ کے دوران اُس کو پتہ چلا کہ انہوں نے اپنے تیروں کو ایک مخصوص قسم کے زہر لگوایا ہے تو اس خبر سے فوج میں سراسیمگی پھیل گئی۔سکندر نے فوراً اس کا توڑ نکالنے کا اعلان کیا کہ اسے خواب میں بشارت ہوئی ہے کہ فلاں جڑی بوٹی کو اگر استعمال کیا جائے تو زہر کی تاثیر جاتی رہے گی۔اس بات سے سپاہیوں کے حوصلے بلند ہوئے دوسری طرف جب اورٹی قبیلے کو اس بات کا پتہ چلا کہ سکندر نے ان کے زہر کا توڑ جان لیا تو لڑائی سے پہلے تائب ہوئے۔

یونانی جرنل سکندر اعظم نے اپنی مہم کے دوران کئی ماہ تک اس علاقے میں قیام کی اور کئی ماہ بعد گدروشیاء کے دارالحکومت پورا(بمپور) پہنچ گئے۔یہاں پر اس کے باقی ماندہ لشکر کے باقی ماندہ سپاہی بھی اس سے آملے۔یوں سکندر کا سفر نامہِ مکران مکمل ہوا جس کا ذکر یونانی سیاحوں اور مورخوں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

مکران کے مہم پر واپسی کے بعد وہ کافی بیمار رہے۔وہ پیچیدہ بیماری کے اسباب مکران کے سخت ترین موسم ومصائب تھے۔جو اس عظیم فاتح جس نے سارے عالم کو اپنے قابو میں رکھا آخر مکران کی ہتھے چڑ گیا۔شاید یہ مبالغہ آرائی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جتنا نقصان سکندر اعظم اور اس کے فوج کو دوران سفر مکران میں پیش آئے وہ دیگر مہموں اور جنگوں میں ذرّہ برابر بھی نہیں ہوسکیں۔وہ جون 323 قبل مسیح میں بابل کی سلطنت میں بیمار ہوکر وفات کر گئے۔انہوں نے اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔ان کے مرنے کے بعد اس کی عظیم سلطنت مختلف جرنیلوں کے ہاتھوں میں تقسیم رہی۔یہاں تک ان کا آبائی علاقہ مقدونیہ بھی غیروں کے ہاتھ میں آیا۔بطیلوس نے مصر سنبھال لیا۔ایٹی پیٹر مقدونیہ کا مالک بنا۔سیلوکس کے ہاتھوں سکندر کے مفتوحہ مشرقی علاقے آئے۔

305 قبل مسیح میں جب سیلوکس نکوٹر نے بابل کی مرکزی حکومت پر قبضہ کر لیا تو اس نے مکران کو اپنی بیٹی کو جہیز میں دے دیا۔ جس کی شادی چندر گپت سے ہوئی تھی۔ اس کی اختصار یوں ہے کہ اس وقت ہندوستان کا پورا علاقہ چندر گپت موریا کے زیر اثر ایک عظیم الشان سلطنت کے طور پر جانا جاتا تھا۔ سیلوکس نکوٹر ایک جہان دیدہ جنگجو اور بہادر انسان تھے۔ انہوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور جنگ کے بجائے اپنی بیٹی کی شادی چندر گپت سے کرادی اور کچھ علاقے جہیز کے طور پر اپنی بیٹی کو دیئے۔ ان علاقوں میں قندھار اور کابل کے صوبوں کے علاوہ گدروشیاء (مکران) اور آریانا (ہرات) کے کچھ علاقے بھی شامل تھے اس طرح یوں مکران کا علاقہ چندگپت موریا کے زیر اثر آ گئے۔

یونانی تاریخ دان اور سیاح اس خطے کے متعلق یہ رائے رکھتے ہیکہ اس کے لوگ جب سخت گرمی ہو تو سرمائی ٹیلوں پر چلے جاتے ہیں اور سردیوں کے موسم میں واپس ہو جاتے ہیں۔ خوشگوار رہن سہن کے مالک ہیں۔

مزید تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایران کی عظیم سلطنت کے بانی سائرس اعظم (530-590ق م) تھا۔ جسے کوروش کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کوروش کے مکران پر حملے کے متعلق سب سے اہم اور مستند ذریعہ ارائن کی انابس ہے۔ جس میں تحریر ہے کہ انہوں نے مکران پر (540-546ق م) کے دوران حملہ کر کے اسے اپنے سلطنت کا حصہ بنایا تھا۔

کوروش کے بعد ہخامنشی خاندان کا دوسرا بادشاہ دارا اوّل (550ق م) جو کہ گستاسپ کا بیٹا تھا اسے عموماً دار گستاسپ لکھا جاتا ہے۔ دارا اوّل کے بعد زرزئیس (Xerxes) آئے اس کے بعد دارادوئم جس کو اوکس (Ochus) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا دور (404-423) تک ہے۔

اسلام کا ظہور:

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس علاقے سے پہلی مرتبہ اسلام کی شمع روشن ہو کر اس خطے کے تمام حصوں تک جا پہنچی۔ اور اسی طرح سے عرب اس علاقے کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت سے خوب واقف تھے۔

عرب مورخین کے مطابق عرب جرنیل صحار بن عبدی نے اسے غیر دل کش علاقہ قرار دے کر خلیفہ کو پیغام بھیجا کہ اس سرزمین کی سطح پھر تیلی ہے۔ یہاں پانی کم، یہاں متعدد گورنر آئے اور چلے گئے مگر کسی نے مستقل طور اسے اپنے قبضے میں نہیں رکھا۔ اس علاقے کا مختلف محققین اور مورخین اور سیاحوں نے اپنے سفرناموں و تاریخی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

عربوں کے دور مکران کی فتوحات:۔(۲۳/644 عیسوی)

مکران ایک وسیع وعریض علاقہ تھا۔ اس کا کچھ حصّہ موجودہ ایران میں شامل تھا۔ اُن دنوں ہندوسندھ کا پائیہ تخت اروڑ تھا۔ جہاں ہندو راجہ رائے سائیرس بن ساہی کی حکمرانی تھی۔ اس کی حکومت کی حدود مشرق میں کشمیر تک و مغرب میں مکران وجنوب میں دیبل اور ساحل سمندر اور شمال میں کیکانان (قلات) تک تھیں۔ اس راجہ نے اپنی سلطنت میں چار حکمران مقرر کیئے تھے جو حکمران سیوستان میں مقیم تھا۔ اسکی سلطنت بدھیہ (کچھی) جنگان (روجھان بلوچستان) اور کوہ پایہ سے لیکر مکران تک تھی۔ یہ راجہ ایرانی بادشاہ نمروز سے مقابلے میں مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا ساہی حکمران بنا اور اسکے بعد چچ راجہ بنا۔ چچ نے ۲۳ ھجری میں مکران اور کرمان کی حد مقرر کی۔ وہ اس نہر کے کنارے خیمہ زن ہوا جو مکران اور کرمان کے درمیان ہے۔ اس نے وہاں کھجوروں کا جھنڈا لگا کر سرحد کی نشاندہی کی۔

مکران پر پہلا حملہ:۔

مکران کی پہلی فتح ۲۳ ھجری میں ہوئی ان دنوں اسلامی افواج بصرہ کے امیر حضرت ابوموسیٰ اشعری اور بحرین کے امیر حضرت عثمان بن العاصؓ کی قیادت میں ایران میں جہاد کر رہی تھیں۔ حضرت عثمان بن العاصؓ نے اپنے بھائی حضرت حکم بن العاص کی قیادت میں ایک فوج مکران روانہ کیا۔ اس لشکر کو بڑی کامیابی ہوئی۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں مکران پر دوسرا حملہ:۔

حضرت حکم بن عمرو تعلبی نے مکران جانے کا قصد کیا اور جب وہاں پہنچے تو حضرت شباب ابن المخارف بن شباب بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ حضرت سہیل بن عبدی اور حضرت عبداللہ بن عبداللہ عتبان دونوں حضرات بھی بذات خود افواج لیکر انکی امداد کیلئے

پہنچے۔ وہ سب دریاء کے قریب جمع ہوئے اہل مکران بھی دریاء کے کنارے جمع ہو گئے تھے اور وہاں صف آراء تھے۔ ان کے بادشاہ راسل نے شاہ سندھ سے دریاء کو عبور کر کے امداد طلب کی تھی اور اس نے مقابلے کیلئے فوج بھیجی۔ چنانچہ ہراوّل دستوں کے پہنچنے کے کئی دن بعد جب فوج آ گئی تو مسلمانوں کی اس سے جنگ ہوئی یہ معرکہ مکران کے ایک مقام پر ہوا جو دریاء سے کئی دن کی مسافت پر تھا۔ آخر کار شاہ مکران راسل کو شکست ہوئی اور مسلمانوں نے اس کے لشکر کو لوٹ لیا۔ اور ان کی کثیر تعداد قتل ہوئی۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور کئی دنوں تک انہیں قتل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دریاء تک پہنچ گئے پھر وہاں سے مکران میں مقیم ہوئے۔ مکران پر حملے کیلئے عربوں نے ایک طاقتور فوج تیار کی جس کی قیادت کئی صحابہ کرام کر رہے تھے۔ مثلاً عاصم بن عمر الحکم بن عمرو تغلبی، عبداللہ بن عبداللہ وعتبان اور سہل بن عدی نے کی۔ واضح رہے کہ اس سال یعنی ۲۳ ھجری میں مکران پر دو حملے ہوئے پہلا رضا کارانہ اور دوسرا حملہ اسلامی حکومت کی اجازت سے ہوا تھا۔

حضرت صحار بن عباس العبدی نے مکران کا حال حضرت عمرؓ کو یوں بتایا کہ اس کے نرم میدانوں کی زمین بھی پہاڑ کی طرح سخت ہے۔ وہاں پانی کم اور پھل خراب ہیں۔ دشمن بہادر ہیں، بھلائی کم اور برائی زیادہ ہے۔ وہاں کثیر تعداد کم اور قلیل تعداد ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے آگے علاقے کی حالت اس سے بھی خراب ہے۔

یہ سن کر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ تم شاعری کر رہے ہو یا خبر دے رہے ہو تو وہ بولا کہ میں حالات عرض کر رہا ہوں شاعری نہیں کر رہا۔

حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں مکران:۔

حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد محرم ۲۴ھ میں حضرت عثمان بن عفانؓ کو امیر المومنین مقرر کیا گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد اس علاقے کے حالات ابتر ہو گئے تو حضرت عثمانؓ ملک مکران کے متعلق از سر نو معلومات حاصل کرنے کیلئے حضرت حکیم بن جبلہ العبدیؓ کو وہاں بھجوایا واپسی پر آپؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کی خدمت میں عرض کیا۔

اے امیر المومنین میں نے پوری معلومات بہم پہنچائی ہیں۔اس کے بعد وہی کلمات دہرائے جو اس سے قبل عہد فاروقیؓ میں یہاں کے متعلق مشہور تھے۔"یعنی پانی ناقص پھل ادنیٰ دشمن بہادر اگر زیادہ فوج ہو تو بھوکوں مر جائے اگر کم ہو تو ختم کر دیئے جائیں۔
مصلحت کے پیش نظر اس وقت کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔مگر ۲۹ھ کو مکران کے بجائے بلوچستان کے دوسرے علاقوں سندھ، سیستان اور خراسان کی سرکشی اور بغاوت کے خلاف فوج روانہ کر دی گئی۔حضرت عبداللہ بن معمر التمیمیؓ نے مکران سے دریائے سندھ تک کی تمام سرزمین کو فتح کر لیا اور فاتح مکران کہلائے۔

مکران کی تیسری فتح ۲۹ھ:۔

حضرت عثمان غنیؓ نے ۲۹ھ میں عبداللہ بن عامر بن کریزؓ کو عراق کا گورنر مقرر کر کے ہدایت کی وہ قفص (بلوچستان) مکران اور سندھ کے حالات معلوم کرنے کیلئے بھیج دیں۔
تاریخ خلیفہ کے مطابق خلیفہ نے خود حضرت حکیم بن جبلہ العبدی کو اس مقصد کیلئے منتخب کیا۔
آپ نے جب واپسی حالات دریافت کئے تو انہوں نے وہی کلمات دہرائے جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس علاقے کیلئے مشہور تھے۔مکران کے امیر حضرت عبیداللہ بن معمر التمیمیؓ نے دریائے مکران تک کے علاقے کو فتح کیا۔

مکران کی پانچویں فتح ۳۰ھ:۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد مکران کے حالات ابتر ہونا شروع ہوئے۔تو اہل مکران نے بغاوت کی اس لئے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے آخری دور خلافت اواخر ۳۰ھ حضرت حارث بن مرہ العبدیؓ نے آپؓ کی اجازت سے لشکر جمع کر کے مکران میں جہاد کیا۔اس جہاد میں گو کہ مکرانیوں نے پوری طاقت جمع کی تھی۔لیکن وہ اسلامی فوج کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور مسلمانوں کو شاندار فتوحات حاصل ہوئیں۔

مکران اور فتح مکران:۔

مقدسی نے احسن التقاسم فی معرفت الاقاسم کے صفحہ ۴۷۴ پر مکران کے متعلق لکھتے ہیں" مکران میں زیادہ تر خانہ بدوش آباد ہیں۔کھیتی باڑی بارش کے رحم وکرم پر ہے۔عراق

کے لطائف کی طرح یہاں بھی زیر آب نشیبی علاقے پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے خانہ بدوش (بلوچ وقفص) فارس کے کردوں سے ملتے جلتے ہیں اور مکران میں جاٹوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ یہ لوگ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ مچھلی اور آبی جانوران کی خوراک ہے۔

مکران کا ایک خودمختار متواضع اور منصف والی ہے اس جیسے عادل بادشاہ کہیں دیکھنے میں نہیں آتے۔

محمد بن قاسم کا مکران پہنچنا:۔

اور یوں جب سندھ کے بحری قزاقوں نے جہازوں کو لوٹا تو حجاج بن یوسف نے اپنے ہونہار داماد عظیم سپہ سالار محمد بن قاسم کو 702ء میں ان کی سرکوبی کیلئے بھیجا۔ جو پنجگور سے ساحلی علاقوں سے ہوتے ہوئے سندھ پر حملہ آور ہوا تھا۔

سراندیپ سے عرب جانے والے مسلمان خواتین کو سندھ کے بحری قزاقوں نے لوٹا تھا۔ جب حجاج نے راجہ داہر سے ان کی سرکوبی کیلئے کہا تو اس نے جواب دیا کہ بحری ڈاکو میرے اختیار میں نہیں ہیں۔ اس طرح حجاج نے عبداللہ بن بنہان سلمیؒ اور بدیل طیفہ کو بھیجا لیکن یہ دونوں شہید ہو گئے۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کو بھیجا۔ حجاج نے محمد بن قاسم کو یہ تاکید کی آہستہ آہستہ منزلیں طے کرنا تاکہ ساری فوج آ کر تم سے مل جائے۔ محمد بن قاسم نے شیراز میں پڑاؤ ڈالا۔ یہ ۹۲ھ کا ذکر ہے۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے محمد بن قاسم چھ ماہ تک شیراز میں مقیم رہے۔ اور وہاں سے جب مکران پہنچے تو مکران کے گورنر محمد بن ہارون نمیری نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ یہاں چندروز تک محمد بن قاسم کا قیام رہا۔ تاریخ یعقوبی نے ایک ماہ قیام لکھا ہے۔

محمد بن قاسم 693ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اسلامی تاریخ کے ایسے عظیم وسپہ سالار تھے جنہوں نے 17 سال کی عمر میں سندھ کو فتح کیا۔ مزید برآں تفصیل سے کہ لنکا سے ایک تجارتی جہاز بصرے کی جانب جا رہا تھا جس میں بیوہ عورتیں اور یتیم بچے بھی سوار تھے۔ اس

جہاز کو سندھ کے بحری ڈاکوؤں نے لوٹ کر مسافروں کو پکڑ لیا۔ گورنر حجاج بن یوسف نے سندھ کے راجہ داہر کو ان ڈاکوؤں کی سرکوبی کا حکم دیا۔ لیکن راجہ داہر نے منفی رویہ اختیار کیا۔ اس پر حجاج نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو چھ ہزار فوج کی کمان میں سندھ بھیجا۔ نوجوان سپہ سالار نے سندھ پر پہنچتے ہی دیبل پر حملہ کر کے فتح حاصل کی اور مسلمان قیدیوں کو چھڑا کر عرب بھیج دیا۔

اس کے بعد متعدد لڑائیاں لڑیں اور آخر کار راجہ داہر کی 60 ہزار فوج کو جس میں جنگی ہاتھی بھی تھے شکست فاش دی۔ اور 2 جون 712ء کو راجہ داہر مارا گیا۔

آپ نے یہاں کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے برتاؤ کیا اور پھر فتح کے پھریرے اڑاتے ہوئے ملتان تک جا پہنچے۔ آپ کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا کہ آپ کو واپس بلالیا گیا۔ بہادر، دانا اور منصف مزاج سپہ سالار 24 سال کی عمر میں آٹھویں صدی عیسوی میں وفات پائی۔

☆

حوالہ جات

مکران عہد قدیم سے جدید عہد تک : حمید بلوچ

برصغیر اور عرب مورخین : خورشید احمد فاروق (کراچی)

کوچ و بلوچ : میر گل خان نصیر

بلوچ تاریخ و عرب تہذیب : ڈاکٹر اسماعیل دشتی البوشہری

بلوچستان اضلاع اور تاریخ : ایم عثمان

Gazetteer of Balochistan

Imperial Gazetteer of Balochistan

باب دوئم

پنجگور

تاریخ کی نظر میں

وجہ تسمیہ:

اس خطے کی جغرافیائی سیاسی وسماجی اور مختلف اقوام کی عروج زوال تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور مذاہب کے متعلق ملکی وغیر ملکی محققین، مورخین اور سیاحوں کے سفر ناموں پر مبنی تاریخی ومستند قدیم کتابوں میں کافی ذکر ہے۔ اور خاص کر پنجگور کا تاریخی طور پر قبل از تاریخ ذکر اس کی قدیم تہذیب وتمدن اور ثقافت کی عکاس ہے۔ یہ خطہ تاریخ میں بہت دور تک ماضی کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ان حوالوں اور مختلف آراء میں پنجگور کے نام کے متعلق متضاد اور قابل توجہ وقابل فہم آرا پر مبنی حوالے مورخین / محققین کو مزید جستجو وتحقیق کے لئے اپنی جانب راغب کرتی ہیں۔

بلوچی زبان میں پنچ کے معنی پانچ اور گور بہ معنی قبر کے ہیں جو بعد میں بگڑ کر پنجگور میں کنورٹ ہوا۔ اس کے متعلق یہ دلیل دیا جاتا ہے کہ علاقے میں پانچ صحابہ کرام کی قبروں کی موجودگی کی مناسبت سے یہ نام پڑ گیا۔ لیکن کافی تلاش وجستجو کے باوجود اب تک ان قبروں کی نشاندہی یا کسی سے گواہی یا کسی بھی طرح ان کے متعلق کوئی آثار وجامع نشاندہی نہیں ہوئی ہے۔

دوئم یہ کہ پنجگور بلوچی کی لفظ پنچ کور کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یعنی پنچ بہ معنی پانچ اور کور بہ معنی نہر جو پانچ نہروں کے نام سے جڑا ہوا ہے۔ یعنی اس علاقے کا نام پانچ نہروں کی موجودگی سے ماخوذ ہوئی تھی۔ پانچ پنجگور کی بنیادی اساس سمجھی جاتی ہے۔ پنچی کہن نامی علاقہ اب بھی موجود ہے۔ بعض اس آراء کو بنیاد بنا کر اس پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اس کے

برعکس عربوں کی آمد اور لڑائیاں، صحابہ کرام و بزرگوں کی موجودگی کو عرب مورخین اپنی کتابوں میں تحریر کر چکے ہیں۔ اور اس سے کوئی اختلاف نہیں رکھ سکتا کہ وجہ تسمیہ سے قطع نظر یہ خطہ قدیم عہد سے اپنی جغرافیائی محل وقوع، تاریخ، تہذیب وتمدن کی بناء پر بہت اہم خطہ رہا ہے۔

پنجگور کے نام کے متعلق قدیم تاریخی کتابوں میں اختلافی آراء بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ واضح ہے کہ پنجگور کا پرانا نام قزبور، قنز بور یا کیز بور تھا۔ مقدسی کتاب ''احسن التقاسیم فی معرفت الاقاسیم'' کے صفحہ نمبر 478 پر درج ہے کہ مکران کا صدر مقام نخلستانوں میں واقع شہر پناہ مٹی کی ہے۔ جس میں دو دروازے ہیں۔ طوران دروازہ اور تیز دروازہ، شہر پناہ کے چاروں طرف خندق ہیں۔ جامع مسجد بیچ بازار میں ہے، باشندے ایک دریا (نہر) کا پانی پیتے ہیں۔ ان کی زبان نا قابل فہم ہے۔

مزید اس علاقے کے بارے میں شریف ادریسی کتاب ''نزہتہ المشتاق'' قلمی صفحہ نمبر 113 پر پنجگور کے متعلق لکھا ہے اور ساتھ ہی تحریر ہے کہ فیزبور عام لوگوں اور تاجروں سے آباد ہے۔ عام طور پر یہاں کے لوگ مال دار نہیں ان میں سلامت روی ہے اور خوش مماثلی بھی اور یہ شکوک وشبہات سے دور رہتے ہیں۔ اور پاکبازی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور سیاسی طور پر فیزبور کا شمار مکران میں ہوتا ہے۔

مزید اس علاقے کے متعلق ''برصغیر اور عرب مورخین'' نامی کتاب میں اس طرح درج ہے کہ یہ ایک آباد شہر ہے۔ بہت سے کاروباری یہاں رہتے ہیں، باشندے مالدار ہیں، خوش معاملہ، نیک چال چلن، شریف اور پاکباز ہیں۔

۲ ھجری کو جب راجہ چچ کرمان اور مکران کی سرحد تعین کرنے کیلئے جا رہا تھا تو اس نے کنزبور (پنجگور) قلعہ کی از سر نو تعمیر کی اور وہاں پنجتوری یعنی پانچ سازوں والی نوبت مقرر کی۔ جو ہندوؤں کی رسم کے مطابق شام اور پو پھٹنے کے اوّل وقت بجائی جاتی ہے۔

تاریخی مستند کتاب ''فتوح البلدان'' کے اردو ترجمہ صفحہ نمبر 419 پر تیز مکران اور کیز مکران کا ذکر نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف فیزبور (پنجگور) کا ذکر ہے۔

لیکن نامور مورخ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے تحقیق کے مطابق راجہ چچ کا دور حکومت ہجرت کے۳۲ویں سال سے شروع ہو کر ۷۶ ہجری تک ہے۔ مگر اس کے برعکس چچ نامہ کے مطابق ہجرت کے تیسرے سال میں چچ کے دل میں کرمان اور مکران کی فتح کا خیال پیدا ہوا۔ چچ نامہ میں اس حوالے سے تحریر ہے کہ چچ وہاں سے مکران کی سرزمین کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں اس نے دیکھا کہ یہاں ہر آدمی اس کی اطاعت سے کترا رہا ہے۔ آخر کار مکران کے پہاڑ اور درّے سے گذر کر دوسرے شہروں کی طرف جا پہنچا وہاں ''پنج پور'' نام کا ایک پرانا قلعہ تھا جسے اس کے حکم سے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا اور وہاں پنجوری یعنی پانچ سازوں والی نوبت مقرر کی جو کہ ہندوؤں کی رسم کے مطابق شام اور پو پھٹنے کے وقت بجائی جاتی ہے۔ پھر اس نے اطراف کے سارے دہقانوں کو بلا کر عمارت کے مکمل کرنے کا حکم دے کر وہاں سے کوچ کیا اور اس نہر کے کنارے جا کر خیمہ زن ہوا جو مکران اور کرمان کے درمیان ہے۔ اس مقام کو اس نے مشرقی سرحد قرار دیا اور نہر کے کنارے کھجوروں کا ایک جھنڈ لگا کر اعلان کیا کہ مکران اور کرمان کی سرحد یہ کھجور کے درخت ہیں۔

جس طرح کہ مندرجہ بالا سطور میں پنجگور کا ذکر تاریخی حوالے سے کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اصطخری اپنی تحریر (340 بمطابق 951) میں ان چھوٹے چھوٹے پیداواری ذرائع کے حوالے سے مکران کے شہروں کا ذکر کرتے ہیں۔ جس میں پنجگور کو فنز بور تحریر کرتے ہیں اور اسکے ساتھ ساتھ پنجگور کا ذکر دیگر سمتوں سے بھی کرتے ہیں۔ فزبور، فناجر، فنجر وغیرہ یہ مکران کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ابن حوقل لکھتے ہیں کہ مکران کا کل رقبہ سندھ کے بالائی علاقے ملتان کا نصف ہے۔ یہاں کھجور کے بڑے بڑے باغات ہیں۔ لیکن مکران کا سب سے بڑا شہر پنجبور (پنجگور) ہے۔ مکران میں بولی جانی والی زبان کے بارے اصطخری اور ابن حوقل لکھتے ہے کہ یہ نئی فارسی (Farisiyya) اور مکرانی (Makriyya) ہے۔ جبکہ المقدسی کے مطابق ان بہادر اور وحشی لوگوں کو جو کہ پنج بور میں آباد ہیں انہیں بلوص اور ان کی زبان کو بلوصی کہا جاتا ہے۔

ابن حوقل نے لکھا ہے کہ یہ شہر ایک دریاء (وادی) کے کنارے واقع تھا۔شہر کے بیچ میں ایک قلعہ تھا اور شہر کے گرد کی سطح زمین بہت زرخیز تھیں ان میں انگور، انار اور میوے جو سرد ملکوں سے مخصوص ہیں پیدا ہوتے تھے۔مقدسی نے بیان کیا ہے کہ یہ شہر دریا کے دونوں کناروں پر دو حصوں میں آباد تھا اور دوسرے حصہ میں جو بودین کہلاتا تھا اس میں تاجر رہتے تھے۔ان تاجروں کی دکانوں سے جو بازار میں تھیں خراسان کے لوگ بہت لین دین رکھتے تھے۔مقدسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں کے مقانات کچے کے بنے ہوئے تھے۔پانی کے لئے ڈھکی ہوئی نہریں تھیں لیکن پانی کم اور خراب تھا۔

عباسی دور (32ھ تا 923ھ) کے عرب مورخین ابن حوقل اور اصطخری دونوں اس بات کو دہراتے ہیں کہ مکران اور منصورہ (سندھ کا شہر) کے درمیان کچھ لوگ ہیں۔جنہیں جٹ یا جاٹ (الزط) کہتے ہیں جو مچھلی اور آبی پرندوں پر گزر بسر کرتے ہیں۔اور ان کی جھونپڑیاں بانس کی ہیں۔مکران سے اوپر جو لوگ پہاڑوں پر رہتے ہیں وہ کردوں کی مانند ہیں۔ابن خردادبہ (متوفی 300ھ) ساسانی بادشاہ اردشیر بالکان (سریر تخت 228 عیسوی) کے ماتحت جن بادشاہوں کا ذکر لاتا ہے۔ان میں ایک شاہِ کوچان (الملک القفص) بھی ہے۔اسی دور کے مورخ المقدسی لکھتے ہیں۔"مکران کے علاقہ بنجبور (پنجگور) کے نواح میں کچھ لوگ ہیں۔جنہیں بلوصی کہتے ہیں۔ان کی زبان کوئی نہیں سمجھتا اور اسلام سے قریباً ناواقف ہے"۔اموی دور (41ھ 132ھ) میں مکران اور وسطی بلوچستان میں جاٹوں اور ترکوں کا ذکر آتا ہے۔

معجم البلدان میں بحوالہ اصطخری میں مکران کے متعلق لکھا ہے کہ جو شخص درحدود ۳۴۰ ھجری کو مکران کی حکومت پر قابض ہے وہ شخص عیسیٰ بن مہران کے نام سے مشہور ہے اور اس کی زبان میں معدان کو مہران کہتے ہیں (عیسیٰ بن مہران) اور اس کا دارالحکومت ایک بڑے شہر میں واقع ہے۔جو شہر ملتان کی نصف آبادی کے لگ بھگ ہے اور اس میں کثرت سے کھجور کے درخت ہیں اور یہ مکران میں تجارت کی ایک منڈی اور بندرگاہ ہے۔اور اس کے بعد مکران کے شہروں میں بڑا شہر فنز بور (پنجگور) ہے۔مکران کی جس فانیز کا تذکرہ تواریخ میں آیا ہے وہ کھجور کا شیرہ (شیرگ، جوس) معلوم ہوتا ہے جس کو ایک خاص روایتی طریقہ سے بنایا جاتا ہے۔

خواجہ ملک محمد سعید اپنی کتاب ''بلوچستان ماقبل تاریخ'' میں تحریر کرتے ہیکہ کسی زمانے میں آج پنجگور '' کنز بون'' رہا ہے تاریخ المقدسی میں بلوچ علاقوں کے دو مرکزی شہر یا صدر مقام ایک فنز بور اور دوسرا قصدر تھے اور فنز بور مکران اور ایرانی مکران صدر مقام تھے۔

'' جغرافیہ خلافت مشرقی'' میں مکران کے صدر مقام فنز بور ہے جس میں دزک اور جالک بھی شامل ہیں۔ محمد حسین عنقا ''بلوچ قوم کے دور قدیم کی تاریخ'' میں رقم طراز ہیں کہ پنجگور سے ایک راستہ توران کے لئے نکلتا کہ جس کا صدر مقام قصدر رہے۔ اور یوں کنز بون سے فنز بور سے پنجگور میں تبدیل ہوئی۔ اور قدیم تاریخ میں مرکزی مقام رہا ہے یہ ایرانی مکران اور اس مکران کا صدر مقام تھا۔ اسکی سرحدیں دزک اور خضدار تک پھیلے ہوئے تھے۔

تاریخی کتابوں میں قدیم زمانے میں یہاں کی آبادی کو بلوص ، بیلوص ، بعلوث ، برلاس ، برنس ، بالس، برلچ اور بلوچ ظاہر کی گئی ہے۔ ابن حوقل کی کتاب ''المسالک والممالک'' جو کہ دسویں صدی عیسوی میں تحریر ہوئی ہے اس کے مطابق عربوں کے حملے کے دوران ایرانی زمین میں کوچ و بلوچ آباد تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بروہی اپنی کتاب ''بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور ان کی حکومت'' میں تحریر کرتے ہیکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں مکران کے تین شہروں کا ذکر ملتا ہے فزبور (پنجگور) کیز (کیچ) تیز جو کہ ایران میں واقع ہے۔

سردار گیشکوری '' تاریخ بلوچ نسل'' میں رقم طراز ہیکہ اس زمانے مکران کے شہروں کے ناموں میں پنجگور، مشکے، دزک قصر قند، کنبلی (کیچ) یعنی مشکے سے دزک اور قصر قند کے علاقوں تک مکران پھیلا ہوا تھا اور پنجگور صدر مقام تھا۔

جغرافیہ خلافت مشرق صفحہ 492 میں درج ہیکہ صوبہ مکران کا خاص تجارتی مرکز خلیج فارس کے ساحل پر تیز بندرگاہ تھا۔ مکران کا داالحکومت ''فنز بور'' یا ''بنجور'' تھا یہ ملک کے اندرونی حصہ میں اس جگہ پر واقع تھا جسے آج ''پنجگور'' کہتے ہیں۔

نوحان و گجر جنگ:۔

گجر تاریخ کے تفصیلات کے مطابق ستارھویں صدی تک ایران میں صفوں کی سلطنت قائم تھی۔اس کے بعد قاچار (گجر Gajar) کا غلبہ ہوگیا۔قاچار یا گجر آرمینیا کے قزلباش قبائل میں سے تھے۔اپنی بہادری اور چالاکی کی وجہ سے ایران میں جگہ بنالی۔جس میں شاہ عباس نے ان کی بڑی مدد کی۔اس قبیلے کا ایک نامور شخص شاہ قلی خان قاچار صفوی فوج میں ایک کمانڈر تھا۔اس نے قاچاروں کو مضبوط بنایا۔صفوں کے زوال کے بعد قاچاروں نے حکومت پر قبضہ کیا۔ان کا پہلا بادشاہ نصیر الدین ایک چرواہاں تھا۔مگر ایک مضبوط قبیلے کا فرد تھا۔اس کی حکومت 1925ء تک قائم رہی۔

1925ء کو ان کے آخری بادشاہ احمد شاہ کو معزول کیا گیا۔اس کی معزولی میں برطانوی حکومت نے رضا خان پہلوی کی مدد سے عمل میں آئی۔رضا خان اس وقت شاہ کے دربار میں بڑی قوت حاصل کر چکا تھا اور بعد میں وہ خود بادشاہ بن بیٹھا۔اور تخت نشین ہوتے ہی حملہ آور ہوا۔اور 1928ء کو بلوچستان کے مضبوط حاکم امیر دوست محمد شاہ بلوچستان کہلاتا تھا کو شکست ہوئی اور مار دیا گیا اور ساتھ ہی ایران سے اس کی قوت کا خاتمہ ہوا۔

یادرہے کہ قاچاروں کے دور تک ایران سرحدیں کرمان کی سرحدوں تک محدود تھی۔ اور نیم آزاد یا قلات کے زیر اثر رہا۔مگر شاہ ایران بسا اوقات بلوچستان پر حملہ کرتا رہتا۔اور ان سے ٹیکس وصول اور ان کی مزاحمت پر مظالم ڈھاتے رہتے تھے۔

روس نے کاکیشیا کے چند علاقوں پر قبضہ کرلیا تو انگریز بوکھلا گیا۔اس نے ایران دوستی شروع کی اور اس کو اپنا حامی بنالیا۔روس سے دونوں خوف زدہ تھے۔پہلے انگریز نے ایران کی مدد کرنی شروع کی، نہ صرف یہ بلکہ ایران کو بلوچستان کے حاکموں کو زیر کرنے کیلئے حملہ کرنے کی ترغیب دیتا رہا۔اسی دور میں انگریز نے بلوچ سرزمین کو تقسیم کردیا۔اب بلوچستان تین ملکوں یعنی برطانوی ہندوستان، افغانستان اور ایران میں بٹ گیا۔

انگریز نے نہ صرف ملک کو تقسیم کیا بلکہ ہزاروں میل بلوچ علاقہ ایران کے تسلط میں

دے دیئے۔ جس سے بلوچ مزاحمت بھی کرتا رہا اور مار کھاتا رہا۔ ایران کو بلوچ کے خلاف انگریز کی برابر مدد اور شے حاصل رہی۔ بلوچوں پر ایرانی سپاہیوں کی طرف سے حملے ہوتے رہتے تھے۔

شروع میں قاچار (گجر) کی حکومت تھی۔ پھر 1925ء کے بعد پہلوی سلطنت برسر اقتدار آیا۔ اس کی پالیسی بلوچ کے حوالے زیادہ سخت گیر رہا۔ اور آج پہلوی حکمرانی کے بعد وہی پالیسی چل رہی ہے۔

اس وقت سے اب تک ہر ایرانی فوجی بلکہ یوں کہیں ایرانی باشندوں کو قاچار کی نسبت سے گجر کہتے ہیں۔ اب تک یہ مقولہ ایرانی فورسز کیلئے کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ تاریخ میں واضح ہے کہ ایرانی حملہ آور اکثر پنجگور کے علاقوں میں لوٹ مار کے علاوہ اس علاقے کو تہہ و بالا کرتے۔ اور نسبت سے بھی مقامی لوگ نفرت کے طور پر ان فورسز حملہ آورں کے لئے گجر لفظ استعمال کرتے تھے۔ الفت نسیم کے مطابق گجر جو کہ قاچار کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اور وہ عموماً اس علاقے کو اپنے قبضے وتصرف میں لانے اور لوٹ مار کی غرض سے حملوں کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔

جب ایک ایرانی سپہ سالار شاہ پور کی سرکردگی میں ایرانی لشکر نے پنجگور کے ''کوہ بن'' کے مقام پر پنجگور پر قبضہ کرنے کی غرض سے پڑاؤ ڈالا تو جس کے مقابلے میں نوحان نامی مقامی سردار نے ہنگامی طور پر ایک لشکر ترتیب دی۔ جس کی مدد کچک سے میر کمبر کی سرکردگی میں ایک لشکر نے کی اور کوہ بن کے مقام پر شدید لڑائی ہوئی۔ اس جنگ میں میر کمبر نے شاہ پور کو قتل کر دیا اور اس کا سر نیزے پر گاڑھ کر میدان جنگ میں اختتام جنگ تک لہراتا رہا جس سے ایرانی لشکر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ جب میر کمبر کو پتہ چلا کہ گجر لشکر کو کوہ بن کے مقام پر پڑاؤ ڈالوانے والا تسپ گاؤں کا ایک مقامی سردار ہے۔ جو کسی کوٹی نامی قبیلہ سے ہے تو کمبر نے اس کے قلعے پر حملہ کر کے اسے تہہ وتیغ کر کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور کسی زنگی نامی شخص کو جو اس کا رشتہ دار تھا قلعے میں اپنا نائب مقرر کیا۔

لیکن تاریخ میں ان کا ذکر نہیں ملتا اس کے بارے میں ''تاریخ نسیمی'' میں درج ہے

کہ نوحان پنجگور کے ایک اہم تاریخی شخصیت تھے۔ جس نے کمالِ بہادری سے ایرانی قاچار (گجر) حملہ آوروں کا دومرتبہ ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پنجگور کو تاراج ہونے سے بچالیا۔

نوحان کے آباؤ اجداد اور قبیلہ کے متعلق سب کچھ گوشہ گمنامی میں ہیں۔ رندوں میں ایک بہادر جنگجو طائفہ نوحانی'' موجود ہے۔ ممکن ہے کہ مذکورہ نوحان نامی شخص قبیلہ نوحانی سے ہو۔

حکمرانی کے ادوار:۔

پنجگور ہمیشہ سے مکران کا حصہ رہا ہے۔ اس علاقے کی قدیم تاریخ بہت نزدیک سے موجودہ وقتوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس علاقے پر گچکی، بلیدی ودیگر کی حکمرانی رہی ہے۔ پنجگور میں گچکی حکمران ملک دینار جو کہ ذکری فرقے کے ماننے والے تھے اوران کے زمانے میں ذکری فرقہ مکران میں کافی پھلا پھولا۔

بعض مورخین تاریخی حوالوں سے ذکر کرتے ہیکہ گچکی قبیلہ راجپوتانہ یعنی جے پور، جودھ پورہ مارواڑ سے نقل مکانی کر کے پہلے پہل پنجگور کے قریب وادی گچک میں آباد ہوئے اس لئے ان کا نام گچکی پڑا۔ جب کہ اس علاقے میں اسلام کی شمع روشن ہوئی تو بعد میں یہ لوگ مسلمان ہوگئے۔ مگر بعد میں اکثریت نے ذکری فرقے کے ساتھ شمولیت اختیار کی۔ گچکیوں کے ماخذ کے بارے میں تاریخ میں مختلف آراء موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے اہم بلوچ مورخ میر گل خان نصیر سے موخوذ ہے کہ جو اس رائے کو بالکل غلط اور بے بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق گچکیوں کے متعلق یہ نظریہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے اور بیان کرتے ہیکہ ''گچک'' علاقہ پنجگور کا ایک وسیع کوچہ یا وادی ہے۔ عام بلوچی اصطلاح کے مطابق جس طرح شاہرک کے رہنے والے شاہرکی اور پیدارک کے رہنے والے پیدارکی کہے جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح گچک کے رہنے والے گچکی کہلاتے ہیں۔ مکران کے موجودہ گچکی خاندان کے اجداد اپنے تدّبر اور جنگجو یانہ صفات کی بدولت اوّل اوّل پنجگور کی سرداری پر قابض ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ کیچ اور تمام مکران کو اپنے قبضہ واقتدار کے نیچے لے

آئے۔ گچکی جو آج مکران کا حکمران طبقہ ہے گچک کے کئی گھرانے جو جھلا وان میں آباد ہیں گچکی کہلاتے ہیں۔ حالانکہ مکران کے حکمران گچکی طبقہ کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ تو کیا جان پہچان تک نہیں اور وہ براہوی زبان بولتے ہیں۔ لہٰذا گچکیوں کو بلوچ کے علاوہ کوئی اور نسل کہنا ایک من گھڑت مفروضے کے علاوہ اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ انگریزوں کے دور حکومت میں سردار بہادر میر محراب خان گچکی نے اس غلط نظریے کے خلاف بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کے نام ایک یادداشت میں جسے بعدازاں تشہیر کیلئے بھی چھپوادیا گیا تھا شدید احتجاج کرتے ہوئے ان الفاظ میں حکومت کے گوش گذار کیا کہ "بعض حاسدین نے بلاوجہ ان (گچکیوں) کو راجپوت کہنا مشہور کر دیا ہے جو دراصل نہ صرف غلط بلکہ ناممکن ہے۔ کیونکہ بلوچوں کے غیور اقوام قبیلے جو مکران میں آباد تھیں ہرگز کسی غیر بلوچ قوم کی اطاعت کی اتنی دیر تک متحمل نہیں ہوسکتیں۔

بہر حال اس بات سے قطع نظر ایک زمانے میں ملک حکمرانوں نے پنجگور اور کیچ پر ہوت و بلیدی حکمرانوں نے حکمرانی کی۔ اگرچہ یہ سردار ہندو مذہب سے تھے لیکن ان کے علاوہ اس علاقے میں کوئی ہندو نہ تھا۔ اقوام ملک غیر مسلمان قابض تھے۔ اگرچہ یہ تینوں سردار تاعین حیات خود اپنے ہندو مذہب پر قائم رہے جو اولاد ان سے پیدا ہوئی اپنی ماؤں کی خاندان کی طرف رجوع کر کے مذہب اسلام قبول کیا۔ ان کے نام کے ساتھ ملک جو ماؤں کی خاندان کا لقب تھا بولا جاتا تھا۔ چنانچہ ملک دینار کو بعدازاں شیخ کا لقب دیا گیا۔ جواب تک شیخ کو مخفف کر کے شئے عمر، شے قاسم بلائے جاتے ہیں۔

پنجگور کا علاقہ زیادہ تر بہ طریقہ دوستانہ بموجب رشتہ داری ان کے ہاتھ آیا۔ 1740ء میں اس قبیلے کا اتنا زور تھا کہ نادر شاہ کو ان کے خلاف جنگ کرنا پڑی۔ 1613ء کے بعد میر اللہ داد گچکی جو میر ابراہیم نوشیروانی کا بھانجا اور خان آف قلات میر احمد خان کا داماد تھا پنجگور پر حکمرانی کی۔ جس طرح پہلے ذکر ہوا کہ یہ علاقہ خوانین قلات کی عملداری میں اس وقت آیا جب انہوں نے ان پر لشکر کشی اور ذکری فرقہ کے بہانے حملہ کیا۔ اس

علاقے پر پہلا حملہ عبداللہ خان قہار (خوانین قلات) کے دور میں ہوا۔1739ء میں میر محبت خان اپنی معزولی کے بعد نادر شاہ کے حکم سے دوبارہ والی قلات مقرر ہوا تو اس نے پنجگور پر حملہ کر دیا۔اس حملے میں لوٹ مار اور سرداران مکران کی باہمی مناقشوں سے جو ہمہ وقت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے عمل نے ان پر حملہ کرنے کا موقع دیا اور سرداران مکران اپنی ذاتی عناد کی بناء پر ہمیشہ خوانین قلات کو مکران میں لوٹ مار کی دعوت دیا کرتے تھے۔
میر محبت خان کے دور میں کیچ پر ملک دینار گچکی کی حکومت تھی۔جبکہ پنجگور میں میر جلب گچکی کا نواسہ میر شاہو کی حکمرانی تھی۔ ملک دینار گچکی خوانین قلات کی ایماء پر تمام مکران کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتا تھا۔ پنجگور کے حاکم میر شاہو ملک دینار سے عداوت رکھتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پنجگور کو کیچ کے ساتھ ضم کیا جائے۔میر شاہو کی سرکوبی کیلئے ملک دینار نے اپنے بیٹے میر شئے عمر کو کیچ سے ایک بڑا لشکر کے ساتھ پنجگور روانہ کیا۔میر شئے عمر نے پنجگور کے قلعہ عیسیٰ پر قبضہ کر لیا۔
پنجگور کے گچکی حکمرانوں کے خوانین قلات کے میر احمد یار خان دوئم کے دور سے رشتہ داریاں چلی آرہی تھیں۔میر عیسیٰ گچکی جو شئے عمر کے پنجگور پر حملے کے وقت گرمکان میں رہتا تھا۔میر احمد خان کا نواسہ اور میر شاہو گچکی کا قریبی رشتہ دار تھا۔جب پنجگور کا علاقہ شئے عمر کے ہاتھ آیا تو میر عیسی پنجگور سے فرار ہو کر خوانین قلات کے پاس مدد کا طلب گار ہوا۔ میر محبت خان نے نہ صرف خاندانی رشتہ داری کی خاطر اس کی مدد کا بیڑہ اٹھایا اور سراوانی اور جھلاوانی لشکروں کی مدد سے 1741ء میں پنجگور پر دھاوا بول دیا۔شئے عمر ان حملوں کے لئے تیار نہ تھا لہٰذا وہ قلعہ عیسیٰ میں محصور ہو گیا۔میر محبت خان نے قلعہ عیسیٰ کا چالیس دن تک محاصر جاری رکھا۔لیکن وہ قلعہ فتح نہ کر سکے۔میر شئے عمر کی ماں بی بی روز خاتون زوجہ ملک دینار گچکی میٹرھ لے کر میر محبت خان کے پاس گئی اور قرآن کا واسطہ دیکر شئے عمر کی جان بخشی چاہی۔میر محبت خان نے شئے عمر کو معاف کر دیا۔اس واقعہ کے بعد میر شئے عمر نے قلعہ عیسیٰ کے دروازے کھول دیئے اور خود باہر آکر محبت خان کے سلام مشرف ہوا آئندہ پر امن رہنے

کا وعدہ کر کے اپنے لشکر کے ساتھ کیچ روانہ ہوا۔ میر محبت خان نے میر عیسیٰ کے والد میر اللہ داد کو پنجگور کا سردار مقرر کر کے واپس کوچ کیا۔ مکران پر نصیر خان کے حملوں کا آغاز پنجگور پر ان کے حملے سے شروع ہوتا ہے۔ جب میر محبت خان والی قلات نے شئے عمر کو پنجگور سے نکال کر باہر کر دیا تو انہوں نے میر اللہ داد کو پنجگور کا حاکم مقرر کیا۔

میر اللہ داد کی وفات کے بعد اس کا بڑا لڑکا میر عیسیٰ خان پنجگور کا حاکم بن گیا۔ میر گاجیان میر عیسیٰ کا چھوٹا بھائی تھا۔ میر گاجیان محلاتی سازشوں کے ذریعے اپنے بڑے بھائی میر عیسیٰ خان کو قتل کر کے خود پنجگور کا حاکم بن بیٹھا۔ میر عیسیٰ خان کا بڑا بیٹا میر کرم شاہ میر گاجیان سے مقابلے کی تاب نہ لاکر پنجگور سے فرار ہوگیا۔ میر نصیر خان کے پاس قلات جاکر مدد کا طلب گار ہوا۔ میر نصیر خان کے اقتدار کا ستارہ اس زمانے میں عروج پر تھا اور وہ خود مکران پر حملہ کیلئے پر تول رہا تھا۔ اس واقعہ نے اس کو ایک موقع فراہم کیا۔ اس نے میر کرم شاہ کی فریاد پر لبیک کہا اور جھلاوان کے لشکر کو ساتھ لیکر پنجگور پر حملہ آور ہوا۔ میر گاجیان اتنے بڑے لشکر کا سامنا کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ لہٰذا اس نے میر نصیر خان کے پہنچنے سے پہلے ہی پنجگور کا علاقہ خالی کر دیا اور تمپ اور کلاتک کی طرف نکل گیا۔ اس طرح میر نصیر خان بغیر کوئی جنگ لڑے پنجگور پر قابض ہونے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے میر عیسیٰ خان کے بیٹے میر کرم شاہ کو والی پنجگور مقرر کیا۔ میر نصیر خان جانتا تھا کہ وہ اتنے بڑے لشکر کے ساتھ مستقل پنجگور میں خیمہ زن نہیں ہو سکتے۔ چونکہ میر کرم شاہ میں مقابلہ کرنے کی اہلیت نہ تھی۔ لہٰذا انہوں نے اس کی مدد کیلئے میر بوہیر موسیانی کو تین سو آدمیوں کے ساتھ اس کی حفاظت کیلئے قلعہ عیسیٰ پنجگور میں مامور رکھا تا کہ وہ میر کرم شاہ کو میر گاجیان کے حملوں سے بچا سکے۔ جب پنجگور کو میر نصیر خان نے میر بوہیر موسیانی کے حوالے کیا تو اس نے اہلیان پنجگور پر اپنے ظلم وستم کو جاری رکھا۔ اور میر گل خان نصیر کے کتاب کوچ و بلوچ سے اخذ ہے کہ اس کے آدمیوں نے پنجگور میں چوری اور سینہ زوری کا ایسا بازار گرم کیا کہ امیر غریب کوئی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ میر کرم شاہ میر بوہیر موسیانی کے ظلم وستم اور سیاہ کرتوتوں سے اچھی طرح

آ گاہ تھا۔لیکن وہ اس کے خلاف حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔کیونکہ اسے جو سرداری ملی تھی وہ نصیر خان اور اس کے مقرر کردہ امیر میر بوہیر کے مرہون منت تھی۔لہٰذا اس کے خلاف جنگ کرنے کا مطلب میر گاجیان کو پنجگور پر حملہ کی دعوت دینا تھا۔جس میں نقصان اس کا اپنا ہی تھا۔لہٰذا اس نے اندرون خانہ میر بوہیر کے خلاف بغاوت کو ہوا دینا شروع کردیا۔اس سے پہلے کہ میر کرم شاہ کسی قسم کی جرأت کا از خود مظاہر کرتا تو اہلیان پنجگور نے میر یعقوب گچکی کی سرکردگی میں میر بوہیر کو پنجگور سے نکالنے کی کوشش شروع کردی اور وہ بغاوت کے لئے کسی اچھے موقع کا انتظار کرنے لگے۔میر یعقوب کو قدرت نے جلد ہی وہ موقع فراہم کردیا کہ وہ اہلیان پنجگور کو میر بوہیر کے ظلم وستم سے نجات دلا سکے۔اس زمانے میں پنجگور کے مضافات میں ایک شادی کی تقریب تھی۔تقریب سے قبل میر یعقوب خان نے میر بوہیر اور اس کے آدمیوں کو نیزہ بازی اور گھڑ دوڑ میں شرکت کرنے کی دعوت دی تھی۔اگرچہ بوقت تقریب میر بوہیر خود شریک نہ ہوئے۔لیکن اس کے لشکر میں شامل بیشتر سپاہی اس دعوت میں شرکت کرنے کیلئے گئے۔دوسری طرف میر یعقوب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قلعہ کے پاس کھجوروں کے باغات میں چھپا ہوا تھا۔اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس وقت میر بوہیر کے صرف چند ساتھی اس کے ہمراہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔لہٰذا اس نے موقع غنیمت جان کر قلعہ پر حملہ کردیا۔میر بوہیر اس حملے کیلئے تیار نہ تھا۔لہٰذا وہ حملے کی تاب نہ لاکر بزدلوں کی طرح اپنے آدمیوں کا خیال کئے بغیر قلات کی طرف اکیلا نکل پڑا۔اس طرح قلعہ میر یعقوب کے ہاتھ آیا۔اس موقع پر میر کرم شاہ جو کہ اندرونی طور پر اس سازش میں شریک تھا۔اس نے میر بوہیر کے آدمیوں کی کوئی مدد نہ کی۔لیکن وہ میر نصیر خان کے انتقام سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ وہ بھی پنجگور چھوڑ کر رخشان سے قلات کی طرف چل پڑا۔جب میر نصیر خان نے بوہیر کی خستہ حالت بزدلوں کی طرح پنجگور چھوڑ کر قلات پہنچنے کی روداد سنی تو اس نے اخوند محمد حیات کی سرکردگی میں لشکرِ جھلاوان کو میر یعقوب کی سرکوبی کیلئے پنجگور روانہ کردیا۔

اخوند حیات کو اس جنگ میں کامیابی ہوئی۔ میر یعقوب کیچ کی طرف بھاگ گیا۔ میر یعقوب کے فرار کے بعد اس کے لشکر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان میں سے بہت سوں کو اخوند حیات نے بطور یرغمال اپنے پاس رکھا اور باقیوں کو شرط وفاداری کا حلف دے کر رہا کر دیا۔ میر کرم شاہ کی بزدلی سے میر نصیر خان واقف تھا۔ لیکن اسے پنجگور میں ایک پٹھو حاکم کی ضرورت تھی جو کہ اس کی تابعداری کر سکے اس کام کیلئے میر کرم شاہ سے بہتر آدمی کوئی نہ تھا لہٰذا اس نے میر کرم شاہ کو دوبارہ پنجگور کے مسند پر فائز کر دیا۔ میر کرم شاہ کے پنجگور پہنچنے پر آخوند محمد حیات اپنے لشکر کے ساتھ واپس قلات آیا۔

انگریز مورخ کیپٹن ای سی راس (EC Ross) کے مطابق ملکوں کے دور حکومت میں مکران ترقی وخوشحالی کے بلندیوں کو چھو گیا تھا۔ اور دور دراز سے لوگ تلاش معاش کیلئے مکران کی طرف آتے گئے۔ جس کی وجہ سے مکران کی آبادی میں اضافہ ہوا اور معاشی سرگرمیاں تیز ہو گئیں تھیں۔ ملکوں کا مکران میں دور پر امن دور تھا۔

سترہویں صدی میں ملکوں کا دور حکومت اختتام پذیر ہونے کے ساتھ مکران کی حکومت بلیدی حکمرانوں کے ہاتھوں میں آئی۔ میر رحیم داد نے تاریخ بلوچستان میں لکھا ہے کہ میر ابوسعید جب مکران کی جانب متوجہ ہوا تو اس نے بلیدہ کے نام سے ایک نئی ریاست قائم کی۔ وہ بلیدیوں کے حکمران گزرے ہیں۔ آخری بلیدی حکمران شیخ قاسم ثانی کو 1740ء میں گچکی امراء نے شکست دیکر مکران پر قبضہ کیا۔ مگر گوادر پر شیخ بلار کی حکومت قائم رہی۔ مگر بالآخر اسے گچکی سربراہ ملک دینار نے فتح کیا اور پورے مکران پر اپنی حکومت قائم کی۔

ڈاکٹر حمید بلوچ عبدالرحمٰن صابر کے بیان کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ اس خاندان کے بانی شاہ ابوسعید تھا۔ اس خاندان کے مختلف حکمران کے نام حسب ذیل ہیں۔

ا۔ شکراللہ ۲۔ شئے قاسم ۳۔ شئے عبداللہ ۵۔ شئے قاسم ۶۔ شئے بلار

اس زمانے میں جب ایرانیوں سے بھی چپقلش برقرار رہی تو انہوں نے ادھر آنکھ اٹھا

کر دیکھا تو حاکم مکران شیخ قاسم نے نادر شاہ کی مدد طلب کی ۔تو تکی بیگ کو مدد کیلئے روانہ کیا گیا۔ایرانیوں نے صلحہ برقرار رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

شیخ عمر کے دور میں بلیدی سرکشی پر آمادہ ہوئے تو خان آف قلات نے نصیر خان اوّل سے مدد طلب کی۔خان اعظم نے مدد کی مگر ملک کا نصف مالیہ ان کی نذر ہو گئی۔

اس طرح وہ عملاً آدھے ملک پر قابض ہو گئے ۔اور ان کے ساتھ گچکیوں کے رشتے بھی قائم ہوئے۔

مکران پر شے بلار کی حکومت کے دوران خان آف قلات میر عبداللہ قہار دور حکومت 1714ء1734ء نے مکران پر حملہ کر دیا۔اس جنگ کے متعلق قاضی عبدالرحیم صابر کی کتاب ''مکران تاریخ کے آئینے'' کے مطابق یہ جنگ دڑام'' دڑام ءِ کوہ مکران کا ایک پہاڑی سلسلہ ہے میں ہوئی تھی۔

جنگ دڑام کے اصل وجوہات بیان کرتے ہوئے میر گل خان نصیر لکھتے ہیں کہ مکران پر حملہ کرنے سے میر عبداللہ کا مقصد ملک گیری نہ تھا۔وہ صرف لوٹ مار کی کمائی سے اپنے خزانے بھرنا اور اپنے لشکر کی پرورش کرنا چاہتا تھا۔اس لئے سردار پنجگور کے اطاعت پذیر ہونے کے باوجود بھی اس نے پنجگور کو لوٹا اور کئی بے گناہوں کو تہہ و تیغ کیا۔انہوں نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ حوس زر کی خاطر کیچ اور اس سے ملحقہ کلانچ پر حملہ آور ہوا۔

جب اہلیان کیچ اور کلانچ کو میر عبداللہ کے حملہ آور ہونے کی اور پنجگور کی تباہی کی اطلاع ملی تو لوگ شہر چھوڑ کر کوہ دڑام کی گھاٹیوں اور دروں میں جا کر پناہ گزین ہوئے۔

بلیدی خاندان کو خوانین قلات کے ان حملوں سے کافی نقصان پہنچا اور دوسری جانب گچکی خانوادے طاقت ور ہوتے گئے۔بلیدی خاندان کا آخری حکمران شئے قاسم تھا۔جو کہ شئے بلار کا بھتیجا تھا۔اسے ملک دینار گچکی کے ہاتھوں شکست ہوئی اور وہ اس جنگ میں مارا گیا۔اور اس طرح مکران پر گچکیوں کی حکومت قائم ہوئی۔

غزنوی خاندن کے مکران پر کئی بار حملوں اور چرواہوں اور مزدور طبقے پر بھاری خراج

انتہائی گراں گزرتے تھے۔اورانہیں ادا کرنے سے قاصر تھے۔اس بات کا ثبوت ہمیں والی مکران عیسیٰ معدن کے دفاع مکران کے دوران نظر آتا ہے۔چونکہ واضح ہوجاتا ہے کہ مکران کے لوگ پیشہ ورسپاہی نہ تھے۔ بلکہ کیچ اور پنجگور کے باسی اپنے والی کی معیت میں بدیسی افواج کا مقابلہ کرنے کیلئے متحد ہوئے تھے۔

میرنوروز خان کا پنجگور میں قتل:۔

میر محراب خان نے میر عیسیٰ خان گچکی کو پنجگور کا نائب مقرر کیا۔وہ اس عہدے پر عرصہ دراز سے تعینات تھا۔جب خداداد خان تخت پر بیٹھا تو وہ کسی بات پر میر عیسیٰ خان سے ناراض ہوااورانہوں نے اسے نائبی کے عہدے سے سکدوش کردیا۔

اس کی جگہ میر گاجیان کو پنجگور کا نائب مقرر کیا۔میر عیسیٰ خان نے اسے اپنا توہین اور حق تلفی سمجھا اور دل برداشتہ ہوکر خاران چلا گیا۔خاران کے حاکم میر آزاد خان نوشیروانی کو پنجگور پر حملہ کرنے کیلئے اکستا رہا۔آخر کار آزاد خان میر عیسیٰ خان کی مدد کیلئے راضی ہوااور اپنے بیٹے میرنوروز خان نوشیروانی کو ایک لشکر دے کر پنجگور کی طرف روانہ کیا۔پنجگور پہنچنے کے بعد اس نے قرب جوار کے علاقوں میں لوٹ مار شروع کی۔جب میر گاجیان کو اس کی اطلاع ملی تو وہ فوراً مقابلے کیلئے روانہ ہوا۔عیسیٰ خان اورنوروز خان لوٹ مار سے فارغ ہوکر واپس جارہے تھے کہ میر گاجیان اس لڑائی میں مارا گیا۔یہ واضح رہے کہ خان آف قلات معاہدہ مستونگ 1874ء کے تحت ازخود بلوچستان کے کسی بھی خطے میں مداخلت کرنے کا مجاز نہ تھے اور انہیں ہر معاملے میں انگریزی سرکار کی صلاح ومشورہ درکار تھی۔لیکن پنجگور واقعہ نے خان خداداد خان کو خواص باختہ کردیا اورانہوں نے انگریز حکومت کو اطلاع دیئے اور مشورہ کیئے بغیر سردار آزاد خان نوشیروانی کی خدابادان کی جاگیر پر قبضہ کرلیا۔اور سردار گاجیان کی جگہ اس کے بیٹے کو پنجگور کی حکمرانی واپس لوٹا دیا۔چونکہ وہ نابالغ تھا اس لئے خان آف قلات نے سردار گاجیان کے بھائی میر محمد علی خان کو اس کا سربراہ اور پنجگور کا نائب

مقرر کیا۔ جب خان قلات نے خداباداں پر قبضہ کرلیا تو سردار آزاد خان نوشیروانی نے اپنے بیٹے میر نوروز خان کو پھر پنجگور پر حملہ کرنے کیلئے تیار کیا۔ جب اس کی اطلاع خان قلات کو ملی تو اس نے اس دفعہ انگریز سرکار سے مشورہ کیا۔ چونکہ انگریزی سرکار اس کے گزشتہ از خود حملے کو بھلائے ہوئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے یہ بہانہ بنایا کہ پہلے معاملے کی تحقیق ہونی چاہیئے۔ خان آف قلات کو انگریزوں کا یہ مشورہ پسند نہ آیا۔ انہوں نے شہزادہ میر محمود خان کو فوج دے کر میر محمد علی خان کی امداد اور نوروز خان کی سرکوبی کیلئے پنجگور بھیج دیا۔ جب نوروز خان کو میر محمود خان کی زیر قیادت قلاتی لشکر کی اطلاع ملی تو انہوں نے پنجگور پر حملے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بہر حال پنجگور کے حوالے سے خان قلات کے یہ دونوں اقدامات کو انگریزوں نے ناپسندیدگی سے دیکھا۔ کیونکہ انہوں نے دوسری دفعہ از خود حملوں میں انگریزوں کو اعتماد میں لائے بغیر پہل کی جو معاہدہ مستونگ سے روگردانی ٹھہرائی گئی۔ جب سر رابرٹ سنڈیمن نے یہ صورت حال دیکھا تو اس نے خان کو مشورہ دیا کہ شہزادہ محمود خان کو فوراً مکران سے واپس بلایا جائے اور اس کے ساتھ وہ خود چل کر مکران کا دورہ کریں تا کہ معاملہ کو ٹھنڈا کیا جاسکے۔ شروع میں خان قلات نے سنڈیمن کے دونوں باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کیا لیکن بعد میں راضی ہوئے۔ اس نے شہزادہ محمود خان کو واپس قلات بلایا۔ برٹش سرکار کو اپنے ایک خفیہ مراسلے میں مکران کی صورت حال کے بارے میں سنڈیمن لکھتے ہیں۔

خان قلات کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مکران کے معاملات میں براہ راست مداخلت کرے اور وہاں سے مالیہ اکھٹا کرے یا گچکیوں کے معاملات میں دخل اندازی کرے ماسوائے اس معاہدے کے تحت جو کہ برٹش سرکار خان اور گچکی سرداروں کے مابین عرصے دراز پہلے طے پایا گیا تھا۔ مکران میں دخل اندازی خان کی جانب سے شروع ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ سرداران سراوان اور جھلاوان اور گچکی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو اس نے ان کی براہ راست سرکوبی کیلئے قدم اٹھائے۔ جب برٹش سرکار نے دیکھا کہ معاملات انتہائی الجھ گئے ہیں تو انہوں نے مداخلت کا فیصلہ کرلیا۔

برطانوی حکومت کی عملداری:۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنجر 1789ء1856ء ایسٹ انڈیا کمپنی کے بمبئی پریزیڈنسی میں بطور ایجنٹ کام کر رہے تھے۔ 1808ء میں برٹش انڈیا کے گورنر جنرل لارڈ منٹو نے انہیں سندھ کے حالات کے بارے میں ایک خفیہ مشن پر بھیجا۔ اس سفر کے دوران سن 1810ء1809ء میں اس نے بلوچستان کے مختلف علاقوں کے بارے میں معلومات اکھٹی کیں۔ مزید سفر کے بعد کیچ سے سفر کرتا ہوا پنجگور پہنچ گئے۔ پنجگور کے متعلق پوٹنجر لکھتے ہیکہ یہ پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے۔ جس میں بارہ تیرہ کے قریب خیمہ دار گاؤں ہیں۔ پنجگور کی کھجوریں مکران میں بہترین سمجھی جاتی ہیں۔ یہاں کا حاکم خان آف قلات میر محمود خان کا بھتیجا رحمت اللہ خان ہے۔ لیکن وہ بھی کیچ کے حاکم کی طرح داخلی طور پر خود مختار ہے۔ اس کی سالانہ آمدنی بیس ہزار روپیہ ہے۔

انگریزوں نے 1837ء میں پہلی افغان جنگ لڑی اور بری طرح شکست سے دوچار ہونے کے بعد 1839ء میں انگریزی افواج نے قندھار سے مکمل طور پر پسپائی اختیار کی۔ انہوں نے بلا جواز ریاست قلات پر یلغار کی جبکہ میر محراب خان ان دنوں ریاست قلات کا حکمران تھا۔

انہوں نے ایک غیرت منداور باہمت کمانڈر کی طرح اپنے امراء کے ساتھ انگریزوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انہوں نے اپنی لشکر کے ساتھ اپنی آخری سانس اور آخری قطرہ خون تک برسرپیکار رہے۔ محراب خان وطن کے تحفظ و بقاء کیلئے جان نثاروں کے ساتھ پروانہ وار قربان ہوگئے۔ جب محراب خان کی لاش تلاش کیا گیا تو اسے چار سو کے قریب تڑپتی ہوئی لاشوں کے نیچے سے ڈھونڈھ کر نکالا گیا تو اس پر انتیس کاری زخم تھے۔ اس معرکہ کے متعلق لیفٹیننٹ جنرل لوڈے نے لکھا ہے کہ ”جب ہم قلعہ میں داخل ہوئے تو خان (محراب خان) اپنے امراء کے ساتھ ایک بھپرے ہوئے خونخوار شیر کی طرح ہماری افواج پر ٹوٹ پڑے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجاہدین نے آخری دم تک لڑنے اور کٹ مرنے کا فیصلہ کر

رکھا تھا۔ اس جگہ جنگ نے اس قدر شدت اختیار کی کہ چشم زن میں انگریزی افواج کے 32 افسر اور 107 سپاہی مارے گئے۔ میر محراب خان کی شہادت کے بعد انگریزوں کی امداد کے باوجود ان کے پروردہ اور مقرر کردہ میر شاہنواز خان زیادہ عرصہ حکومت نہ کر سکا۔ کچھ عرصہ بعد بلوچ قبائل میر نصیر خان ثانی کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے بالآخر انگریزوں نے میر نصیر خان ثانی کو حکمران تسلیم کیا۔

پہلی افغان جنگ 1837ء کے دوران برطانیہ نے اس علاقے پر پہلی دفعہ اپنی توجہ مرکوز کی تھی۔ حاجی عبدالغنی کابلی جنہیں مختلف زبانوں پر دسترس حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عیار و چالاک اور جلد ہی تعلقات بنانے کے ماہر شخص کے طور پر جانا جاتا تھا انگریزوں نے انہیں بطور جاسوس اس علاقے کے بارے میں رپورٹ مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ وہ قلات سے سوراب پہنچا اور وہاں سے خاران کے راستے پنجگور پہنچا۔ ان کے مطابق پنجگور ایک نخلستانی علاقہ ہے جس کی زرخیز زمینیں کہنات (کاریزوں) کی مدد سے سرسبز شاداب تھے۔ پنجگور کے امور خان آف قلات میر محراب کی جانب سے مقرر کردہ نائب چلاتا تھا۔ پنجگور سے حاصل ہونے والے مالیہ کا نصف خان قلات کو جبکہ باقی حصہ گچکی حاکموں کو ملتا ہے۔ اس زمانے میں پنجگور کا حاکم میر احمد گچکی تھے۔ جو کہ نصیر خان اوّل کے بھتیجے تھے۔ مکران میں پنجگور کو جنت کا ٹکڑا کہا جاتا تھا۔ یہی خوبصورتی اصل میں اس خطے کی بدبختی کا سبب بن گیا۔ جس کا خمیازہ بسنے والے عوام کو عرصہ دراز سے بھگتنا پڑا۔ جس زمانے میں اس شخص نے پنجگور کا دورہ کیا اس وقت خاران کے نوشیروانیوں اور گچکیوں کے مابین پنجگور کے مضافات میں واقع اراضی کی ملکیت کے حوالے سے رسہ کشی چل رہی تھی۔

پنجگور سے کھجور کے ستر مختلف اقسام مکران و دیگر علاقوں میں بھیجے جاتے تھے۔ حاجی عبدالغنی کے بیان کے مطابق اس زمانے میں اہل ہنود کے پچیس افراد پنجگو میں رہ رہے تھے۔ ان کے علاوہ لوہار، بڑھی، موچی، سونار، ٹوپیاں بنانے والے بھی اس معاشی سرگرمیوں میں برابر کے شریک تھے۔ قلات کے سوداگر موسم خزاں میں پنجگور آتے تھے جب کھجور کی

فصل خریداری کیلئے تیار ہوتی تھی تو وہ اپنے ساتھ شکار پور (سندھ) سے سامان لاتے تھے جنہیں وہ مقامی بازار میں فروخت کرتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ گرمیوں میں گوادر تک کے تاجر پنجگور میں گھی اور اون خریدنے آتے تھے جسے وہ بمبئی کی مارکیٹوں میں لے جا کر فروخت کرتے تھے۔اس کے بدلے میں وہ سندھ اور ہند کے بازاروں سے لائے گئے لونگ کپڑے اور بھیڑوں کو لیپ دینے کیلئے مختلف مرہم بھی مقامی بازار میں فروخت کیلئے لاتے تھے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں پنجگور میں بھیڑوں کی افزائش کافی زور و شور سے جاری تھی۔اس کی وجہ سے ان سے حاصل ہونے والے اون کی بمبئی کے مارکیٹوں میں مانگ تھی اور وہ بھیڑوں کو مختلف کیڑوں سے بچانے کے لئے مرہم منگواتے تھے تا کہ وہ ہر قسم کی جلدی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔حاجی عبدالغنی نے اپنے پرانے تعلقات اور چرب زبانی سے مقامی حاکموں پر اپنے تاجر ہونے کا ڈھونگ کامیابی سے رچایا اور اپنے مقاصد میں کامیاب بھی رہے۔اور اس کے سفرنامے کی تفصیلی رپورٹ نے انگریزوں کو مکران میں مستقبل میں ہونے والی مہموں اور اپنی پالیسیوں کی تکمیل میں کافی مدد دی۔

برٹش حکومت کی طرف سے بلوچستان کے امور کی نگرانی سر رابرٹ سنڈیمن کرتے تھے۔ظاہر ہے کہ اس کو علاقے میں برطانوی حکومت کی مفادات کو تحفظ دینا تھا۔جن میں تجارت اور علاقے میں مالیہ کی وصولی اور سب سے بڑا اہم مقصد برطانیہ کی اس علاقے میں علمداری کو قائم رکھنا تھا۔اس کے علاوہ سنڈیمن کی یہ خواہش تھی کہ ایشاء میں افغانستان اور ایران کی طرح بلوچستان میں بلوچوں کی ایک نیم آزاد خودمختار ریاست سلطنت برطانیہ کے زیر اثر قائم ہو۔لیکن اس میں اسے کامیابی نہ ملی۔چونکہ رابرٹ سنڈیمن دیگر برٹش انگریزوں کی نسبت بلوچستان کے متعلق ایک ہمدردانہ وسوچ وفکر رکھتے تھے۔وہ بلوچوں کے اس فطرت و روایات کو اچھی طرح بھانپ چکے تھے کہ انہیں عزت و احترام سے رام کیا جاسکتا ہے۔وہ ریاست قلات کی جغرافیائی اور خطے میں سیاسی اثرات سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔انہوں نے ریاست کے مستقبل کے بارے میں یہ منصوبہ بنایا کہ مستقبل میں ریاست

قلات کو وسعت دیکر ایران وافغانستان کے بلوچ علاقوں کو ملا کر عظیم تر بلوچستان کی شکل میں ایک نئی مملکت بنائی جاسکتی ہے۔ خان آف قلات اس کا حاکم اعلیٰ ہو مگر خارجہ و دیگر امور میں یہ مملکت سلطنت برطانیہ کے تابع ہو یعنی تاج برطانیہ کے زیر نگیں ہو کر برطانوی مفادات کیلئے کام کرے۔ شاید وہ اس بلوچ مملکت کے ذریعے برطانیہ کی بحر ہند کے گرم پانیوں تک ممکنہ زار شاہی کی توسیع پسندی کو روکنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے عظیم تر بلوچستان کی تجویز گورنر جنرل ہند کو ارسال کی جسے ریزیڈنٹ پنجاب کی ایماء پر مسترد کیا گیا۔ سنڈیمن کو بے حد افسوس ہوا مگر ملال کے ساتھ ساتھ اپنی تجویز کی اہمیت کا اندازہ تھا اس نے اس عزم کے ساتھ انگلستان جانے کیلئے رخت سفر باندھا کہ وہ برطانوی پارلیمنٹ سے اس کی منظوری لے کر رہے گا۔ چنانچہ انگلستان جانے کیلئے جب وہ بیلہ پہنچا تو فلو کا شکار ہوا سخت بخار اس کیلئے جان لیوا ثابت ہوا۔ 29 جنوری 1892ء کو داعی اجل نے اسے موت سے ہم کنار کر دیا۔ انہیں بیلہ ضلع لسبیلہ میں دفن کیا گیا۔ عظیم تر بلوچستان کے متعلق سنڈیمن کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ایسا ہوتا تو یقیناً آج خطے کا سیاسی نقشہ مختلف ہوتا اقوام عالم میں بلوچ ایک مختلف مقام پر فائز ہوتے۔ علاوہ ازیں سر رابرٹ سنڈیمن کا لس بیلہ کا آخری سفر جنوری 1992ء میں ہوا۔ وہ جنوری کے شروع میں کوئٹہ سے روانہ ہوا تھا۔

17 تاریخ کو بذریعہ اسٹیمر سونمیانی پہنچا۔ پھر لس بیلہ چلا گیا۔ لس بیلہ جانے کا مقصد اور باتوں کے علاوہ وہاں لس بیلہ سے کیچ، پنجگور اور ڈسٹرکٹ کوئٹہ تک مجوزہ ریلوے لائن بچھانے کیلئے صلاح ومشورہ کرنا تھا۔ انہوں پہلے ہی سے پنجگور اور کیچ کے سردار اور معتبرین اور متعلقہ برطانوی آفیسروں کو مشورہ کیلئے لس بیلہ بلایا تھا۔ ریلوے کا مقصد کراچی کو لس بیلہ، کیچ اور پنجگور سے ملا کر ایرانی سرحد سے ملانا تھا۔ دوسری لائن سے لس بیلہ کو کوئٹہ سے ملانا تھا۔ جس سے وہ سندھ کے شورش سے نجات حاصل کرنا تھا۔

بد قسمتی سے وہ وہاں ایک مختصر بیماری کی وجہ سے 29 جنوری کو وفات ہو گیا۔ اور وہیں لس بیلہ میں دفن کیا گیا۔

یہ مکران کیلئے ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ کیونکہ انگریزی غلامی کے دوران اگر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچتی تو مکران میں معاشی ترقی اور تعلیم کے مواقع حاصل ہوجاتے۔ مگر یہ منصوبہ ابتدائی مرحلے ہی سے رابرٹ سنڈیمن ناگہانی موت سے دم توڑ گئی۔

1903ء میں ہزایکسی لینس لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے دورہ مکران (پسنی بندر) کے بعد سیاسی اور انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر (مکران لیوی کور) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا صدر مقام پنجگور کو مناسب سمجھا گیا۔ اسی سال مرکزی ایرانی ٹیلی گراف نوکنڈی پنجگور لائن مکمل ہونے پر کراچی تہران بذریعہ ٹیلی گراف راہ رسم قائم ہوئے۔ برطانوی حکومت کی حکمت عملیوں کے نتیجے میں مکران میں ان کی گرفت روز بہ روز مظبوط ہوتی گئی۔ ایک جانب سرداروں کی آپسی رنجشوں اور چپقلشوں نے انگریز قوت کو دوام بخشی اور قبائلی سرداروں کی اثرات وگرفت نہ ہونے کے برابر کردی۔ اور وہ برائے نام حکمرانی کے دعویدار بن کررہ گئے۔ چونکہ انگریز پالیسی کے حکم عدولی کے سواء ان کا علاقے میں عملداری اور قوت ختم ہونے کا برابر رہا۔ خان آف قلات 1925ء میں اپنی بصارت کھو جانے کے سبب وزیراعظم سر شمس شاہ ریاست قلات کے سیاہ سفید کا مالک بن بیٹھا۔ انہوں نے خان قلات کے نام پر ریاست کے مظلوم اور کمزور سرداروں پر اپنی من مانی شروع کردی۔

میر محمود خان جوانی میں ایک رنگین مزاج حاکم تھا۔ دوسروں پر فقرے کسنا اور مزاق اڑانا انکی عادت تھی۔ ہمیشہ خوش رہتے اور خوشی حاصل کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ اس عادتوں کی وجہ سے سرداراور معتبرین نے ان سے ملنا جلنا ترک کردیا تھا۔ 3 نومبر 1931ء کو وفات کر گئے۔ اس طرح میر اعظم جان کیلئے حکومت کی راہ ہموار ہوئی۔ مکران کے عوام بیگار، سُنگ اور زرعی پیداوار اور ناجائز ٹیکسوں تلے دبے ہوئے تھے۔ انہوں نے انہیں ختم کرنے کا اعلان تو کیا لیکن عملی طور پر ایسا نہ کرسکے۔ انکی وجہ یہ تھی کہ وہ مکران کے سرداران کے خاتمے کے حق میں نہ تھے۔ میر اعظم جان ایک سال چھ ماہ تک حکومت کرنے کے بعد 10 ستمبر 1933ء کو مختصر علالت کے بعد وفات پاگئے۔ میر احمد یار

خان ریاست قلات، خاران، جام لسبیلہ اور مری سرداروں کی باہم مشاورت سے بتیس سال کے عمر میں خان آف قلات کے عہدے پر براجمان ہوئے۔

1938ء میں جب برطانوی کمشنر میجر گولڈ اسمتھ نے ٹیلی گراف لائن مکمل کرائی اور پنجگور، مند، گوادر اور لسبیلہ کو ٹیلی فون کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک کر دیا تو اس نے پنجگور ہی کو پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر کیلئے موزوں صدر مقام تجویز کیا۔ اس کے علاوہ ایم ای ایس، لوکسٹ اور دیگر تمام محکموں کے دفاتر بھی یہیں قائم کر دیئے گئے۔

بلوچستان کا پاکستان کے ساتھ الحاق تک بلوچستان کے دیگر ریاستوں کی طرح مکران میں برطانوی عمل داری و گرفت مضبوط و برقرار رہی۔

جنگ گوک پروش:۔

میر بلوچ خان کو کہدائیوں اور بزنجوؤں نے کولواہ سے نکالا تو اس نے خاران کے آزاد خان نوشیروانی کے پاس پناہ لی اور 1871ء میں سوراب پر حملہ کر دیا۔ جس کے سزاء کے طور پر خان قلات نے چتکان پنجگور کی جائیدادیں ضبط کی جو اسے سر رابرٹ سنڈیمن کے دورہ پنجگور کے دوران ایک مرتبہ پھر لوٹا گیا تھا۔ 1889ء میں سامی کے حاکم خان بہادر محمد حسن نے جب پنجگور پر دوبارہ حملہ کیا تو بلوچ خان اس کے ہمراہ تھے۔ اس کے بعد بلوچ خان فرار ہو کر ایران کے سرحدی علاقے میں چلے گئے۔ 1898ء میں وہ گوک پروش کے مقام پر داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ وہ ایک بہادر نڈر اور جنگجو شخص تھے۔ جنگ گوک پروش کے لڑائی میں جام شہادت اسے بلوچ تاریخ میں ایک بلند پائیہ مقام دیتی ہے۔

1898ء میں یہاں کے غیور عوام نے میر محراب خان گچکی اور میر بلوچ خان نوشیروانی کی سرکردگی میں ناگ، شہرک، بلو، سورگ غرض ہر قلعے میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن ان کی تلواریں انگریزی توپوں کے سامنے ہیچ ثابت ہوئیں۔ میر بلوچ خان نوشیروانی ڈھائی سو حریت پسندوں کے ساتھ گوک پروش جنگ میں شہید ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد

پھر بھی یہاں کے عوام نے کئی سالوں تک فرنگیوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ ان دوران میں میر بائیان گچکی کو سردار بنایا گیا۔ لیکن علاقائی انتظام بدستور خان قلات کے پاس رہا۔

پنجگور میں سرداری کا مسئلہ:۔

جب مکران پر خانِ آف قلات کی گرفت کمزور ہوئی تو میر محمد حسن گچکی جو کہ سامی کے حاکم تھے۔ انہوں نے پنجگور کی حق ملکیت کے اپنے دیرینہ دعوے کو دہرایا۔ اپنے مطالبہ کو زیادہ اہمیت دینے کیلئے اس نے محراب خان نوشیروانی سکنہ بلیدہ کو اپنے ساتھ ملا کر پنجگور پر حملے شروع کئے ۔ پنجگور کے باشندے قلات کے عائد کردہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور اس نئی مصیبت نے ان کی زندگی کو مزید ابتر کر دیا۔

جب مکران کے حالات تیزی کے ساتھ بگڑنے لگے تو انگریزوں نے میر محمود خان کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مکران کا دورہ کر کے حالات کو سرد کرنے میں کردار ادا کریں۔

انگریزوں نے خان قلات کے ساتھ مل کر چند اقدامات لئے گئے جن میں اہم یوں تھے۔

۱۔ میر بلوچ خان نوشیروانی کو پنجگور کے قریب ناگ قلعہ سے باہر نکال کر اس پر قبضہ کر لیا۔

۲۔ مکران کے معاملات کو سہل طریقے سے چلانے کی خاطر دیوان اڈھوداس کو ناظم مقرر کیا۔

۳۔ مکران لیوی کور'' کا قیام عمل لایا گیا۔

حکمرانی کے آخری ادوار:۔

مکران میں حکمرانوں کی گرفت روز بروز کمزور پڑتا گیا۔[1] اس کی وجہ انگریزی تسلط و خوانین قلات کی گرفت تھی ۔ دراصل ان کا انحصار اس دور میں شروع ہوا جب مکران میں سردار بائیان گچکی مالی مشکلات سے دوچار تھا اور ابتدء ہی خوانین کی خواہش تھی کہ پورے مکران پر اس کا قبضہ اور گرفت ہو۔ لیکن اس وقت انہیں کوئی خاص کامیابی نہ ملی۔ پنجگور کے حکمرانوں میں سے میر مراد گچکی کی طرز حکمرانی کے مطلق یہ مشہور ہے۔ کہ وہ ایک سخت گیر

حکمران گزرے ہیں۔ وہ طاقت وقوت اور خوف و دہشت سے اپنی حکومت کو علاقے میں دوام بخشتے رہے۔ حتی کے اس کے سامنے انسانی زندگی کوئی قدر منزلت وعظمت نہ تھی وہ اپنے رعایا پر گولیا برسانے سے نہیں کتراتے تھے اور انہیں بلا وجہ قتل کرتے۔ ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ایک محنت کش کھجور کے درخت پر تھے تو وہ اپنے نائبیں اور مشیروں کے ساتھ شکار کی تیاری میں تھے کہ انہوں نے اپنا نشانہ ٹھیک کرنے کی خاطر اس پر بندوق تان کر گولی چلائی جس سے وہ ہلاک ہوئے۔ پنجگور کے عوام میر مراد کی خوف و دہشت کے تلے دب چکا تھا۔ وہ فریاد اور احتجاج بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح ایک دفعہ وہ ایک گاؤں سے گزر رہا تھا تو قریبی گھر سے ایک کتے نے بھونکنا شروع کیا تو صبح اس نے گاؤں کے تمام افراد کو قید اور سخت سزائیں دی۔ میر مراد گچکی کی حکومت کے بعد پنجگور کمزور حکمرانوں کے زیر اثر رہنے کے بعد قابل ذکر ایک شریف النفس انسان گچکی خانوادے میر موسیٰ خان کی زیر نگرانی میں آیا۔ انہوں نے پرامن طریقے سے حکومت کی جس سے علاقے کے عوام نے سکون کے ساتھ زندگی گزاری۔ لیکن اس کے وفات کے بعد اس کے کمسن بیٹے سربلند خان گچکی جو لاہور میں پڑھ رہے تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر پنجگور کا حاکم مقرر ہوا۔ سردار سربلند خان گچکی کو حکمرانی کم عمری میں ملی۔ لیکن وہ ایک دور اندیش اور ملنسار حاکم ثابت ہوئے۔ مکران کا علاقہ تین مقامی خانوادوں کے درمیان منقسم تھا۔ جو کہ تمپ، کیچ اور پنجگور کے علاقوں میں نیم خود مختار حیثیت سے حکومت کر رہے تھے۔ جب نواب بائیان گچکی نے حکومت پاکستان کے ساتھ الحاق کے سلسلے میں رجوع کیا۔ جنہیں مارچ 1948ء میں والی مکران کی حیثیت بھی دی گئی تھی چونکہ اس کے بغیر یہ کوئی چارہ نہ تھا تاکہ وہ والی مکران بن کر الحاق کے مسودے پر دستخط کریں حالانکہ وہ صرف والی کیچ تھا۔ لیکن پاکستان کے ساتھ الحاق کیلئے یہ عمل کیا گیا۔ اگر چہ تمپ اور پنجگور کے گچکی سرداران کی حیثیت ودُرتبہ نواب بائیان سے کسی طرح کم نہ تھی۔ لیکن انہیں نظر انداز کر کے کیچ کے مقامی حاکم کو ان پر ترجیح دی گئی۔ مکران میں نواب بائیان گچکی کے مخالف سردار سربلند خان گچکی نے

28 مارچ 1948ء میں خان آف قلات میر احمد یار خان کے نام اپنے خط میں لکھا، مودبانہ عرض کیا جاتا ہے کہ عرصہ دراز سے میرے آباؤ اجداد اور بشمول ہمارے قبیلے کے حکومت قلات کے وفادار چلے آرہے ہیں، اب جب کہ حالات تبدیل ہو رہے ہیں میں، میرے رشتہ دار اور تمام قبیلہ حکومت قلات کو یہ باور کراتے ہیں کہ حکومت قلات اور بلوچ قوم (قلات کے مستقبل کے بارے میں) جو فیصلہ کرے گی اسے قبول کرلوں گا۔ میں نواب بائیان گچکی کے ساتھ الحاق کے فیصلے کی شدید مذمت کرتا ہوں۔ خاص کر اس لیئے کہ نواب بائیان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ تمام مکران کے سردار ہونے کا دعویٰ کرے ماسوائے کیچ کے، نواب بائیان کو مکران کے باقی علاقوں پر کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ پورے مکران کے بارے فیصلہ کرے۔ اس لئے نواب بائیان کے ذاتی پسند کی بنیاد پر میں اور میرا قبیلہ کبھی بھی نہیں چاہیں گے کہ وہ پاکستان کی غلامی کریں۔ اور اس لئے ہم ہر قربانی سے گریز نہیں کریں گے۔ اس خط کے متن کے نتیجے میں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک دلیر و باہمت دانش مند حاکم تھا انہوں نے دیدہ دلیری اور بغیر کسی خوف و لالچ کے اپنے علاقے کی بلا خوف خطر نمائندگی کی۔ اور ان کے آراء ہی سے والی کیچ کے انکے اختلافات ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ ان کی من مانی و بالادستی کو کسی بھی طرح قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ چونکہ سردار بائیان ایک عیار، چالاک موقع پرست شخص تھا۔ انہوں نے بہت چالاکی اور اپنی خفیہ عزائم سے 17 مارچ 1948ء کو حکومت پاکستان کے ساتھ مل کر بلوچستان کے ریاستوں خاران، لس بیلہ اور مکران کو پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ اس وقت شہزادہ عبدالکریم جو کہ خان قلات کے چھوٹے بھائی تھے مکران کے نائب اور حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے موجود تھے۔ وہ علاقے سے مالیہ اور انتظامی امور کی نگرانی کرتے تھے۔ یکسر الحاق کے فیصلے سے بغاوت کی۔ انہوں نے سردار بائیان گچکی کے مشورے پر دستخط کرنے کے قانونی حیثیت کو مسترد کر دیا۔ مکران کے عوام شہزادہ عبدالکریم اور سردار سر بلند خان گچکی کی قیادت میں الحاق کے خلاف سرگرم رہے۔ وہ کسی صورت میں الحاق کے حق میں نہ تھے۔ اس سلسلے میں عوام میں بھی کافی

اشتعال پیدا ہوا۔ایک مراسلہ بتاریخ 24 مارچ 1948ء میں کرنل ایس بی شاہ اکرام اللہ کے نام جس میں مکران کی صورت حال کا ذکر ہے لکھتے ہیں کہ "فرنیٹر کور کوئٹہ کو مکران لیوی کور پنجگور کی جانب سے ایک ٹیلی گرام موصول ہوا جس کے تحت تربت میں مکران کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی خبر سے اشتعال پایا جاتا ہے۔اور نوابزادہ حمید اللہ اور حاکم اعلیٰ (شہزادہ عبدالکریم) کے درمیان اس معاملے پر تنازعہ پیدا ہورہی ہے۔سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس سے کہا ہے کہ وہ پوسٹ آفس اور اس کے عملے کی حفاظت کرے۔بارہ مارچ کے بعد (مکران سے) پاکستان کو ڈاک کی ترسیل بند ہو چکی ہے۔وہ مزید لکھتے ہیں۔"میں نے وزیراعظم قلات کو ٹیلی گرام بھیجا کہ وہ مکران کے حاکم اعلیٰ شہزادہ عبدالکریم کو فی الفور برطرف کردیں۔

شہزادہ عبدالکریم کے خلاف اہلکاروں نے سازشوں کا جال بُننا شروع کیا یہ خبر پھیلائی کہ شہزادہ عبدالکریم اور نوابزادہ حمید اللہ گچکی کا اس مسئلے پر کافی اختلاف اور تضادات ہیں مگر بعد میں پتہ چلا کہ نوابزادہ حمید اللہ گچکی جو بائیان گچکی کے فرزند ہیں الحاق کے حوالے سے شہزادہ عبدالکریم کے ساتھ مکمل اتفاق رکھتے ہیں۔انہیں بائیان گچکی کی جگہ کیچ کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔اس ضمن میں کرنل ایس بی شاہ سے شہزادہ عبدالکریم کے ساتھ مکمل اتفاق رکھتے ہیں۔انہیں بائیان گچکی کی جگہ کیچ کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔اس ضمن میں کرنل ایس بی شاہ 27 مارچ 1948ء کے ایک خفیہ مراسلے بنام اکرام اللہ لکھا کہ حاکم اعلیٰ شہزادہ عبدالکریم نے نواب بائیان گچکی کے بیٹے نوابزادہ حمید اللہ گچکی کو مکران کا نواب مقرر کیا ہے۔اس ضمن میں حمید اللہ کے ذاتی ملازم سید احمد شاہ ایک خط لیکر قلات گئے۔حاکم اعلیٰ مکران نے سردار سربلند گچکی سردار پنجگور اور کھوسہ محمد خان کو حکم دیا کہ وہ کیچ پہنچ جائیں اور کھوسہ محمد خان اپنے گھریلو مصروفیات کی وجہ سے نہ آسکے۔لیکن سردار سربلند خان گچکی نے پنجگور سے لاری کے ذریعے تربت کی طرف نکل پڑے ہیں اس خط میں آگے چل کر تحریر کرتے ہیں کہ" مکران کی صورت حال سے نمٹنے کیلئے ضروری ہے کہ ژوب ملیشیاء کو لورلائی سے مکران بھیج دیا جائے۔مکران کی صورت حال دن بہ دن ابتر ہوتا جارہا ہے۔اس ضمن میں کوئی بھی خبر ہمارے لئے عزیمت کا باعث بن سکتی ہے۔آخر کار سخت دباؤ اور سازشوں کے نتیجے میں 28-27 مارچ

کے درمیان شب کو خان آف قلات نے الحاق کے مسودے پر دستخط کر دیئے۔لیکن پھر بھی علاقے پر خان آف قلات کی عملداری برقرار رہی۔پنجگور میں سردار سر بلند گچکی جو علاقے کا ایک شریف النفس، ملنسار انسان دوست و عوام دوست محسن سردار تھے میر محمود خان جو کہ قلات کے وزیر انصاف تھے اور علاقے میں کافی اثر سوخ کے مالک تھے۔میر عنایت اللہ گچکی اور محمود خان گچکی دونوں بھائی قلات کے نمائندے ہونے کی بناء پر علاقے کی امور کی نگرانی کرتے رہے اور ساتھ ہی علاقائی مسائل لڑائیوں اور زمین و جائیداد و دیگر تنازعات کے فیصلوں کی بدولت کافی شہرت رکھتے تھے اور پنجگور کے سردار سر بلند گچکی ان کے داماد تھے اور اسی بناء پر ان کا رتبہ اور سماجی حیثیت اور علاقے پر ان کی گرفت و سماجی رتبہ و مقام رہا۔ سردار پنجگور سردار سر بلند خان گچکی کی دوسری شادی پر ان سے کافی تلخیاں پیدا ہوئیں وہ پنجگور کے علاقے سوردو سے منتقل ہو کر وشبود میں رہائش پذیر ہوئے اور سرداری کا تنازعہ پس پردہ سر اٹھانے لگا۔اسکے باوجود اس علاقے میں طاقت وقوت کے تین ستون میر عنایت اللہ خان گچکی، میر محمود خان گچکی، سر بلند خان گچکی کے گرد گھومتی رہی۔

سیاسی تحریک کا آغاز:۔

مکران کے محنت کش عوام خان آف قلات اور مقامی گچکی سردار خیلوں کی جانب سے لگائے گئے دھرے ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے جسے ''زرسر'' اور ''زرشاہ'' کہا جاتا تھا جس کے رو سے ہر مرد، عورت بچہ اور بوڑھا سب سے دو آنے فی کس زرشاہ کے نام سے وصول کیا جاتا تھا۔اس مد میں ملنے والی رقم خان آف قلات کی جانب سے مقرر کردہ ناظم اور گچکی سردار خیل آپس میں برابر تقسیم کرتے تھے۔

دوسری جانب انگریز سامراج کی بلوچستان پر قبضے مظلوم عوام کے حقوق پر کاری ضرب نے بلوچستان میں نیشنلزم کی ایک بڑی تحریک کو خود بخود جنم دی۔میر یوسف عزیز مگسی، عزیز کرد، میر غوث بخش، محمد حسین عنقا کی سرکردگی میں نیشنل پارٹی تشکیل دی گئی اور ابتداء میں اسے نوابوں اور سرداروں کی حمایت رہی۔پارٹی کی مقبول اور عوامی فیصلوں سے نوابوں اور سرداروں کو اپنے مفادات خطرے میں نظر آنے لگے۔چونکہ یہ جماعت ریاست

قلات کی ایک مقبول اور نمائندہ جماعت تھی ان کے رہنماؤں نے خان آف قلات کے دورہ مکران کے موقع پر عائد کردہ ٹیکسوں کو ناجائز قرار دے کر منسوخی کا مطالبہ کر دیا۔

میر گل خان نصیر لکھتے ہیں کہ حاجی عبدالسلام بلوچ جو کہ قلات نیشنل پارٹی مکران برانچ کے رہنما اور نمائندے تھے۔ ان کی پارٹی کے تین نوجوان ممبران نے تین روز تک بھوک ہڑتال کی۔ خان آف قلات نے کچکی سرداروں کی باہمی رضامندی سے زرسر، زرشاہ کے نام سے قائم ٹیکسوں کی منسوخی کا اعلان جاری کر دیا۔

بیگار کی مکمل بندش کا اعلان ہوا۔ بیگار ایک ایسا مکروہ فعل تھا جس میں ریاست کے کارندے مکران اور دیگر علاقوں کے عوام سے مفت جبری محنت لیا کرتے تھے۔ مکران اس حوالے سے کافی بدنام تھا۔

میر گل خان نصیر کے مطابق وہ منظر انتہائی دردناک ہوتا تھا۔ جب کوئی بھوک اور پیاس سے بدحال بلوچ جس کے سر اور بدن پر کپڑوں کے چیتھڑے رہ گئے ہوں تپتے ہوئے دھوپ میں ننگے پاؤں اس سوار کے پیچھے بھاگ رہا ہو جس پر ریاست کا کارندہ سوار اور بلوچ کے اونٹ کو بیگار میں پکڑ کر دوڑاتا ہوا جا رہا ہو اور بیچارہ بلوچ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے تاکہ وہ منزل پر پہنچ کر اس کارندے کیلئے پانی وایندھن وغیرہ کے ساتھ ساتھ اپنے اونٹ کیلئے چارے کا بھی انتظام کرے۔ اس غیر انسانی فعل میں خوانین قلات اور اس کے ہمنوا مقامی سردار خیل دونوں برابر کے گنہگار تھے۔ بلوچ قوم پرست قوتیں جو کہ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے پلیٹ فارم سے ان جیسے غیر انسانی اقدامات کے خلاف بھرپور تحریک شروع کی۔ اور اس میں خاصی کامیابی بھی ملی۔

بنیادی طور پر سوچ وفکر کے حوالے سے بلوچ قوم پرست قیادت انڈین نیشنل کانگریس کے قوم پرستانہ افکار سے متاثر تھے۔ وہ کسی بھی صورت میں اس بات کیلئے تیار نہ تھے کہ برطانوی ہندان کے مزید علاقوں کو اپنی تحویل میں لیں۔ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی بلوچ قوم کے فکری وشعوری آگاہی کیلئے ایک انقلاب سے کسی طرح کم نہ تھی۔

جب انگریزوں نے خان قلات پر اس ضمن میں زیادہ دباؤ ڈالنا چاہا تو نیشنل پارٹی

نے ریاست قلات کے طول وعرض میں احتجاجی مظاہروں کا اعلان کر دیا انہوں نے اپنے قراردادوں کے ذریعے خان قلات پر زور دیا کہ وہ کسی بھی معاہدے پر دستخط نہ کریں۔

جبکہ اس کے برعکس خان قلات کے خیالات اس حوالے سے کچھ اور تھے وہ مصالحتانہ پالیسی کے ذریعے بلوچستان کے علاقے انگریز کی دسترس سے محفوظ کرنے کی پالیسی پر گامزن رہے۔

بالآخر انگریز طاقت وقوت کے استعمال کے بغیر مکاری وعیاری سے بلوچستان پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

حوالہ جات

مکران عہد قدیم سے جدید عہد تک : حمید بلوچ

برصغیر اور عرب مورخین : خورشید احمد فاروق (کراچی)

کوچ و بلوچ : میر گل خان نصیر

بلوچ تاریخ وعرب تہذیب : ڈاکٹر اسماعیل دشتی البوشہری

بلوچستان اضلاع اور تاریخ : ایم عثمان

Gazetteer of Balochistan

Imperial Gazetteer of Balochistan

باب سوئم

بلوچ مکران میں

شاہنامہ فردوسی کے مصنف ابوالقاسم فردوسی (940-1021) کے مطابق فارس کے بادشاہ نوشیروان کے زمانے میں بلوچ کوہ البرز کے گردنواح میں سکونت پذیر تھے۔ یہ سرکش وجنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ لوٹ اور رہزنی میں کافی مشہور تھے۔ بادشاہ کو اُن کے خلاف ملٹری آپریشن یا لشکرکشی کرنا پڑا تو ہزاروں کی تعداد میں بلوچ تہہ وتیغ ہوگئے۔ جو بچ گئے بھاگ کر مشرق میں کرمان کے آس پاس ویرانوں میں جا بسے۔

بلوچ مورخ قاضی عبدالصمد سربازی کے مطابق شاہ پسند شاعر بلوچ کی جنگ آزادی کو یوں لوٹ مار سے اور نوشیروان کی سماجی یلغار کی انتقامی کاروائیوں سے منسوب کرتا ہے۔

همی رفت و آگاہی آمد بشاہ
کہ گشت از بلوچی جہانے تباہ
زبس کشتن و نمارت و تاختن
زمین رابہ آب اندر انداختن

بلوچوں کی بغاوت دبانے کا انجام اور نتیجہ فردوسی کے بیان کے مطابق یہ ہوگیا کہ ''بلوچی نماند آشکار ونہاں'' یعنی نوشیروان کی افواج قاہرہ نے بلوچوں کو صفحہ ہستی سے ختم کر دیا۔ یہاں تک کہ ان میں کوئی فرد باقی نہیں رہا۔ مگر یہ شاعرانہ تخیلات اور مبالغہ آمیزیاں ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بہت سے باقی بلوچ قتل کئے گئے ہوں اور بہت سے جلاوطن ہوکر سندھ، پنجاب اور حلب وغیرہ کے علاقوں میں چلے گئے ہوں اور اس طرح وقتی طور پر حلب میں ان کی طاقت کمزور ہوکر بغاوت دب گئی۔ مگر دنیا میں بلوچوں کا موجود ہونا فردوسی کے اس دعوے کی نفی کرتا ہے ''بلوچی نماند آشکار ونہاں'' بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب نوشیروان کے زمانے میں بلوچستان میں بلوچ اس قدر طاقتور تھے کہ انہوں نے کسریٰ

نوشیروان کی عظیم الشان سلطنت کی اطاعت قبول نہ کی۔ بلکہ نوشیروان کے زمانے سے پہلے انہوں نے اردشیر بالکان کے عہد میں بھی ایرانی عظیم سلطنت سے ٹکر لی تھی اور بادشاہ بلوچوں کے بغاوت دبانے سے بےبس ہوکر چشم پوشی اور رواداری سے کام لیتا رہا۔

چنانچہ فردوسی اس دہقان کی ترجمانی اس طرح سے کرتا ہے جو اردشیر بالکانی کے زمانہ کے حالات نوشیروان کو سناتا ہے۔

بکار و بلوچ اردشیر
بکوشید با کرواناں پیر
نہ بد سودمندی بافسوں رنگ
نہ از بند رنج و نہ پیکار جنگ
اگر چند بد ایں سخن ناگزیر
بپوشید بر خویشتن اردشیر

اسی طرح دیگر بعض مورخین بھی اس رائے کو سختی سے تردید کرتے ہیکہ بلوچوں کی لوٹ مار اور راہزنی کی وجہ سے نوشیروان نے ان کے خلاف لشکر کشی کی۔ وہ اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ قباد کے بعد اس کا بیٹا نوشیروان بادشاہ ہوا تو نوشیروان کے ایک بھائی نے اس کے خلاف سازش کی اس نے اپنے تمام بھائیوں اور اولاد کے ساتھ قتل کیا تاکہ آئندہ ہر کوئی عبرت حاصل کر لے۔

نوشیروان نے تخت نشین ہوتے ہی اعلان کیا جس نے بھی بے دین مزدک کو گرفتار کیا اس کو انعام دیا جائیگا اس اعلان کے بعد مزدک کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کے پیروکاروں کا ہر جگہ قتل عام کا حکم ہوا۔ چونکہ کرد بلوچ مزدک کے پیروکار تھے۔ ان میں سے دولاکھ افراد کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دبستان و پارس سے تقریباً ایک لاکھ مزدکی قتل کر دیئے گئے۔ بلوچوں نے توران و مکران کے پہاڑوں میں پناہ لی۔ مزدک کے کافی پیروکار جن کی اکثریت بلوچ تھے نقل مکانی کر کے سندان چلے گئے۔ سندان کے حکمران

راسل دیوانچ نے کھلے دل سے مزدک کے پیرکاروں کو پناہ دی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوشیروان اور دوسرے ساسانی بادشاہوں کے ساتھ بلوچوں کی دشمنی کا اصل وجہ مذہبی اختلاف تھا۔ساسانی بادشاہ زرتشتی مذہب کے پیروکار تھے۔جبکہ بلوچ مانی مذہب اور پھر مزدک کے پیروکار بنے۔اس مذہبی اختلاف کی وجہ سے توران اور مکران کی حکمرانی ان سے چھین لی گئی اور ان پر غیر بلوچ اور غیر مذہب (ستراب) گورنر مسلط کئے گئے۔نوشیروان بادشاہ کٹر زرتشتی اور اقتدار بھوکا تھا۔اپنے اقتدار کے لئے اس نے اپنے تمام بھائیوں بمعہ اولاد کو قتل کروایا۔یہ کہنا درست ہوگا کہ نوشیروان بلوچوں کو اپنے اقتدار و زرتشتی مذہب کے لئے خطرہ سمجھتا تھا۔نوشیروان کے وقت حضرت محمدؐ کی ولادت باسعادت ہوئی۔دسویں صدی عیسوی میں بلوچ تاریخ میں ایک نیا دور آتا ہے۔کہ سلطان محمود غزنوی کے دور میں بلوچوں نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ دوبارہ اکھٹے ہوگئے۔

بقول فردوسی انہوں نے طاقت کے اظہار کے لئے پھر لوٹ مار اور قتل و غارتگری شروع کی۔چونکہ وہ غزنی و بغداد کے تجارتی راستے پر سکونت پذیر تھے۔اس لئے تجارتی قافلے ان کے ہدف تھے۔سلطان محمود غزنوی کیلئے شاید براہ راست ملٹری آپریشن کرنا دشوار لگتا تھا۔اس لئے دھوکہ بازی کا سہارا لیتے ہوئے زہر آلود سیب اونٹوں پر لاد کر ایک قافلہ روانہ کیا۔حسب دستور بلوچوں نے قافلے کو لوٹ لیا اور سیبوں پر ٹوٹ پڑے۔چونکہ سیب زہر آلود تھے۔ہزاروں بلوچ ان کو کھا کر موت کے منہ میں چلے گئے۔چنانچہ اس سے تجارتی راستے محفوظ ہوگئے۔

بلوچوں کی نقل مکانی مشرق کی طرف کس زمانے سے ہوئی اس کی کوئی مستند و جامع تاریخ تو نہیں ملتی مگر قوی اندازہ یہی ہے کہ یہ وقتاً فوقتاً جاری رہی ہوگی۔محمود غزنوی کے دور میں آمنے سامنے جنگ کے بجائے مکر وفریب سے زہر آلود سیب کھلانے سے ہزاروں بلوچوں کی موت کے واقعہ کے بعد اگلی پھر دو تین صدیوں میں اکھٹے ہوگئے۔اور ایک بار پھر بڑا گروہ بن گئے۔اب وہ مکران کے قریب وجوار میں تھے۔یہاں سے ایک بڑا اور عظیم

الشان ریلا اچھی چراگاہوں اور کھیت کھلیانوں کی تلاش میں آگے بڑھا اور وہ قلات، سنی شوران ڈھاڈر اور سبی سے گنداواں تک پھیل گئے۔ جب بارہویں صدی عیسوی میں بلوچوں کے چوالیس طائفے سلجوقیوں کے دباؤ کے نتیجے میں سیستان و کرمان سے ہجرت کرنے میں مجبور ہو گئے تو یہ طائفے میر جلال خان کی سرکردگی میں مکران میں آ کر آباد ہو گئے۔ مکران میں ہارون کو شکست دینے کے بعد وہ اس خطے پر حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

بلوچوں کی رزمیہ شاعری میں میر جلال خان بلوچ قوم کے سربراہ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کے اولاد کی تعداد پانچ تھی۔ جس میں سے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کے اولاد کے ناموں کی نسبت سے ان سے منسلک قبائل کے نام بھی وہی ٹھہرے رند، لاشاری، کورائی، ہوت اور جتوئی بی۔

میر جلال خان کی آمد ذکر رزمیہ شاعری (قدیم شاعری) میں بھی یوں بیان کیا جاتا ہے۔ جس سے بعض مصنف اختلافات بھی رکھتے ہیں۔

☆ شکر الحمدءَ گزاراں بادشہ ملک ءِ وت ایں

شکر بجالاتا ہوں، اس خدا کا جو اس دنیا کا مالک ہے اس جہاں ثبات

☆ یہ وت ءَ کوشتی من ملک ءَ کل جہاں خاک وگل این

دوام اس کو حاصل ہے باقی سب خاک میں مل جائیں گے

☆ مامریدوں یا علیؓ ءِ دین ءَ ایماں پثبت ایں

ہم حضرت علیؓ کے مرید ہیں ہمارا دین اور ایمان صحیح وسالم ہے

☆ امتوں پاکیں نبیؐ ءِ کہ جہان ءِ والجہ ایں

ہم اس پاک نبی کی امت ہیں جو کل جہاں کا آقا ہے

☆ حمزہؓ ءِ اولاد بلوچ ایں سوب درگاہ ءَ گوریں

بلوچ امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں جنہیں فتح ونصرت درگاہ سے ہوتی ہے۔

☆ اچ حلب ءَ پادکایوں گوں یزید ءَ جیڑہ ایں

یزید سے مخالفت کے باعث ہم نے حلب (شام) سے کوچ کیا

☆ کربلا بمپور نیام ءَ شہر سیستان مزل ایں

کربلا بمپور کے درمیانی علاقہ سیستان کو اپنی منزل ٹھرایا

☆ بادشاہ ءِ شمس دین ایں گوں بلوچاں حاطرایں

یہاں کا بادشاہ شمس دین جس کا سلوک بلوچ کے ساتھ اچھا تھا۔

☆ نی کہ بدرالدین درختہ، ناغمانی شدت ایں

(لیکن بعد) جب بدرالدین بادشاہ بنا تو اس نے یکا یک سختی شروع کردی

☆ مستریں میریں جلال خان، چل ءُ چاریں بولک

(اس وقت) چوالیس بلوچ قبائل کا سرغنہ میر جلال خان تھا

☆ کاحتوں ہاریں بندءَ، کیچ ءِ راستیں پلوایں

وہاں سے نکل کر ہاریں چلے آئے جو کیچ کے دائیں جانب ہے۔

☆ سیم و جوآں بہر کناں کل ءِ سردار شہک ایں

(اس دوران) جو اراضیات و نہریں ہمارے قبضہ میں آئیں ہم نے

آپس میں بانٹ لیا۔ تب ہمارا سردار میر شہک تھا۔

☆ مکران ءَ ہوت نندی کھوسغ ماں کیچ ءَ دہ ایں

مکران میں ہوت قیام پزیر ہو کھوسہ کیچ میں

☆ ڈیہہ حب ءِ چانڈیہ ئیغ ایں، کلمتی لوغ پہ گوڈا ایں

حب چانڈیہ اور گردنواہ کلمتی کو

☆ من ٹلی ءَ نوح نندی، جسکانی پہ گورءَ ایں

اور آس پاس کا علاقہ جسکانی کو ملا۔

جب میر جلال خان کا انتقال ہوا تو ان کی چھوٹی اہلیہ عجوبہ بی بی نے اپنے کمسن بچے میر ہوت کو ملک کا جائز وارث قرار دیا اور شہر کے تمام دروازے بند کرا دیئے۔ یہ واقعہ اس

وقت کا ہے جب میر جلال خان کی میت کو قبرستان میں دفن کرنے کیلئے لے جایا گیا تھا۔
یاد رہے کہ ان کی قبر کا تعین آج تک نہیں ہو سکا) میر جلال خان نے اپنی ہی زندگی میں اپنے بڑے بیٹے میر رند کو ہی مسند کا صحیح وارث مقرر کیا تھا۔ جب میر رند اور دوسرے لوگوں کی قبرستان سے واپسی ہوئی تو انہوں نے شہر پناہ کے دروازے بند پائے۔ سوتیلی ماں اور چھوٹے بھائی سے جنگ کرنا مناسب بھی نہ تھا۔ باہر ہی چھپر ڈال کر فاتحہ و دیگر رسومات ادا کی پھر دیگر بلوچ بمپور سے قندھار تک پھیل گئے۔

جب میر لاشار نے ایرانی بلوچستان کا رخ کیا تو دو پشتو تک ان کی اولاد ان کے علاقوں پر حکومت کرتے رہے۔ مگر جب ان علاقوں میں خشک سالی شروع ہوئی تو پھر انہوں نے جنوب کا رخ اختیار کیا۔ قلات کو فتح کرتے ہوئے نیچے تک چلے گئے۔ یہ فتوحات میر شہک کی سرکردگی میں ہوئیں۔ جو اس وقت تمام بلوچوں کے سردار تھے اور چاکر کے والد بزرگوار بھی تھے۔ میر شہک نے سبی میں جام کو شکست بھی دی تھی اور وہاں اپنی حکومت بھی قائم کی تھی۔ جب سبی میں انتقال ہوا تو اللہ دین افغان نے اپنی زندگی میں کچھی کے علاقے میں ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ قسمت کی بات ہے کہ یہ مقبرہ شہک کو نصیب ہوا اسی بناء پر یہ مثل مشہور ہے۔

''گنبد الادین رفت و گنبد شہک شد''

جب باقی قبیلے میر رند کے ساتھ چلے گئے تو مکران کی حکمرانی میر رند اور ان کے اولاد کے تصرف میں آ گیا۔

میر ہوت کے بعد عبدو نے جگہ لی اور پھر میر عالی مسند نشین ہوئے۔ میر ہوت کی مکران پر حکومت سولہوی صدی کے وسط رہی۔ اس ضمن میں ممتاز دانشور ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ کا خیال ہے کہ عین ممکن ہے کہ جب مکران میں بلوچوں کی پہلی حکومت قائم ہوئی تو مکران کے ملکوں نے ان کی حق حاکمیت کو تسلیم کر لیا۔ اور جب رند و لاشار میر شہک کی سرکردگی میں اندرون بلوچستان کی طرف ہجرت کر گئے تو انہوں نے میر ہوت کو مکران کی والی مقرر کیا۔ لیکن اس کے وفات کے بعد مکران دوبارہ مشہور ملک حکمرانوں ملک سعید، تاج دین، ملک

بدر، ملک زاہد، ملک دینار، ملک جلاالدین، ملک مظفراور ملک کیچکو کے زیر تسلط آیا۔ملکوں کے دور حکومت مکران کی حدود مشرقی ایران کے علاقے میناب اور ملک چیدگ (چیدگی پنجگور کے آخری مغربی سرحد) تک پھیلے ہوئے تھے۔

سردار خان گشکوری کے مطابق دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں کرمان سے سیستان اور ایرانی بلوچستان کی جانب سے بلوچوں کی پہلا بڑا طوفانی انخلاء وقوع پذیر ہوا۔

فارس میں بلوچ مختلف گروہوں کی شکل میں جنوب مشرقی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ان میں چند قبائل پروم کے راستے مکران آئے اور پنجگور تک بڑھتے چلے گئے۔

ان بلوچوں کی پنجگور میں موجودگی کی اطلاع ہمیں المقدسی کے ذریعے سے ملتا ہے'' تحریر کرتے ہیں کہ''بلوص'' قوم پنجگور میں دسویں صدی عیسوی کے دور میں رہائش پذیر تھے۔

دسویں صدی عیسوی میں آباد ہونے کے کچھ عرصے بعد بلوچوں کی ہجرت کی جبلت نے انہیں آگے بڑھنے پر مجبور کیا۔وہ سندھ کے سبز وشاداب خطے کی طرف بڑھنے لگے۔

بلوچوں میں تعلیم کی کمی نے بلوچ تاریخ کو غیر ملکی سیاحوں،مورخین اور محققین کے آرا کے اندازوں کا محتاج بنا کر رکھ دیا ہے۔جس کی وجہ سے تاریخ کا صحیح رخ سامنے لانے میں کافی مجبوریاں پیش آتی ہیں۔

لیکن جہاں تاریخ خاموش اور گرد وغبار کی نظر ہوجائے تو وہاں خوش قسمتی سے بلوچوں کی عہدی شاعری،قدیم شاعری بلوچ تاریخ کو مکمل صفحہ ہستی سے مٹانے و غائب ہونے سے بچاتی ہے جس سے بلوچ تاریخ کا بخوبی کا اندازہ لگایا بھی جاسکتا ہے۔یہ عہدی شاعری اس لئے بھی اہم ہیں کہ اس سے بلوچوں کی بودو باش ان کی روایات سے متعلق آگہی ملتی ہے۔

جسٹس خدابخش مری کی کی کتاب سے لی گئی عہدی شاعری (قدیم شاعری) میں بلوچوں نے کس طرح اشعاروں کی مدد سے اپنی داستانوں کا اظہار کیا ہے۔

بہادروں کا انتقام بھی مجھے پیارا ہے۔
جو میرے اونچے قلعے پر حملہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

خاندانی امیروں کو ڈھونڈ نا ہوتو انکی نسل کا پتہ لگا۔
ان سے پوچھ کہ رندوں کے جانے کے بعد مکران کیسے ویران ہوا۔
اور پنجگور کا آباد وشاداب علاقہ کس طرح برباد ہوا۔
جبکہ میر بکر ورامین اور گوہرام کو مکران چھوڑ نا پڑا۔

اس خطے میں بلوچ قوم کی آمد وہجرت کے متعلق ایک رائے یا حوالے پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخی اعتبار سے محققین ومورخین نے بلوچ قوم کی ہجرت (آمد) وسکونت اور کوچ کو متضاد حوالوں سے بیان کی ہے۔ ''بلوچ تاریخ اور عرب تہذیب'' نامی کتاب کے صفحات 252 تا 254 پر چند مورخین ومحققین آراء یوں درج ہیں۔

میر محمد بخش تالپور...... کی یہ عبارت نقل کرتے ہیں کہ:

''بلوچوں نے حلب (شام) سے مکران ہجرت کی اور اپنی قوت زور بازو سے یہاں کے قدیم باشندوں پر غلبہ پالیا۔ اس طرح یہاں کے قدیم باشندے دخیل بلوچوں کی قسم سے قرار پائے۔

پھر برصغیر کے عظیم مورخ ومحقق مولانا نوراحمد فریدی...... کرنل موکلر (18)...... کی کتاب کے بارے میں بتاتے ہیں اور حلب سے بلوچوں کی ہجرت کی دلیل کے طور پر اس کتاب سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ مجھے اس موضوع سے متعلق یہ کتاب...... جامعہ پنجاب...... لاہور کے کتب خانے سے ملی۔ میں نے اس کتاب میں موکلر کی یہ رائے بھی دیکھی کہ......رند...... صحیح النسب عمانی قبیلہ ہے جو حارث علافی کی نسل سے ہے۔

صفحہ ۵۳ پر مولانا نوراحمد فریدی...... سر تھامس ھولڈچ ......اور بعض دیگر مورخین کی آراء نقل کرتے ہیں۔ جو اس امر پر متفق ہیں کہ بلوچ قبائل عربی الاصل ہیں جو سرزمین عرب سے ہجرت کر کے ایرانی علاقوں میں آباد ہو گئے تھے اور وہاں سے...... کرمان......اور...... سیستان...... کی طرف منتقل ہو گئے اور جہاں سے بالآخر وہ مکران...... اور......سندھ...... چلے گئے۔ مولانا نوراحمد فریدی مجلّہ ''بلوچی دنیا'' کی جنوری 1958 کی اشاعت کے صفحہ 40 سے محمد رمضان کے اس مقالے سے بالاختصار نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:

''اسلام سے پہلے عربوں کی ایک قوم تھی جسکا نام...... بلوص...... تھا۔ جو بہت بہادر اور سخی تھے۔ جب سرزمین عرب اسلام کی روشنی سے منور ہوئی تو یہ پوری قوم اللہ کے دین میں داخل ہوئی۔ لیکن جب یہ قوم یعنی ...... بلوص...... ایرانی حدود میں آباد ہوئی تو بلوص کا ''ص'' مفرس ہوکر فارسی کے ''چ'' سے بدل گیا اور یہ لفظ ...... بلوص ...... سے تبدیل ہوکر ...... بلوچ ...... ہوگیا۔'' پھر مولانا فریدی مجلّہ ''بلوچی دنیا'' فروری 1959 کے شمارے کے صفحہ 26 سے بلوچی زبان کے شاعر ''عبدالرحمٰن غور'' جو بلوچستان کے ایک مشہور شاعر ہیں اور جنہوں نے ...... فریدی ...... کے مطابق تاریخ کی دشوار گزار اور پر پیچ وادیوں میں تحقیق کا سفر طے کیا ہے، کے مقالے سے مندرجہ ذیل اقتباس نقل کرتے ہیں:

''قدیم تاریخی روایات اور واقعات کے نہایت دقت نظری سے مطالعے اور انکی تحقیق وتشریح کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بلوچ اپنے نسب اور خاندانی شرافت، غرض ہر لحاظ سے خالص عرب ہیں ۔ ایسے تمام مورخین جنہوں نے بلوچ تاریخ کے مختلف ادوار کے بارے میں لکھا ہے اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قوم ...... بلوچستان ...... میں ...... ایران کے راستے ...... داخل ہوگئی۔ لیکن تاریخی دلائل اور مختلف واقعات کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ بلوچ، سرزمین بلوچستان میں مختلف راستوں سے آئے۔''

مولانا نور احمد فریدی اس اقتباس پر حاشیہ لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

بلوچ مورخ ودانشور سردار خان گشکوری کی یہ رائے ...... کہ بلوچ ...... مکران ...... میں عراق سے آئے۔''

پھر مولانا نور احمد فریدی مشہور محقق میر گل خان نصیر، مولف ''تاریخ بلوچستان'' سے یہ عبارت نقل کرتے ہیں کہ:

''بلوچ قدیم زمانے میں اپنے عرب وطن یعنی ......دجلہ و فرات (عراق) ......اور......حلب (شام) ...... کے میدانی اور سرسبز وشاداب علاقوں میں رہتے تھے اور وہاں سے ایرانی حدود میں منتقل ہوئے اور پھر تبریز آئے اور اسکے بعد...... کوہ البرز...... کے دامن سے مشہد (یعنی سرزمین طوس) تک پھیل گئے۔

میر گل خان نصیر کی اس عبارت پر حاشیہ لکھتے ہوئے مولانا فریدی رقم طراز ہیں:

''صالح محمد لہڑی نے بھی اس نظریے کو درست تسلیم کیا ہے اور میر گل خان نصیر کی

کتاب ''تاریخ بلوچستان'' میں بلوچوں کی ہجرت کے بارے میں اس تحریر سے متفق ہیں کہ قدیم زمانے میں بلوچوں نے دیار عرب میں موجود اپنے اصل وطن سے کرمان ومکران کی طرف ہجرت کی تھی۔ صالح محمد لہڑی ''بلوچی دنیا'' جو ملتان سے اردو زبان میں شائع ہوتا تھا۔ کے جون 1960ء کے شمارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ہزاروں سال پہلے بلوچوں نے قبائلی گروہوں کی صورت میں دجلہ وفرات اور حلب میں اپنے اصل وطن سے ہجرت کی اور ان ہجرت کرنے والے بلوچ قبائل کی لہریں بلوچستان کی حدود تک جا پہنچی۔''

مولانا نور احمد فریدی کہتے ہیں کہ:

''قدیم وجدید مورخین اور محققین کے افکار ونظریات کا جائزہ لینے کے بعد ہم مندرجہ ذیل نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

''بلوچ اپنے حسب ونسب اور خاندانی شرافت، ہر اعتبار سے خالص عرب ہیں اور حضرت اسماعیل بن ابراھیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ جب عمالقہ نے بنی اسماعیل کو مکہ مکرمہ سے جلاوطن کر دیا تھا تو ان میں سے یعنی بنی اسماعیل میں سے بعض قبائل شام کی وادیوں میں سے ایک وادی جسے...... وادی بلوص...... کہا جاتا تھا۔ آباد ہوگئے۔ اس وجہ سے ان قبائل کو...... بلوص...... کا نام دیا گیا۔ جب...... بلوص...... نے ایران اور روم کی طرف کوچ کیا تو...... بلوص...... کا......ص...... فارسی کے......چ...... میں بدل گیا اور اسکے بعد سے یہ قبائل...... بلوچ...... کے نام سے پہچانے جانے لگے۔''

حوالہ جات

بلوچ تاریخ وعرب تہذیب :ڈاکٹر اسماعیل دشتی البوشہری

کوچ وبلوچ :میر گل خان بلوچ

بلوچستان اضلاع اور تاریخ :ایم عثمان

ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان

باب چہارم

زبان(Language)

نامور ماہر لسانیات جی ڈبلیو گلبرٹسن انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں تحریر کرتے ہیں کہ بلوچستان کے بلوچوں کی زبان بلوچی ہخامنشی بادشاہوں کے درباری قدیم فارسی سے تعلق واضح ہوجاتی ہے۔ اور ماہرین یہ اتفاق کرتے ہیں کہ ہخامنشی حکمرانوں کے کتبہ کے اوپر تحریریں بلوچی کے قدیم ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ سرکاری زبان کے ناطے اس پر بعد میں فارسی کے الفاظ شامل ہوئے۔

اس بات پر کچھ ماہرین اتفاق کرتے ہیں کہ بلوچی ایرانی زبانوں کا ایک حصہ ہے۔ جس کی بنیاد آریائی زبانوں میں سے ہے۔ لیکن بلوچی کے بنیاد کے متعلق مختلف آراء موجود ہیں۔ لانگ ورتھ ڈیمز کے مطابق بلوچی زبان قدیم فارسی سے تعلق رکھتی ہے۔ مورخ و ماہر لسانیات ومیکڈونیل بلوچی زبان کا تعلق میدیا(Medie) سے جوڑتی ہے۔ میجر موکل اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ بلوچی ایرانی شاخ آریائی اور پہلوی زبان کی بہن ہے۔

جدید تحقیق سے واضح ہوجاتی ہے کہ بلوچی ایرانی زبانوں کے مغربی شاخ سے ہے اور اس زبان کی ابتداء میدی زبان سے ہے۔ ایرانی ماہر لسانیات پروفیسر مارگن اسٹائین کے خیال کے رو سے بلوچی ایرانی شاخ کے ایک آزاد شاخ ہے جو کہ بہت قدیم تاریخ اور نشانیاں رکھتی ہے۔ بلوچی آریائی زبانوں میں سے ہے۔ اور آرین وتج یا آریا ملک کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کیجاتی ہے۔ لیکن اصل میں اندازہ 4500یا5000 سال قبل تمام قوم (مشرق ومغرب) مشرق وسطی میں رہائش پزیر رہے یہی قوم آریائی قوم کہلاتی ہے۔ تاریخ دان اور دانشور اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ مشرق سطیٰ کے لوگ آرین وتج تھے۔ جو اس خطے میں بودوباش رکھتے تھے۔ آرین قوم کے متعلق سید ظہور شاہ ہاشمی کے

مطابق بہ وثوق سے کہا نہیں جاسکتا ہے کہ آرین وطن کہاں تھا۔ البتہ یہ قوم جنوبی روس یا ایران کے مقام پر رہے ہیں۔ ایرانی مذہبی کتاب اوسیتا کے ترجمہ میں" ایراں وتیج، آرین وتیج کا نام اوستیا میں موجود ہیں۔ پہلوی کتابوں میں اسی حوالے سے تذکرہ موجود ہیں۔ اسی بنیاد پر زیادہ تر مورخین اور تاریخ نویس اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں کہ ایرانی علاقے خوازم" آریاوتیج کے بنیادی علاقے ہیں۔ نامور دانشور و سیاستدان شیر محمد مری آرین وتیج کو میر کوہ کا علاقہ تصور کرتے ہیں کہ قوم یہی آباد تھی۔ لیکن تمام آراء میں سے اس پر زیادہ اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ آرین وتیج ایشاء میں ایرانی علاقہ خوازم جنوبی روس کا وہ علاقہ جواب ریاستیں ہیں ان کی بنیادی علاقے ہو سکتے ہیں۔

تاریخی حوالے سے ماخذ ہے کہ بلوچ قوم میر جلال خان کی زیر سرگردگی میں بارہویں صدی عیسوی سے مکران میں وارد ہونے شروع ہوئے۔ وہ پانچ چھ سو سالوں کے لگ بھگ شمالی و مغربی اور جنوبی و مشرقی ایران کے مابین گھومتے رہے۔ نتیجتاً ان کی زبان پر اس دور کی فارسی نے (جو ادشا کی بگڑی ہوئی شکل تھی) اثر ڈالا۔ جب یہ بلوچستان میں داخل ہوئے تو مکران ان کا مرکز بن گیا۔ تقاضائے حالات اور سیاسی موافقت کی بناء پر ان کا ایک بڑا حصہ یہاں سے قلات، سبی اور کچھی سے ہوتا ہوا سندھ و گجرات اور پنجاب و سرحد کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں پر ان کی مخصوص زبان محفوظ اور خالص نہ رہ سکی۔ مگران کے کچھ قبیلے مستقل طور پر مکران میں آباد ہو گئے اور یہ علاقہ اس وقت جنوبی ایران سے ملحق تھا اور مکران ہی کا کچھ حصہ اب جنوبی ایران میں واقع ہے۔ اسی لئے مکران کی بلوچی پر فارسی کی چھاپ لگ گئی۔ مکران میں بولی جانی والی زبان کے بارے میں اصطخری اور ابن حوقل لکھتے ہیں کہ یہ نئی فارسی (Farisiyya) اور مکرانی (Makriyya) ہے جبکہ المقدسی کے مطابق ان بہادر اور وحشی لوگوں کو جو کہ پنجبور (پنجگور) میں آباد ہیں انہیں بلوص اور ان کی زبان کو بلوصی کہا ہے۔

بلوچستان کے دیگر علاقوں کی نسبت مکران ڈویژن میں 100 فیصد بلوچی زبان بولی جاتی ہے۔اور یہاں بولی جانے والی بلوچی کومغربی (مکرانی)اور رخشانی بلوچی بھی کہا جاتا ہے۔

ماہرلسانیات نے بلوچی کوابتدائی طور پر دو حصوں یعنی مشرقی اور مغربی بلوچی میں تقسیم کی ہے۔اس کی بنیادی وجہ بلوچستان کی آبادی کا منتشر ہونا و دیگر زبانوں کے اثرات ہیں۔ مشرقی لہجے میں سلیمانی لہجہ اور مغربی لہجہ یعنی مکرانی لہجہ کہلاتا ہے۔مشرقی لہجہ، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان اور سندھ کے بہت سے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔اوراس طرح مری، بگٹی لہجے کے درمیان کچھ فرق ہے لیکن پھر بھی یہ مشرقی لہجے سے نزدیک نظر آتا ہے۔مشرقی بلوچی پر سندھی، براہوی اور سرائیکی کے اثرات نمایاں ہیں۔جبکہ مغربی بلوچی بلوچستان کے مغربی علاقوں کی زبان ہے جومکران، خاران، لسبیلہ، کوئٹہ اور چاغی کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔اس کے علاوہ رخشانی مغربی بلوچی لہجہ افغانستان اور ایران کے کچھ علاقوں میں بولا جاتا ہے۔اس پر فارسی کے اثرات واضح ہیں۔ بلوچی لہجوں میں فرق کی بنیادی وجہ بلوچ قوم کی مختلف ملکوں علاقوں میں تقسیم اور خانہ بدوشی کی زندگی کی سبب پیدا ہوئی ہے۔

اس کے برعکس تیسرے لہجے کو جسے رخشانی لہجہ کہا جاتا ہے جبکہ مکرانی لہجہ تربت، گوادر ،کراچی اور ساحلی مکران ایرانی بلوچستان کے علاقے چابہار تک بولی جاتی ہے۔مکران میں پنجگور وہ علاقہ ہے جو لہجے کے حوالے سے مکرانی لہجے کے قریب ہونے کے بجائے رخشانی لہجے سے قریب تر ہے۔ رخشانی لہجہ شمالی بلوچستان کے چاغی، دالبندین نوشکی خاران اور واشک میں بولی جاتی ہے۔چونکہ پنجگور کا بلوچی لہجہ فارسی اثرات کے زیر عتاب ہیں۔

پنجگور میں بلوچی لہجے کا مکران کے دیگر علاقوں کے بلوچی لہجے کے درمیان ایک نمایاں فرق موجود ہے۔جو کہ مکرانی لہجے کے بجائے رخشانی بلوچی لہجے سے نزدیک تر ہے۔ اس تفریق کو جغرافیائی اعتبار سے یوں بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ بلوچ ساحلی پٹی بشمول کیچ

،کراچی سے لیکر ایرانی بلوچستان کے علاقے سراوان سرباز وزاہدان تک ایک الگ منفرد لہجے کے ساتھ بلوچی بولی جاتی ہے۔اس علاقے کی بلوچی لہجے کو رخشان گالوار (لہجے) میں شمار میں کیا جاتا ہے۔

بلوچی میں نثر کی روایت:۔

بلوچی زبان میں شاعری اتنا قدیم ہے جتنا بلوچی زبان، چونکہ ابتدائی دور میں بلوچوں میں تعلیم کی کمی سے بلوچی شاعری زیادہ تر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی گئی ہے۔واضح کتابت شدہ شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتداء 1850ء اور بلوچی میں (نثر) کی روایت قدیم تر ہے اور اسکی روایت باقاعدہ 1840 میں انگریزوں کی بلوچستان پر قبضہ و تسلط کے بعد سے ہوئی۔ چونکہ انگریزوں نے اس خطے کے اندر اپنی سیاسی ،تجارتی و عسکری مقاصد کے حصول کیلئے ایک محدود انداز میں بلوچی زبان میں تحریر کی پالیسی اپنائی۔

1840ء میں کیپٹن لیچ نے جنرل ایشیاء ٹک سوسائٹی بنگال کی جانب سے بلوچی زبان کے شاعری کا ایک مجموعہ شائع کی۔اس کے بعد انگریزوں نے رومن رسم الخط میں لغات کی کتابیں لکھی۔ اس سلسلے میں 1874ء میں گلسٹر سٹون نے ''بلوچی ہینڈ بک'' ترتیب دی۔

1875ء میں لالا ہتورام نے ''بلوچی نامہ'' تربیت دیا۔

1877ء میں رچرڈ برٹن نے اپنے ''سفرنامہ سندھ'' میں بلوچی شعر بھی شامل کیے۔ اس طریقے سے انگریز حکمرانوں ہی سے آہستہ آہستہ بلوچی میں لکھنے ونثر کا رواج چل پڑا۔1880 تا 1850ء کو ایل ڈیمز نے بلوچی میں جتنے بھی شعرا کھٹے کئے تھے ان میں چند کی اشاعت کی اور اسے بہت پزیرائی بھی حاصل ہوئی۔1907ء میں رائل ایشیا ٹک سوسائٹی نے یہ کتاب دوبارہ چھاپ دی۔

1917ء میں انگریزوں نے عیسائیت کی تبلیغ کیلئے بائیبل سوسائٹی پنجاب کے زیر اہتمام ''یوحنا'' کو بلوچی میں ترجمہ کیا۔ انگریزوں نے مختلف ادوار میں بلوچی کو رومن اور انگریزی رسم الخط میں تحریر کیں۔اس کے بعد میں مذہبی عالموں نے بلوچی زبان کی ترقی

کیلئے انتھک جدوجہد کی۔اس حوالے سے ڈھاڈر (بولان) مکتبہ درخانی اسلامی مدرسہ کی جانب سے دوسری زبانوں کے ساتھ بلوچی میں تبلیغی کتابیں شائع ہوتے رہے۔

مولانا حضور بخش جتوئی نے پہلی مرتبہ قرآن مجید کا بلوچی زبان میں ترجمہ کیا۔اس حوالے سے تاریخ،تحقیق وسیاست پرمبنی رسالوں وموضوعات پر کئی کتابیں شائع ہوئیں۔

1957ء کو بلوچی میں لکھنے کیلئے بلوچی دیوان'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ میر غلام محمد شاہوانی کو جنرل سیکریٹری کے عہدے پر منتخب کیا گیا جو بلوچی زبان کے ایک معروف ادیب دانشور تھے۔اس تنظیم کے زیراہتمام زبان وادب کی ترقی وترویج پر بہت کام ہوئی۔اس طرح بلوچی دیوان نے میر گل خان نصیر کے شعری مجموعہ''گلبانگ'' چھاپ دی۔اس کتاب کی اشاعت کے بعد شعری مجموعوں کے شائع ہونے کا تسلسل شروع ہوا۔بلوچ اسٹوڈنس آرگنائزیشن BSO نے اپنے اغراض ومقاصد ومنشور میں بلوچی زبان کوقومی زبان قراردے کر سرکاری اوردفتروں میں رائج کرنے کی کافی جدوجہد بھی کی۔ اورعملی طوراپنے پروگراموں سیمیناروں،محفلوں،مشاعروں اوردیوانوں میں بلوچی زبان کو بہت ہی اہمیت وفوقیت دی۔جس سے بلوچی زبان وادب بہتر معیاراورایک حدتک محدود پوزیشن برقراررکھنے میں کامیاب رہی۔

بلوچی بعداز1948:۔

جب 1947 کو پاکستان بناتو یہاں پانچ قومیتوں کی زبانیں موجودتھیں۔جب نوماہ بعد مارچ1948 کو بلوچستان کا الحاق ہواتوان پانچ قوموں میں سے کسی طرح بھی ایک چیزمشترک نہ تھی۔بلوچ بشمول تمام قومیتوں کے تہذیب وتمدن،ثقافت ورسم رواج اور بودو باش میں زمین آسمان کا فرق تھا۔پاکستان قائم ہونے کے ساتھ بعدمیں اردوالگ زبان کےطور پر پاکستان میں آئی اوراردوکوسرکاری سرپرستی اور ہمدردی بھی حاصل تھی۔لہٰذااردوکو پاکستان کا سرکاری زبان قراردیا گیا۔لیکن مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو یہ فیصلہ قبول نہ تھا اوراسی طرح بنگالی سراپا احتجاج ہوئے۔چونکہ مشرقی پاکستان رقبہ اورآبادی کے اعتبار سے

مغربی پاکستان سے زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان دفتروں میں قیام پاکستان سے پہلے سرکاری زبان کے طور پر رائج تھی۔ اور بنگالیوں کو اردو بطور سرکاری زبان قبول نہ تھی۔ حکومت نے مجبوراً پاکستان میں دو قومی زبان اردو اور بنگالی کو سرکاری زبان کے طور رائج کی۔ ویسٹ پاکستان کی چاروں قومی زبانوں میں سے سندھی ابتداء ہی سے سرکاری اداروں، اسکولوں اور کالجوں میں نافذ العمل تھی۔ اسی طرح حکمرانوں نے مذید بحرانوں اور اختلافات سے بچنے کیلئے سندھی زبان کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا۔ اور سندھ کو لسانی بنیادوں پر دو حصوں شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان منقسم کی۔ شہری علاقوں میں جہاں ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجر آباد تھے۔ اردو زبان رائج کی اور اندروں سندھ میں سندھی زبان کو نافذ کی جو وقت کے ساتھ ساتھ کافی مضبوط و مستحکم ہوتی ہوئی۔ اسی طرح پنجابی زبان کے ساتھ بہت ہمدردی اور سرکاری سرپرستی روا رکھی گئی۔ پنجاب کے بعد پشتون پاکستانی اداروں بشمول افواج و دیگر اہم وفاقی اداروں میں اپنا ایک واضح وجود رکھتے تھے اور پنجاب کے بعد سیاسی اقتدار میں بڑی حصہ دار ہیں۔ اور یوں اس ملک میں فوج ایک طاقت ور ترین ادارہ جانا جاتا ہے۔ اسی لئے پشتو کو صوبہ خیبر پختونخواہ (سرحد) کا قومی زبان قرار دیا گیا۔ مگر بلوچی زبان کو خاص نگاہ ہمدردی نہ ملی۔ حالانکہ بلوچی ابتداء ہی سے بلوچوں کا قومی زبان ہے۔ تاریخ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ بلوچی زبان ابتداء ہی سے بلوچستان کے قومی زبان کے طور پر رہی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی پہچان لازمی طور پر زبان ہی سے کیجاتی ہے اس کے باوجود یکطرفہ طور پر بلوچی زبان کو نظر انداز کر کے ترقی و ترویج کی جانب تمام اقدامات سے معدوم رکھا گیا۔ اور ابتداء ہی سے دیگر زبانوں کو بلوچی زبان پر غالب رکھا گیا۔ بلوچی کو بلوچستان کے تعلیمی اور نہ سرکاری اداروں میں نافذ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ بلوچی زبان کے بطور قومی زبان ہونے کے تمام راستے مہندم اور معدوم ہوتے گئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان اس وقت ترقی کی منازل طے کر سکے گی جب حکومتی اور سرکاری سطح پر باقاعدہ سرپرستی و ہمدردی ہو۔ لیکن یہاں جان بوجھ کر بلوچی کو بلوچستان کی پہچان بنانے کے بجائے اسے ایک علاقائی یعنی آہستہ آہستہ ختم کرنے کی پالیسی اپنائی گئی۔

بلوچی کو بلوچستان کی سرکاری دفتری زبان قرار نہ دینا تعلیمی اداروں، سکولوں، کالجوں ودیگر اداروں میں نافذ نہ کرنا اور ملک کے الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا میں مناسب وقت کا نہ ملنا وہ اقدامات و پالیسیاں ہیں جن کی وجہ سے اس خطے کے اندر بلوچی زبان کی ترقی وترویج پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوئے۔

حکومتی اعداد وشمار کے مطابق سندھ اور پنجاب میں کثیر تعداد میں بلوچ آباد ہیں جو آج تک اپنی زبان ورسم رواج قائم رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن آج تک وہاں کے بلوچوں کی قومی زبان کی ترقی وترویج کے بجائے زیر اثر رکھنے کی پالیسی اپنائی گئی۔

مگر تاریخی حوالے سے عیاں ہیکہ بلوچی زبان کی ترقی وترویج کیلئے علمی ادبی اداروں کے علاوہ قوم پرست جماعتوں اور طلباء تنظیموں نے ہمیشہ سے قابل ذکر کردار ادا کی ہے۔ ان میں سے بلوچ طلباء تنظیم بی ایس او بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائز (BSO) کے کردار کو نمایاں اور اہم جانا جاتا ہے۔

1977 میں بی ایس او کے زیر اہتمام بلوچی ادبی مجلّہ ''بام'' کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوا۔ اور 1987ء میں بی ایس او (سہب) کے زیر اہتمام ''سنگت'' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالے کا اجراء باقاعدگی ہوتا رہا جو کہ ایک منفرد ادبی اور سیاسی رسالہ تھا۔ اور بی ایس او کے دوسرے دھڑے کی جانب ''پجار'' جاری ہونے والے رسالے کا نام تھا جو اپنے نوعیت واعتبار کے لحاظ سے ایک معیاری اور منفرد رسالہ جانا جاتا تھا۔ اگر ماضی پر نظر دوڑائی جائے تو گذشتہ ادوار میں بھی اسی پلیٹ فارم کے توسط سے اسی طرح کے ادبی سرگرمیاں ہوتے رہے ہیں۔ بی ایس او (عوامی) کے زیر اہتمام ''گروک'' کے نام سے جاری ہونے والے رسالے کا ایڈیٹر دوستین بلوچ تھا۔ جو کافی عرصے تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ موومنٹ کا اجراء بھی ہوا جو اپنی اشاعت کے فوراً بعد جلد ہی بند ہوا۔ ڈاکٹر سعید جتوئی اور عطاء اللہ بزنجو نے ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پلیٹ فارم سے ''سنگر'' شائع کی۔ اسی طرح بی ایس او کے پلیٹ فارم ہی سے بلوچی زبان کی ترقی وترویج کیلئے بھرپور جدوجہد

ہوتی رہی ہے جو کہ بی ایس او نے قومی سوچ و سیاسی شعور کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ بلوچی زبان کی تشہیر و ترقی و ترویج میں اہم رول ادا کی۔

بعد میں 1955ء کو عبدالقیوم بلوچ کی سرکردگی میں بھی بلوچی اکیڈمی کا قیام بلوچی زبان کے لئے بنیادی ستون ثابت ہوا۔ بلوچی رسم الخط و دیگر مشکلات کو حل کرنے ترقی و ترویج کی جانب ایک بہترین پیش رفت اور یہ دور زبان و ادب کیلئے ایک سہنری دور تھا۔ چونکہ عبدالقیوم بلوچ ایک سرکاری ملازم تھے۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں ٹرانسفر ہوتے رہے۔ لیکن پھر بھی وہ بلوچی زبان وادب کی جدوجہد میں ہمہ وقت مصروف عمل رہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں گران ہائے خدمات انجام دی۔ کافی تگ ودو کے بعد وہ سرکاری سطح پر بلوچی اکیڈمی کیلئے ایک معمولی گرانٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور اہل قلم و دانش کو بلوچی زبان کی جانب توجہ مبذول کرنے پر مجبور کی۔ انہوں نے تمام تر مشکلات کے باوجود بلوچی زبان کی خدمت جاری رکھی۔ بلوچی اکیڈمی کے زیراہتمام مختلف پروگراموں کے انعقاد و کتابوں کی اشاعت اور بلوچی زبان کو اس ملک میں صحیح مقام دلانے کے لئے بھرپور جدوجہد میں مصروف عمل رہے۔ اس زمانے میں بلوچی اکیڈمی کے زیر اہتمام کالجز، یونیورسٹیوں اور فیڈرل وصوبائی پبلک سروس کمیشن کیلئے کورس ونصاب ترتیب دیئے گئے۔ بلوچی اکیڈمی کے متحرک ہونے کے بناء پر دیگر علاقوں میں اکیڈمیز و ادبی تنظیمیں معرض وجود میں آتے گئے۔ ان میں بلوچستان اکیڈمی تربت۔ عزت اکیڈمی پنجگور، راسکوہ ادبی دیوان نوشکی، مکتبہ سوغات کراچی، سید لبزانکی مجلس متحدہ عرب امارت، بلوچ دودربیدگی مجلس، بلوچی لبزانکی دیوان و دیگر ادبی ادارے قائم ہوئیں۔

اور اسی طرح بلوچی روزنامہ ''نوائے وطن'' لالا غلام محمد شاہوانی اور ملک اپناہ کی سرپرستی میں اولین بلوچی اخبار کے طور پر نکالا گیا۔ لیکن حکومت کی عدم توجہی اور بلوچ سیاسی رہنماؤں کی عدم دلچسپی نے اسے مستقل طور پر قائم رکھنا مشکل ہی ثابت ہوا۔ اور اب دوبارہ اسی اخبار کو ملک محمد پناہ کی بیٹی آمنہ پناہ اور عیسیٰ بلوچ شائع کررہے ہیں۔ حکومتی عدم دلچسپی و دیگر مسائل بلوچی زبان کو دیگر قومی زبانوں کے برابر لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ و مشکل رہی ہے۔

اس وقت بلوچی زبان کو ملک میں ایک صوبائی اور علاقائی زبان قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ بلوچی زبان پاکستان کے علاوہ دنیا بھر کے کئی ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ چونکہ بلوچ سیاسی اور جغرافیائی طور پر منتشر ہو کر دنیا کے کئی علاقوں اور حصوں میں منقسم ہیں۔

عظیم بلوچ جنگجو چاکر اعظم کی تیس سالہ آپسی لڑائیوں اور رنجشوں کے نتیجے میں آخر کار وہ کئی ہزار بلوچوں کے ساتھ پنجاب کی جانب کوچ کر جاتے ہیں اور ست گھرہ اوکاڑہ میں سکونت کے بعد وفات ہو جاتے ہیں۔ وہاں پر اس کا آخری آرام گاہ بھی موجود ہے اور لاشاری قبیلے کے سربراہ گہرام لاشاری تیس سالہ جنگ و جدل سے دل آزار ہو کر سندھ کی جانب کوچ کر جاتے ہیں۔

دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ جنگ و جدل لشکر کشیوں، ہجرتوں اور بار بار مہم جوئیوں کے نتیجے میں بھی بلوچ دنیا بھر میں منتشر ہوئیں۔ اور اسی طرح دیگر اقوام کے ساتھ مدغم بھی ہوئے ہیں مگر اب بھی بعض خطوں میں اپنی زبان و ثقافت، رسم و رواج برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔

ان تمام تر حالات کے باوجود بلوچ ترکمانستان، خلیجی ممالک، کینیا، سویڈن، کینڈا، امریکہ اور دوسرے ممالک میں اپنی قومی تشخص کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں یہ تاریخ کا جبر ہے کہ بعض حصوں میں کہ بلوچ اپنا قومی وجود اور حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن اس کے پس پردہ بہت سے وجوہات و عوامل کارفرما ہیں۔

1981 اور 1998 کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان و دیگر ممالک میں بلوچی زبان بولنے والے بلوچوں کی تعداد یوں ہے۔

صوبہ	1981	1998
بلوچستان	2142080	4284160
سندھ	1225180	2450260
پنجاب	416061	822122
خیبر پختونخواہ	702	2020
اسلام آباد	92	184

اور دیگر ممالک میں بلوچی بولنے والوں کا اعداد شمار کچھ اس طرح ہے۔

ممالک	1981	1998
ایران	1ملین	1.8ملین
افغانستان	1ملین	1.7ملین
خلیجی ممالک	3لاکھ	5لاکھ
ترکمانستان	......	75ہزار
کینفیا	......	25ہزار

مندرجہ بالا اعداد شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام سیاسی معاشی و جغرافیائی حالات کے باوجود بلوچی زبان ایک وسیع اور جامع زبان کے طور پر اب بھی دنیا کی کئی حصوں میں بولی جاتی ہے۔

بلوچی زبان کا مقام:۔

برصغیر پاک و ہند کے سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ ساتھ بلوچستان کا تعلق ایران اور افغانستان دونوں کی تہذیبوں سے براہ راست رہا ہے۔اور بلوچستان واحد صوبہ ہے جو قیام پاکستان سے پہلے الگ سیاسی وسماجی اور ثقافتی حیثیت رکھتا تھا۔

بلوچی زبان بلوچستان کی قومی زبان ہونے کے باوجود بدقسمتی سے آج تک ایک قومی زبان کی حیثیت سے ترقی و ترویج کی منازل طے نہ کرسکی۔لیکن اس کے باوجود آج تک بلوچی زبان بلوچ قوم کی قومی وفطری زبان ہے۔کسی نہ کسی حد تک شاعروں، قلمکاروں، ادیب و دانشوروں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔مگر تاریخی طور پر واضح ہے کہ بلوچوں کا اس خطے کے اندر بلوچی و براہوئی ادب کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی ادب سے کافی مظبوط رشتہ تاحال قائم ہے۔اور ہمیشہ سے بلوچستان میں اردو ادب بغیر بلوچ شعراء اور دانشوروں کے بغیر نامکمل تصور کیجا ئیگی۔

1927ء محمد صادق کی کوششوں سے کوئٹہ میں بزم ادب کے نام سے ادبی ادارہ قائم

ہوا۔اور جس کے روح رواں میر محمد حسین عنقاء اور یوسف عزیز مگسی تھے۔جو بلوچستان میں اردو شاعری کے حوالے سے کافی شہرت رکھتے تھے۔وہ وقتاً فوقتاً اردو مشاعروں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔اِن بلوچ شعراء کے علاوہ برصغیر کے مشہور شعرائے کرام حفیظ جالندھری،عمر مرادآبادی،شورش کشمیری اور عبدالمجید سالک ودیگر نے مشاعروں میں خاص طور پر شرکت کی۔

1968ء میں حلقہ احباب ''قلم'' کے نام سے ایک انجمن کی داغ بیل ڈالی گئی۔اس ادبی انجمن کے زیر اہتمام ہفتہ وار تنقیدی نشستیں منعقد ہوئے تھیں۔جن میں بلوچی کے اہم قلم کار اپنی اپنی نگارشات،تنقیدی مقالے پیش کرتے تھے۔ان میں نمایاں نام حکیم بلوچ، ملک محمد پناہ اور عطاء شاد کے ہیں۔بلوچستان کی تاریخ کو سیاسی وادبی حوالے سے دیکھا جائے تو یوسف عزیز مگسی کا طویل افسانہ ''تکمیل انسانیت'' بہت اہم تھا۔اوران کے علاوہ عطاء شاد جن کا شمار اردو اور بلوچی کے بڑے شعراء کرام میں ہوتا ہے۔ان کے مجموعہ کلام ''سنگاب'' اور ''برفاگ'' اردو ادب میں نماں اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ تاریخی حوالے سے اخذ ہے کہ بلوچوں کا اردو ادب سے ایک قریبی تعلق و رشتہ رہا ہے۔لیکن بلوچستان کی قومی زبان کی یہ بدقسمتی رہی کہ ہمیشہ وقت و حالات کا جبر اپنوں اور غیروں کی بدنیتی وتعصب کا شکار بن کر وقت وحالات کے ساتھ وہ مقام وتوجہ جس کی ضرورت تھی کبھی بھی حاصل نہ کرسکی جس کی ضرورت تھی۔ایک تو ارباب اقتدار نے عملی طور پر کبھی بھی بلوچی زبان سے ہمدردانہ روش نہیں رکھی۔اور یہ بلوچوں کی بدقسمتی رہی کہ زبان کے حوالے بلوچ بذات خود ہمیشہ منہ موڑنے کے تاریخی جبر سے بھی گزر رہے ہیں۔یہ تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ جب بلوچستان ایک آزاد وخودمختار ریاست تھی تو تب بھی بلوچستان کی سرکاری زبان بلوچی کے بجائے فارسی ہی تھا۔1877ء میں انگریزوں نے بلوچستان کو ایک ایجنسی بنایا تو انہوں نے بلوچی کے بجائے اردو کو ہی سرکاری زبان کے طور پر رائج کی۔

بلوچی ذریعہ تعلیم:۔

نیپ کے بعد پہلی دفعہ بلوچستان میں اقتدار قوم پرست قوتوں کے ہاتھوں میں آئی۔ نواب اکبر بگٹی اور بی این ایم نے (بی این اے) کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑکر شاندار کامیابی حاصل کر کے صوبائی حکومت تشکیل دی۔ اور یوں نواب اکبر خان بگٹی بلوچستان کے وزیراعلیٰ منتخب ہوئے۔ اور پہلی دفعہ بلوچ قوم پرستوں کی کوششوں کے نتیجے میں بلوچی زبان پرائمری سطح تک اسکولوں میں نافذ ہوئی۔ جبکہ باقاعدہ طور پر بلوچستان ٹیکسٹ بورڈ کی منظوری سے بلوچی نصاب تیار کی گئی اور اس سلسلے میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے ماہر لسانیات کی مدد سے نصاب مشرقی اور مغربی بلوچی میں لہجے میں تیاری کے بعد بلوچستان کے اسکولوں میں بلوچی زبان میں درس وتدریس کا عمل جاری ہوا۔ لیکن بی این اے حکومت کے بعد اس میں رکاوٹیں پیدا کر کے بلوچی زبان میں درس وتدریس کے عمل کو بند کیا گیا۔ اس سلسلے میں بلوچ قوم پرست قوتوں، بی ایس او اور علمی وادبی حلقوں نے اس غیر جمہوری اور قوم دشمن عمل کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ تاہم یہ تاریخی کریڈٹ بی این اے حکومت کا تھا کہ انہوں نے صحیح معنوں میں بلوچ قوم کی درست نمائندگی کی۔ لیکن بدقسمتی سے سیاسی نقطہ نظر میں بی این ایم اور نواب اکبر خان بگٹی کے درمیان کچھ ناعاقبت اندیش رہنماؤں کے سبب یہ سیاسی سفر بھی قائم نہ رہ سکا۔ جبکہ قومی تقاضائے ضرورت کے تحت قومی اتحاد کی اشد ضرورت تھی لیکن نہ ہوسکا۔

یاد رہے کہ دنیا میں ترکمانستان اور سویڈن کے بلوچ طلباء کو پرائمری کی سطح تک بلوچی تعلیم دی جاری ہے۔ لیکن بلوچستان میں دانستہ طور پر بلوچی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں گریز کیا جاتا رہا ہے۔ جب 1970ء میر رسول بخش تالپور جب سندھ کے گورنر تھے تو انہوں نے قومی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف ایک حکم نامے کے تحت سندھی کو سندھ کا سرکاری زبان قرار دیا۔ جو ان کی قوم دوستی کا سب سے بڑا اظہار تھا لیکن ہم میں سے

تاریخ میں اس طرح کے عمل کو کبھی نہیں دہرایا گیا جو قابل ستائش ہو۔

سندھ حکومت نے 1970ء میں سندھی زبان کے لئے ایسے اقدامات اٹھائے تھے جو حقیقی معنوں میں سندھی زبان کے لئے اہم تھیں۔ اور یوں اس طرح سندھی کو سندھ کا سرکاری اور دفتری زبان قرار دیا گیا۔

لیکن بدقسمتی سے اسی روز ایک ایسا آرڈیننس حکومت بلوچستان کی جانب سے جاری ہوا لیکن اس قومی نوعیت کے معاملے کو یکسر نظر انداز رکھا گیا جو ایک قومی المیہ سے ہرگز کم نہ تھی۔ تاہم مقتدرہ واعلیٰ سطحوں سے ایسی توضیح کو دلیل بنا کر پیش کیا جاتا ہے جس کا حقیقت سے ذرہ بھر نزدیکی نہیں جن پر دلیل دینے کی ضرورت بھی نہیں۔

اِس سے قطع نظر بلوچی زبان یقیناً ایک سے زیادہ بولیوں پر مشتمل ہے۔ باایں ہمہ نہ مشرقی بولیوں میں اتنا بعد ہے اور نہ مغربی بولیوں میں کہ، ایک ہی علاقے کے لوگ ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھ سکیں۔ بلوچی ایک وسیع اور زندہ زبان ہے اور اس کی نامیاتی قوت بولیوں کی تنوع کی شکل میں رونمائی کر رہی ہے۔ اور اس کے اثرات بحر خضر سے گنگ وجمن تک نظر آتے ہیں کہیں کم اور کہیں زیادہ۔

بلوچی زبان اپنے ذخیرہ الفاظ، حسن اظہار ادبی گنجینے کے اعتبار سے نہایت امیر اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس سرمایے کو پھیلانے اور ترویج دینے کی ضرورت ہے۔ قومی زبانوں کی ترویج کا مطلب باہمی یگانگت کو فروغ دینا ہے اور ہمیں یہ کام ہر صورت میں کرنا ہے۔

باب پنجم

ثقافت (Culture)

بلوچ تہذیب وتمدن، منفرد رسم ورواج وثقافت اور قدیم و مستحکم روایتوں کے بدولت ہمیشہ سے الگ وجدا تشخص کے ساتھ منفرد وامتیازی مقام کے مالک ہیں۔اس جدید سائنسی دور میں تیزی کے ساتھ بدلتی دنیا میں بلوچی ثقافتی، رسم ورواج اپنی افادیت وانفرادیت اور الگ تشخص کے ساتھ قائم ودائم ہیں۔ حالانکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ خطہ بڑے بڑے معرکوں اور چڑھائیوں کے ادوار سے گزر کر بہت سے عروج وزوال سے بارہا دوچار رہا ہے۔ دیگر قوموں کی آمد وادغام نے بھی اس پر خاص اثرات مرتب نہیں کی بلکہ اس میں نئی امتزاج پیدا کی۔ اور یہ تہذیبی وثقافتی ارتقاء برس ہابرس پر محیط ہے۔ جو اپنے تاریخی دامن میں فنون لطیفہ، قدیم کھنڈرات وآثار اور دیگر قدیم وجدید تاریخی علامات اپنے دامن میں سمیٹا ہوا ہے۔ جو ہر ایک کیلئے دلچسپی کا باعث ہے۔اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کا سماجی وجمالیاتی ذوق ہر وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔لیکن اس سے قطع نظر بلوچ جہاں کہیں بھی آباد ہیں چاہے اقلیت میں ہو یا اکثریت میں انہیں اپنی شناخت وپہچان برقرار رکھنے کا شدت سے احساس ہے۔

یہاں میں بلوچستان کی اس حصے کا ذکر مقصود ہے جہاں پر بلوچوں کی آمد اور پھر یہاں سے مختلف جانب ہجرتیں ہوئیں۔اور ظاہر ہے کہ اس علاقے میں بلوچ رسم رواج وثقافت اور زبان کا قائم ودائم ہونا یقینی عمل ہے۔مکران کو اگر ان بلوچی روایتوں کا امین ومنبع کہا جائے تو غلط نہ ہوگا جواب تک کسی نہ کسی شکل وصورت میں تاحال برقرار ہیں۔مکران کے تمام علاقوں کے رسم ورواج وروایات میں یکسانیت کا نہ ہونا ایک قدرتی اور ارتقائی عمل کا حصہ ہے۔ کیونکہ ایک جگہ کے دوسرے جگہ کی نسبت عادات وخصائل کی بناء پر فرق نمایاں ہوتی ہی ہوگی۔ پھر بھی بلوچی رسم ورواج میں کوئی نمایاں فرق نہیں لیکن علاقائی نسبت سے کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگی۔ یہاں ان بلوچی رسم ورواج اور روایات کو زیر بحث لارہے ہیں جو کہ بلوچ سماج سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔

حال واحوال:۔(Hal o Ahwal)

بلوچ سماج میں حال احوال یعنی وش اہت کو اہم درجہ دیا جاتا ہے۔ کسی مجلس یا دیوان کی ابتداء وش اہت یعنی حال واحوال سے کیا جاتا ہے۔ لیکن دیوان یا مجلس میں یہ حق عمر کے لحاظ سے بڑے شخص کو دیا جاتا ہے۔ چونکہ اب شہری اور دیہاتی علاقوں کے ساتھ کچھ دور دراز علاقوں میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔

بلوچی رسم رواج میں گھر میں آنے والے مہمان کے ساتھ بڑی احترام وعزت کے ساتھ پیش ہوا جاتا ہے۔ اس خطے کی قدیم امتزاج و روایت رہی ہے کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں مہمان اور اس گھر کے آنگن میں کھانا کھانے کے بعد کسی طرح غلط کام کرنے اور نقصان پہنچانے کا تصور ہی نہیں کرتا کہ میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے اور بلوچ نمک خور بن کر نہیں رہتا۔ جبکہ کسی گھر میں اگر مہمان آجائے اور اس دوران کوئی مرد بندہ موجود نہ ہو بھی تو گھر کے خاتون چاہے اکیلا ہی کیوں نہ ہوا سے وہی عزت واحترام دیتا ہے جیسا کہ مرد حضرات دیتے ہیں۔ سلام ودعا اور آنے والے شخص و مہمان کی آؤ بھگت میں کافی فرق موجود ہے۔ جس سے دیہی و شہری علاقوں میں بلوچی روایت کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ اس طریقے سے سلام دعا کی جاتی ہے۔ علاقے کے لوگ جو کہ رہائش پذیر ہیں مسافر کے ساتھ یوں سلام دعا کرتے ہیں۔

میزبان:	وش آتکئے۔	(خوش آمدید)
مہمان:	وش آتکئے۔	(خوش آمدید)
مہمان:	جوڑئے	(خیریت ہے)
میزبان:	مہربانی کن	
مہمان:	درائی کن ھیرانت تو مہربانی کن	
میزبان:	سلامتی ھیرانت ڈڈئے، جوڑئے	
مہمان:	شکر الحمد اللہ، جوڑ باتئے، شما جوڑات	

بعض دفعہ اس میں کئی الفاظ کا اضافہ کر کے کہا جاتا ہے۔

مردم جوڑ انت......؟ چُک جوڑ انت......؟

اور دیہاتی علاقوں میں سلام و دعا اور خبر گیری کمیونیکیشن کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اسی طرح بلوچی میں خاص کر خواتین سلام دعا کو یوں ادا کرتی ہے۔ خواتین ایک ساتھ سلام علیکم کہنے کے بعد دیگر الفاظ کو یوں بیان کرتی ہیں۔

خواتین: وش آتک (بہ یک آواز)

مہمان: وش آتک

خواتین: تیار جوڑ ئے/ جوڑ وش ئے/

زھگ ءُ مردم وش انت۔

مہمان نوازی:۔(Mehman Nawazi)

خود بھوکا رہنا اور مہمان کو کھلانا اس پر حملہ آور نہ ہونا اس خطے کی تابندہ روایات میں شامل ہیں۔ بلوچی مہمان نوازی، وقت، موقع اور محل کی پابند نہیں مہمان جب جس وقت آجائے میزبان دیدہ دل سے فرش راہ کرے گا چاہے وہ سب سے بڑا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ خاندان کے افراد حتیٰ کہ بچوں کو کھانا نہیں کھلاتا جب تک پوری طرح مہمان شکم سیر نہ ہو۔ پنجگور کا علاقہ اپنی مہمان نوازی اور مہر دوستی کے اعتبار سے قدیم زمانے سے اب تک اپنا ایک الگ معیار رکھتا ہے۔ اس علاقے کی شہری و دیہی علاقوں میں یکساں طور پر مہمان کی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ دیہاتی علاقوں میں یہ بلوچی روایات زیادہ مستحکم اور اسے دیگر روایات سے برتری حاصل ہے۔ جب کوئی انجان مہمان کسی گھر میں آئے جس کی پہچان نہ ہو اور گھر میں مرد حضرات بھی موجود نہ ہو تب بھی خواتین مہمان نوازی کے تمام روایت کو برقرار رکھتی ہے۔

''تاسے آپ ءَ صد سال وفا کن''

میری زمین پر ایک کٹورے پانی کی قیمت سو سال وفا ہے،

آو! ہم بھی پیاس بجھائیں زندگی کا سودا کرلیں

انتقام:۔(Intiqam)

چونکہ بلوچ معاشرے میں جس طرح دیگر رسم و رواج و روایتیں اہم ہیں اور ان کی خلاف ورزی قابل جرم وسزاء تصور کی جاتی ہے۔ جیسے انتقام گیری ہے جسے بلوچ اپنی زندگی کے اہم جز کے طور پر مانتے ہیں۔ وہ انتقام کی آگ میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے نہ کہ دشمن کی قوت وطاقت کا اندازہ لگالیتے ہیں نہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ سمجھوتہ (Compromise) کر لیتے ہیں۔

''بیر بلوچانی تاں دو صد سال ءَ
لسہیں آہوگ ، انت دو دنتانیں''

☆

''کس گبرے پہ گاری ءَ نئیل ایت
من وتی آریپیں پت ءِ بیراں
کہ بیر منی چمانی تہہ ءَ گرد انت''

(بالاچ)

اور بلوچوں کی نظام دستور میں اخلاق کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یعنی بلوچ عورتوں کی بہت عزت کرتے ہیں جہاں تک کہ لڑائی جھگڑوں میں انہیں دکھ نہیں پہنچاتے۔ علاوہ ازیں بیمار، بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہیں مارتے جس سے بلوچی کردار اور عظمت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ ان تمام ترکے باوجود بلوچ معاشرے میں عفوودرگزر بھی موجود ہیں۔ لیکن جب انتقام کی ٹھان لی جائے تو اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

سنگ اگاں چاتانی بن ءَ ریز انت
کینگ چہ مردانی دل ءَ کنز انت
بیر بلوچانی تاں دو صد سال ءَ
لسہیں آہوگ انت دو دنتانیں

بلوچ معاشرے میں یوں بھی اظہار کیا جاتا ہے۔

سنگے اگاں چات ءَ کپیت تاں قرن و دراجیں مدتے

آپ ءِ مثلاں حیرت نہ بیت ھنچو بلوچ درد انگیں

کہ دور وزمان پچناں لیگارو رھتریں نہ بیت

چوسہرو الماس مثال!

یعنی ایک پتھر اگر کسی گہرے کنویں میں گر جائے تو کئی صدیاں گزرنے کے باوجود وہ پانی کے دباؤ سے گھس نہیں جاتا۔ اس طرح بلوچ وہ در یتیم ہے جسے دور زمانے کی گردشیں سونا اور الماس کی طرح غبار آلود نہیں کر سکتیں۔

یعنی بلوچوں کا انتقام پتھر کی طرح سخت اور پائیدار ہے۔ اگر کنوئیں کے اندر پتھر گس سکتے تو بلوچوں کے انتقام کی آگ بھی ٹھنڈی پڑ سکتی ہے، بلوچی انتقام صدیوں تک دودانتوں والی ہرنی کی طرح سدا جوان ہی رہتا ہے۔

بلوچ معاشرے میں مائیں اپنے بچوں کو انتقام لینے کی لوریاں دے دے کر جوان کرتی ہیں۔ بلوچی لوک ادب قومی وخاندانی انتقام لینے کی لوریوں سے لبریز ہے۔ بلوچوں کی تاریخ ان واقعات سے مرتب ہیں۔ جب قوم کے فرزندوں نے قومی روایات کے تحفظ کے لئے اپنی جانیں نچاور کر کے دشمنوں سے شدید انتقام لیا۔ دشمنوں کے لئے قہر الہٰی ہیں۔ ان کی زبان بھی جانتے ہیں۔ ان سے ان کا نباہ ناممکن ہے۔

☆ هماوہد امنی تئی صلح وتر ان بیت۔

اسی وقت میری صلح تجھ سے ہوگئی

☆ شفال مرغ کیتانی شپاں بیت

جب گیدڑ، مرغ و کبوتر کا پاسبان بن جائے گا۔

☆ حصارانی پلنگ گواں اشتراں بیت

جب شکاری، پلنگ واونٹ کا محافظ بن جائے گا

☆ وروکیں گرک نگھواں پساں بیت

جب بھیڑیاں، بھیڑوں کا گلہ بان ہو جائے گا

☆ اگاں ماہی زرءَ ڈنءَ نشچاں بیت

جب مچھلیاں خشک میدانوں میں زندہ رہنے لگیں گے

☆ اگاں منبہ گوں آچش ہم لساں بیت

جب آتش پنبہ میں آتشی ہو جائے گی

☆ زہ ہما وہداں منی تئ صلح تراں بیت

اس وقت میری صلح تجھ سے ہوگی

یعنی میری اور تیری صلح اور گفت وشنید اس وقت ممکن ہے جب گیدڑ مرغیوں کا پاسبان بنے، پہاڑی چیتا اونٹوں کے گلے میں شامل ہو جائے۔ خوانخوار بھیڑیا مویشیوں کے نگہباں بنے، سمندر کی مچھلیاں خشکی پر آ جائیں، روئی اور آگ کا میل ہو۔ اگر یہ باتیں کبھی ممکن ہو سکتی ہیں تو میری اور تمہاری صلح و گفت وشنید بھی ممکن ہو سکتی ہے۔

انتقام گیری بلوچ معاشرے کا ایک مسلمہ حقیقت ہے جو اسے کبھی بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہ قدیم زمانے سے آج تک اپنے آب وتاب کے ساتھ برقرار ہے اور بلوچی لوک ادب میں بھی اسے اہم مقام حاصل ہے۔ بلوچ لوک ادب میں بالاچ اپنے بھائی کے انتقام کی آگ کو بچے کی عمر میں جلتا ہوا جوان بن کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

منَ گوں بداں ہنچش کناں

مید گوں ماہیگاں کتہ

بزُ گوں کپیری شینگراں

باز گوں کپوتی ولراں

ہیکاں کتگ گوں ارزناں

گرگ گوں مزن جیڑیں جڑاں

بلوچ انتقام لینے کے معاملے میں بہت سخت جان وسخت گیر رہے ہیں۔ زمانہ قدیم سے لیکر آج تک انتقام کی یہ روایت بلوچ قوم میں مستحکم و برقرار ہیں۔ میں اپنے دشمن کے ساتھ ایسا کروں کا جیسے کسی نہ کیا ہوگا۔ یہ جذبہ انتقام کی آخری حد ہے جسے الفاظ کے پیرائے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔

شعر:۔(Shiar)

شعر ایک جنگی گیت ہے۔ یہ جنگ سے پہلے اور بعد میں گایا جاتا ہے۔ یہ پیشہ ور گانے والے گاتے ہیں۔ ان میں جنگی مناظر اور شور شرابے کی منظر کشی کی جاتی ہے یا محبوب کی جدائی حاصل نہ ہونے کی صورت میں گایا جاتا ہے۔

جیسے! میں جنگ میں بزدلی نہیں دکھاتا۔ بلکہ شیر کی طرح لڑتا ہوں میرے پاس جنگی ساز و سامان سے لیس لشکر نہ ہو بھی تو پیٹھ نہیں دکھاتا۔ میں اپنے سر کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے دشمن پر آندھی وطوفان کی طرح ٹوٹ پڑوں گا۔ جس دشمن کے سپاہی خیموں میں اپنی محبوباؤں کے ریشمی بازوں میں سو رہے ہوں گے میں ان پر بجلی بن کر گروں گا اور انہیں خس وخاشاک کی طرح بہادوں گا۔

بیا کنیں جنگے پہ سامان
کافر ءَ کشیں چہ ڈیہاں
گشتگ انت سردار بلوچ خان
مہراب خان منی دوست ءُ دل جان
گونے گند گوہ ءَ نیست من ءَ تران
یا کہ ما بین یا (کہ) اَچ آواں
یا وتی ھیسی سر ءَ کنیں زیان

اس جنگی شعر کو بلوچوں نے انگریزوں کے ساتھ جنگ گوک پروش کے لڑائی پر کہی وہ اپنے سرزمین کے دفاع و تشخص کی خاطر یوں اظہار کرتے ہیں کہ ”آؤ ایک جنگ کریں اور

بے دین کو اپنے سرزمین سے نکال باہر کریں یا شہید ہو جائے'' ایمان کے ساتھ اس کا اظہار سردار بلوچ خان نے کی ''مہراب خان میرا دوست اور دل جان ہے'' اس کے پاس گنداواہ ہے اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں'' وہ رہیں گے یا ہم اپنی قیمتی جانیں قربان کر دیں گے''

واضح رہے کہ جنگ گوک پروش کے معرکے کو بلوچ وطن دوست قوم دوست اور جنگجو بہادروں نے مرو یا مرجاؤ کی پالیسی پر لڑی جس کا اظہار اس کے بیان کردہ شعر سے واضح طور پر عیاں ہیں۔

ایک اور جنگ مہراب خان نے بھی انگریز سے اسی انداز و حکمت عملی سے لڑی۔

کوہنگ ءِ کوہیں قلات

کسی پت ءِ میراث نہ انت

ماگوں سگاراں گپتگ انت

یہ شعر بلوچوں کی اپنی سرزمین سے مرنے وجنون کی حد تک محبت کی عکاسی کرتی ہے کہ ''کوہنگ کا یہ پہاڑی قلعہ کسی کے باپ کا میراث نہیں اسے ہم نے بزور شمشیر تلواروں کے زور پر حاصل کی'' بلوچ اپنے سرزمین اور قومی دفاع کیلئے شہید مہراب خان اور جنگ گوک پروش جیسے لڑائیوں اور معرکوں میں وہی مرمٹنے کی پالیسی پر طاقت قوت کی پرواہ کیئے بغیر طریقے سے لڑی ہے۔ اور شہید مہراب خان کا وہ مشہور مقولہ کہ ''مار نہیں سکتا تو کم از کم مرتو سکتا ہوں'' آج تک بلوچ ہر محاذ، معرکہ، لشکرکشیوں، لڑائیوں اور فوج کشیوں پر انہی روایات و انداز کو اپناتے ہوئے وطن و سرزمین کیلئے قربان ہوتا آرہا ہے۔ لیکن کبھی بھی کسی ظالم و جابر استعماری قوت کے سامنے سرخم تسلیم نہیں کی۔

قدیم زمانے کے عہدی شاعری میں اگر ایک جانب جنگ کے زمانے کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے تو دوسری جانب اس زمانے میں ملک کے سبزہ زاروں اور لہلاتے کھیتوں کے دلکش مناظر کے رنگین نقوش ابھارے ہیں۔

وش ءَ جوان اتنت عہدی دور بلوچانی

سوز اتنت تل ءَ سنج اتنت تازی

سوز انتت میلاد ءِ دپ ءِ شہ جو
چاکر ءِ ہاریں گورم ءَ چھڑتاں

''بلوچوں کا دیس رہائش کیلئے نہایت خوشگوار ہے۔ وہاں کے تل و دمن سرسبز شاداب ہیں اور برق رفتار گھوڑوں پر زین کسا ہوا ہے۔ درہ مولا کی عظیم نہروں نے علاقہ کو سیراب کیا ہوا ہے۔ جہاں چاکر کی گایوں کے گلے چرا کرتے ہیں''۔

سیوی گھوڑی گردابات
دریں گوہر ءِ ارجاں بات
ہپت صد بنگویں ورنایاں
پاگش پہ کہیبے بستاں
بور اِش بے لگام ءَ تاتکاں
آنہہ شہ ایشاں یکے نیست
تھیغی چھڑتغاں ہندی آں
زحمانی رہاں زورنیاں
کل ماں گوہر ءِ ارجان انت

''سیوی گھوڑوں کے گرد و غبار میں اٹی رہے، گوہر سیوی پر نثار جائے، سات سو کڑیل جوان، جو خاص انداز میں پگڑی باندھتے تھے، وہ چابک سوار جو بغیر لگام کے گھوڑے دوڑاتے تھے، ان میں سے کسی کا نشان باقی نہ رہا، ان سب کو ہندی تلواروں کے تیز دھاروں نے کاٹ کے رکھ دیا، سب کے سب گوہر کی قربانگاہ کی بھینٹ چڑھ گئے۔

سولہویں صدی کے اوائل 1548ء کو میر حمل کلمتی مادر وطن کی دفاع کے معرکہ آرائی میں گرفتار ہو کر پرتگیزی لشکر کے ہاتھوں مقید رہے۔ وہ مغربی تہذیب وتمدن اور طرز معاشرے پر اپنے شعر میں یوں اظہار کرتے ہیں''۔

جن پرنگانی حمل ءَ پسند نہ انت
چماں شود انت ءُ نہ حدائی نام ءَ گرانت

نائی چنگالاں گوں مکساں ابرءَ انت
پشک ءِ کھونڈان ءَ ناپگ ءِ کنداش درانت
حمل ءَ ملک ءِ جنک خمار چمیں دوست ترانت
کہ پشک شلوار ءُ سری ءُ چادر انت

''حمل کو فرنگی عورتیں پسند نہیں کیونکہ یہ منہ دھوتی ہیں نہ خدا کا نام لیتی ہیں، ان کے لمبے لمبے ناخن درندوں کے پنجوں کی مانند ہیں، ان کی قمیص گھٹنوں تک ہے اوران کے ناف کے کونے دکھائی دیتے ہیں، حمل کو اپنے وطن کی خمار آنکھوں والی دوشیزائیں زیادہ پیاری لگتی ہیں، کیونکہ وہ قمیص شلوار پہنتی ہیں اوران کے سروں پر دوپٹہ اور چادر ہوتی ہے۔

لوری/لولی:۔(Loli/Lori)

بلوچ معاشرے میں لوری کی بڑی اہمیت ہے۔ بلوچ مائیں اپنے بچوں کو لوریاں سناتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اگر ہمارا بچہ بڑا ہو کر عملی زندگی میں اچھی اقدام کی پاسداری نہ کرے تو وہ اسے اپنا دودھ نہیں بخشیں گے۔

لولی میں ماں اپنے بچے سے امیدیں اور آس لگاتی ہے کہ وہ بڑا ہو کر اچھا انسان بنے گا مثلاً جنگوں میں بہادری کے جوہر دکھائے گا اور شیرازی تلوار استعمال کر کے قابل تعریف کارنامے انجام دے گا۔

زندگی کے جنگل میں
سووروں کے غوغا میں
سووروں کا غوغا ہے
سہمے سہمے بچوں کو
جانے کتنی مدت سے
ننھے ننھے پنجوں کو
میرے شیر بچوں کو
سرخ سرخ نیزوں کی

نیند بھی نہیں آئی
برق برق کڑکڑا اٹھے
شب جس گاہوں میں
صبح کو جگا اٹھے
زخم زخم آہوں میں
عاقبت کے سانسوں میں
مرہمی کراہوں میں
گرم گرم کرنوں کی
چپ کی دندناہٹ ہے
روشنی کے جھرنوں کی
خوف کی آہٹ ہے
شبنمی صباء پھوٹے
اور وقت کی لوری
درد کی صدا ٹوٹے
تیرگی کی راہوں میں
میرے شیر بچے جب
ان کمین گاہوں میں
صبح کو جواب ہوں گے
سوچ بن کے رہتی ہے
زندگی کے جنگل پر
چوٹ بن کے کہتی ہے
کتنے مہربان ہوں گے
میرے پیارے شیر بچے
کتنے اچھے اچھے شیر

(عطاءشاد)

لاڈوگ:۔(Ladog)

بلوچی رسم ورواج کے مطابق لاڈوگ شادی بیاہ ودیگر خوشیوں کے موقع پر گایا جاتا ہے۔لاڈوگ بلوچی لوک گیت کی بے حد مقبول قسم ہے۔

اکثر خواتین تہواروں،خوشی کے موقعوں اور خاص کر شادی بیاہ یا بچے کی پیدائش پر خواتین کورس (ایک ساتھ) گاتی ہیں۔اس میں دلہن کی حیاء،شرافت،خوبصورتی اور دلہا کی بہادری،جرأت ودلیری کا اظہار کیا جاتا ہے۔

یہ رسم بلوچوں کی تاریخ میں قدیم سے جدید زمانے تک چلا آرہا ہے۔اس کے علاوہ شادی بیاہ کے مواقع پر کم جگہوں پر سادگی بھی اختیار کی جاتی ہے۔اب چونکہ شادی بیاہ کی تقریبات کے موقعوں پر مرد وخواتین الگ الگ محفل ومجالس سجاتے ہیں جس میں بلوچی گیت وناچ گانوں کا اہتمام ہوتا ہے۔

سالونک دادے ، مارا خدا دات
دلہا کو دیا ہے ،خدا نے دیا ہے
سالونک پھلے ، چمن ءُ من ءَ دئے
دلہا پھول ہے ، اٹھا کر ہمیں دو
سالونک دیدگے ، پھل ءَ کیسگ ءَ کنت
دلہا ہماری آنکھ ہے اس کی جیب میں پھول ہے

جیسے!

جانم کی راہ میں پڑی دیکھوں
آنگن میں گم سُم بیٹھی ہوں
جانم وہ نڈر، جانباز مرا
وہ تفنگ دلندیزی
کب اس کا نشانہ چوک سکے !
رفتار ہے ایسی شاہانہ

سر کرنے کو جیسے قلعہ چلے
جب آنکھیں گھما کر دیکھتا ہے
اوساں خطا ہوں دشمن کے
اقرار کیا ہے ملنے کا
میں جانتی ہوں بلوچ ہے وہ
اور اپنا قول نبھائے گا

سپت:۔(Sepath)

بلوچی میں سپت کا وہی مطلب ہے جو فارسی میں لفظ صفت ہے جس کا مقصد بلوچی میں خدائے بزرگ و برتر و رسول مقبول حضرت محمدؐ کی تعریف اور حمد وثناء کرنا ہے۔

یہ روایات جدید دور کے ساتھ ہمارے شہری علاقوں سے ناپید ہو چکی ہے۔ جبکہ دیہی (کوہی) علاقوں میں یہ قدیم بلوچی روایات اب بھی برقرار ہے۔ عورتیں رات کے وقت سپت گاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بچے کی پیدائش کے وقت پر کئی دنوں تک گایا جاتا تھا۔ سپت کی خاص ہیئت اور خلاصہ یوں ہے کہ تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں وہی حاکم اعلیٰ ہے۔ تمام تعریفیں خدا اور اس کے رسول کیلئے ہیں۔

سوتا کون ہے۔۔۔؟ جاگتا کون ہے۔۔۔؟

انسان سوتا ہے اور خدا جاگتا ہے۔

ایک خوش آواز خاتون بلند آواز کے ساتھ گاتا ہے و دیگر بہ یک آواز جواب دیتے ہیں۔ یہ دورانیہ رات بھر جاری رہتا ہے۔ صفت کے بول اسی پیرائے میں ہونگیں۔

مئے واجہ خدا انت
محمد مصطفیٰ انت
سپت ءُ ثناہانی خدا لائق انت
خدا لائق انت پہ سپت ءَ وتی
اللہ یا خدا دادانی

چمدارمکن سیادانی
خان ءِ داتگ تنکیں بچے
نازءُ نایابیں آسمی پلے

یعنی میری ایک پیارا بچہ بڑا ہو کر شادی کر کے بہو لیکر آئیگا۔ اسی طرح صوت یا سوت بلوچی کے مقبول ترین گیتوں میں سے ہے اسے بھی شادی بیاہ و دیگر خوشی کے موقعوں پر گائی جاتی ہے۔ یہ کورس کی صورت میں اشتراکی کاموں یا محبت میں گائی جاتی ہے۔

اور اسی طرح ہالو بھی ایک خوشی کا گیت ہے اس کے ساتھ رقص کیا جاتا ہے۔ یہ بچے کی پیدائش اور شادی کے مواقع پر گائی جاتی ہے۔

زہیروک:۔(Zahirok)

زہیر ایک بلوچی لفظ ہے جس کے معنی ہے "یاد آنا" زہیروک اپنے محبوب دوست، بھائی، شوہر اور خاص کر اپنے پیاروں کی دوری اور مدتوں تک نہ آنے پر گایا جاتا ہے۔ زہیروک میں محبت کا پرجوش اظہار ہوتا ہے۔

جیسے!

جدائی پر اپنے دکھ، غم اور تنہائی کو بیان کیا جاتا ہے۔

شاید یہ پر درد نوائیں
غم سے بھیر دولدوز صدائیں
دل کو دکھانے والی گھائیں
جنگ و جدل اور کشت خون
وحشی انسانوں کے جنونِ کی
یا کوئی اور سیدھی سادی
اپنے زمانے کی جگ بیتی
باتیں یہی جانی پہچانی
رنج اور دکھ اور غم کی بانی
جو دل پر نت طاری ہوں گے
آج بھی ہیں اور کل بھی ہونگے

نعتیہ شعر:۔(Natia Shair)

نعتیہ شعر(شئر)مذہبی اور روحانی گیتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں پاک پروردگار اوراس کے رسولؐ کی تعریف وتوصیف ہوتی ہے۔نعتیہ شعر بلوچوں کی مہمانداری، خلوص، محبت اور شاندار کارناموں کی منہ بولتی تصویر ہیں جسے طنبورہ (دنبورگ) پر گایا جاتا ہے۔

مودگ:۔ (Modagh)

مودگ یا موتک یہ غم کا گیت ہے کسی اپنے پیارے کی وفات رحلت پر گایا جاتا ہے۔ جو مسلسل تین دنوں تک جاری رہتا ہے۔عزیز واقاربوں کے علاوہ ہمسائے اورقریب جوار کے خواتین بھی اس غم کے موقع پر ساتھ دیتے ہیں۔

لیکو:۔(Laiko)

لیکو یالانکو جو دیہاتوں اور پہاڑی علاقوں کے اونٹ سواروں کا گیت ہے۔ جو گھروں سے دور صحراؤں میں سفر کے دوران گاتے ہیں۔اوراسے دیہاتی علاقوں میں گانے کے ساتھ ساتھ ایک ساز چنگ میں بھی سریلی انداز میں بجایا جاتا ہے۔لیکو میں اپنے دوست و محبوب سے جدائی کی کیفیت بیان کی جاتی ہے۔

تمہاری یاد ایک طرف تو بڑی خوشگوار ہے
لیکن دوسری طرف دل میں بھی ایک ٹیس لگتی ہے

انداز!

مرادل تھا
کھلے میدانوں میں تنہا اگا پھول
جواب لو سے
جدائی سے مرجھا ہوا پھول

مرادل اب
ہے جیسے بنجر کھیت ویراں
نہیں جس میں
کوئی آثار ہستی کے نمایاں
ڈیہی میں بھی یہی پکارتھا
ایک دن وہ تھا تیرے دیدار سے سرشار
ایک دن یہ ہے کہ دل افسردہ و بے بس ہوں میں

نازینک:۔(Nazenk)

نازینک بھی لولی (لوری) کی ایک قسم ہے فرق یہ ہے کہ اس میں سے (جولا) کے متعلق اور بچوں کے کھیل کود کے گیت بھی شامل ہیں۔مکران کے علاوہ خاران، لسبیلہ کے علاقوں میں گائے جاتے ہیں۔نازینک میں ماں کے علاوہ بچے کی بہنیں بھی شامل ہوجاتی ہیں۔جبکہ لولی کو ماں صرف اکیلئے گاتی ہے۔نازینک گاتے وقت ڈھولک بجائی جاتی ہے۔

جیسا کہ ماں کہتی ہے!
خدا کرے وہ دن جلد آجائے
جب میرالال پھول سی دلہن بیاہ کر لائے گا
اور دولت کما کرانبار لگا دے گا۔
وہ خراسان سے ایک پودالائے گا
جس میں سونے چاندی کے خوبصورت زیورات اگا کریں گے
جن میں ہیرے اور موتی جڑے ہوں گے

بجاراور پھوڑی:۔(Bejar & Podhi)

بلوچ سماج مین پرکشش و حسین روایتوں کے ساتھ باہمی امداد تعاون کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جواب تک بلوچ سماج کے ساتھ نھتی برابر جڑے ہوئے ہیں۔

بلوچ سماج میں بجار، پھوڑی کی وہی حیثیت ہے جو آج ترقی یافتہ دور میں امداد باہمی کی ہے۔ بلوچ سماج کا کوئی فرد جب اپنے طور پر شادی بیاہ اور اس نوع کے دوسرے ناگزیر اخراجات کو پورا نہیں کرسکتا تو اس کیلئے اُسے قوم اور برادری کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بلوچ سماج کے جس فرد نے جب بجار اور پھوڑی کے نام سے امداد کیلئے قوم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو قوم نے اسے ہمیشہ خوش دلی کے ساتھ لبیک کیا اور حسب حیثیت اس کی اخلاقی مدد کی ہے اور یہ دیہاتی زندگی کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہے۔

حشر اور انگار:۔(Hashar & Angar)

بجار اور پھوڑی کی طرح بلوچوں میں امداد باہمی کی ایک اور رسم بھی موجود ہے جسے مقامی اصطلاح میں حشر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ عام طور پر فصل کی بوائی، کٹائی و تعمیرات تک محدود ہے رضا کارانہ طور پر اجتماعی طور پر حشر کے طور پر درخواست گذار کی مدد کی جاتی ہے۔

حوالہ جات

بلوچی رسوم: عبدالغفار ندیم ماہنامہ احتساب حب، صفحہ نمبر 45-46

بلوچ سماج کے خدوخال: ملک محمد بلوچ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان، صفحہ نمبر 20 شمارہ فروری 2009

باب ششم

اہم تاریخی واقعات

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ واقعات وحالات ہی تاریخ کوجنم دیتے ہیں جوتاریخ کو سنوارنے وبنانے میں اہم ہوتے ہیں۔اوراصل میں یہی عناصر تاریخ کے بنیادی ماخذ ہیکہ ان ہی سے کسی خطے کی تاریخ جنم لے سکتی ہے۔

یہ خطہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب وتمدنوں میں سے ہے جواپنے دامن میں قومی ورثوں مزارات، مقبروں کے علاوہ تاریخی حالات و واقعات پرمبنی قدیم ترین تاریخ رکھتا ہے۔ مکران کی قدیم تاریخ جو پانچ ہزار سے سات ہزار سالوں پر محیط ہے۔ان سچی ومستند تاریخ تک رسائی کیلئے ان حالات وواقعات کا سہارا بھی لیا جاتا ہے جووقتاً فوقتاً اس خطے کے اندر رونما ہوتے رہے ہیں۔اور یہ تاریخ کے نمایاں علامات وعکس ہیں جواس خطے کی تاریخ کے ذکر کے ساتھ مکمل طور پر جڑے ہوئے ہیں۔اوران حالات وواقعات کا تذکرہ ہی اس خطے کی تاریخ کونمایاں کرنے میں مدد دیتی ہے۔

پنجگور کے جدید تاریخ میں اس ارتقائی عمل کے دوران رونما ہونیوالے حالات و واقعات جویقینی طور پراس علاقے کے تاریخ کے نمایاں خدوخال کوظاہر کرنے کے ساتھ قابل غوراورتوجہ طلب ہیں۔جو بہت ہی اہم اورتاریخی اہمیت کے حامل جانے جاتے ہیں۔

ہارءِسال:۔(31جولائی1944)

عام روایت ہے کہ 31 جولائی 1944ء کو پنجگور سمیت مکران میں ایک تاریخی سیلاب آیا تھا۔اِس سیلاب وطوفان نے اس قدر تباہی وبربادی مچائی کہ کھڑی فصلیں تباہ وبرباد ہونے کے ساتھ پوراعلاقہ مہینوں تک سمندرجیسی صورت حال پیش کرتی رہی۔یہ سیلاب اس قدر شدید نوعیت کا تھا کہ اس نے پنجگور کا پرانا نقشہ ہی تبدیل کیا۔جس سے کئی نئے مقامات ووادیاں معرض وجود میں آئیں اوراسی طرح کئی تاریخی وقدیم مقامات کے آثارو

آبادیاں صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ اس سیلاب کی شدت وتباہی و بربادی کا ذکر زبان عام ہونے کے ساتھ ساتھ بلوچی رزمیہ اشعاروں میں بھی ملتے ہیں۔ اس سیلاب کے متعلق مشہور ہے کہ پانی کے ریلے و دباؤ سے نئے مقامات وجود میں آئے جواب تک اسی سیلاب کے نام سے منسوب ہیں۔ ان میں سے ایک پنجگور کا خوبصورت مضافاتی اور دیہاتی علاقہ سہر چیل بھی ہے۔ جو بلوچی کے ایک لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پانی کا راستہ اور (پانی کے دباؤ سے معرض وجود آنے والا علاقہ)۔ سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہارءِ سال سے پہلے دریاء رخشان کی اتنی وسعت اور چوڑائی بھی نہ تھی۔ دریاء کے شمال جنوب میں واقع علاقے وشبود اور سریکوران کے گاؤں بالکل ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح منسلک تھے کہ بلوچی رسم ورواج کے مطابق رات کو ایک دوسرے کو کھانا جسے بلوچی میں (باجی) کہتے ہیں دیتے تھے۔ درمیان میں محظ ایک شیپ (چھوٹا نالہ) تھا مگر اس سیلاب کے دباؤ سے دریاء رخشان مختلف مقامات سے 500 سے 800 فٹ تک وسیع اور چوڑا ہوا۔ جس سے یہ دونوں علاقے کی آبادیاں دور منتقل ہوئیں۔

ہار کی کہانی میری زبان

(اس وقت میری عمر محظ 24 سال تھی اور اب 90 سال کی ایک بہری نابینا عورت ہوں اور الحمداللہ اب بھی زندگی کے تمام تلخ وشیریں یادیں ساتھ لیکر زندہ ہوں۔ ہم ہر سال کی طرح اس سال بھی اپنے کہنیں ہنکین (قدیم گھر) جو دریائے رخشان کے شمال میں باغات میں گری سنگیں قلات نامی مقام پر منتقل ہوئے۔ اس وقت میری شادی کو محظ پانچ سال ہو چکی تھی اور میں دو بچیوں کی ماں بھی تھی اور چھوٹی بچی سکینہ شیر خوار تھی۔ ہمیں اپنی اس جگہ پر منتقلی کو چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک دن اچانک آسمان پر بادل اُمنڈ آئیں ہمیں اس بات کی ہر گز پرواہ نہ تھی کہ اول تو ہماری جھونپڑی کی چھت کافی مضبوط تھی اور باقی بکریوں کو اپنی پرانی مسکن گاہ چھوڑ آئے تھے اور چند بھیڑ بکریاں اپنے عارضی مسکن گاہ میں ساتھ لائے تھے۔ بکریوں کے بھاڑ (واڈ) بھی بنا چکے تھے۔ اور اس سے بڑی بات یہ تھی کہ

یہ ایسے بادل بھی نہ تھے جس سے کوئی خطرہ محسوس ہو۔ میری خاوند سارا دن دریائے رخشان کے کنارے باغات میں کام میں مصروف رہتا۔ اور میں گھریلو کام میں مصروف رہتی۔ چونکہ بڑی بیٹی گراناز عمر میں اتنی نہ تھی کہ کام میں میری ہاتھ بٹاتی پھر بھی اس عمر میں تھا کہ باہرا کیلے کھیل کھود کریں۔ اور چھوٹی بیٹی، جب روتی اسے دودھ پلاتی اور خاموش کردیتی یا سلادیتی ۔ اور یوں پھر میں دوبارہ کام میں مصروف رہتی۔

لیکن میر حیرانگی اس بات پر تھی کہ آج تیسرے دن بھی بادل آسمان پر برابر کے چھائے ہوئے تھے۔ سورج کی روشنی کو دیکھے تین دن ہوئے تھے۔ حسب معمول بجار شام ڈھلتے ہی سر پر بکریوں کے چارے لیکر گھر آتی لیکن آج مغرب ہوتے ہی بادلوں نے اندھیری چادر اوڑھ کر ہر طرف تاریکی کا خوفناک وہیبت ناک منظر پیش کی۔

مجھے زندگی میں کبھی بھی خوف محسوس نہ ہوئی تھی۔ ہم ہر سال ہامین و جوپاگ میں روزی تلاش کرنے جاتے تھے۔ ایسے مقام وجگھوں پر گئے جہاں پر حقیقی معنوں میں خوف محسوس ہوتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی خوف محسوس نہیں کی۔ اور پتہ نہیں آج شام ڈھلتے ہی میرے دل پر ایک خوف کے سائے نے جگہ کی میں اپنے دل کو دلاسہ دیتی رہی مگر نہ جانے کیوں میں اپنے بس میں نہ تھی۔ ہر لمحہ خوف کے سائے میرے دل کے قریب سے قریب ہوتے جارہے تھے۔ ہر لمحہ میرے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔ دل میں بار بار یہ سوال اٹھتا جارہا تھا کہ بجّار ہر وقت شام ڈھلتے ہی گھر میں پہنچ جاتی مگر آج کیوں نہیں......!

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میرے دل ودماغ میں سوالوں کا طوفان جگہ کرتا گیا۔

اور میں نے جلد ہی بکریوں کو بھاڑ (واڑ) میں بند کیں اور بڑی خوف ودہشت میں اپنی جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ مگر میری چھوٹی بچی......اور گراناز،، مکمل طور نظروں سے اوجھل،،، میری نظریں اندھیرے میں بڑی تجسس سے انہیں ڈھونڈنے لگی۔ مگر نظریں جہاں پر پڑتی تو تاریکی ہی تاریکی نظر آتی۔ میں حیران تھی اور بار بار دل سے کہہ رہی تھی کہ میں آگ جلائے بغیر باہر کیوں گئی،، اے خدا،، میری بچیاں......

میں نے اپنی دونوں ہاتھ سر پر اٹھائے شدید غم کی کیفیت میں گرا آنکھوں میں بھری آنسو لیکر گدان کے آنگن میں کھڑی ایک مردہ جسم تھی۔ تاریکی اور خاموشی نے پوری گدان جگہ کر رکھی تھی کہ اچانک مجھے میری کانوں پر تیز سانسوں کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی تو میں نے اپنی تمام تر توجہ سننے پر مرکوز کی اور اپنی بے قابو سانسوں پر قابو کرنے لگی تا کہ اپنی بچیوں کو اسی ذریعہ سے تلاش کرسکوں۔

اچانک کانوں کے پردوں کو پھاڑ دینے والی ایک تیز آواز نے پورے جسم کو جھنجوڑ دیا۔ ایسا لگا کہ سر سے پاؤں تک جسم کے تمام رگوں میں گرم خون جم گیا ہو اور دل نے دھڑکنا بند کیا ہو۔ اور میں نے ایک بے روح جسم کی مانند آنکھیں کھلی رکھی۔ اسی دوران آسمان پر گروک (گرج چمک) نے تمام دریائے رخشان کے کناروں کو روشن کردی جس پر میری آنکھ پڑسکتی تھی، خوب نظر آئی،، اس پر اچانک میری نظریں میری دونوں بچیوں پر پڑی جو جھونپڑی کے آنگن میں انتظار کرتے کرتے بھوکے سو گئے تھے۔ یہ روشنی میری زندگی کے کسی بھی خوش کن ترین لمحوں سے ہرگز کم نہ تھی۔ میں نے جلد ہی ہمت کر کے اپنے دونوں لخت جگر کو دبوچ لی۔ اور ان کے گرم سانسوں سے اپنی جسم کے یخ بستہ رگوں کو گرمی دیتی رہی۔ مگر پوری رات میں اپنے خاوند بجار کی انتظار میں راہ تھکتی رہی۔ لیکن ہر لمحہ انتظار دم گھوٹتی ہوئی گزر جاتی۔ آخر تمام رات میری آنکھیں کھلی رہی۔ کبھی بادل کے خوف دل چیر کر گرجتی اور آسمان پر چمکتی ہوئی روشنی زمین کے دامن میں بجلی برساتی رہی۔ آخر رات ہے اُسے منطقی انجام تک پہنچنا تو تھا۔ قریباً رات کا ایک حصہ گزر چکا تھا کہ میری جھونپڑی پر برسات کے ٹپکنے کی آواز آئی۔ یہ آواز میری خوف کی شدت میں اور اضافہ کرتی رہی چند لمحہ گزرے کہ ٹپکنا تیز بارش میں تبدیل ہوا اور محسوس ہوئی کہ یہ بارش نہیں بلکہ ایک دریاء نما پانی ہے۔ جو میری جھونپڑی پر بہہ رہی ہے۔ ہر طرف شور ہی شور تھا اس شور میں میری دونوں بچیاں جاگ گئیں۔ اور زور سے رونے لگیں۔ میں بے بس ولا چار صرف دل میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتی رہی۔

صبح روشنی کی کرنیں جب دریائے رخشان پر پڑیں تو میری کھلی آنکھوں میں ہر طرف سمندر کا نظارہ تھا۔ مگر بارش تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

دریائے رخشان میں سیلابی ریلے اور لہریں سر اٹھائے خوفناک آواز سے دھاڑ رہی تھی۔ اور ہم سیلابی ریلے اور طوفان میں گرے جھونپڑی میں آہ وزار کر رہے تھے۔ ہر لمحے کے ساتھ کافی پریشانیاں بڑھتی گئی۔ اوّل تو میری بچیاں بھوک سے بلکتے جارہے تھے اور دوئم بجار کا کوئی حال واحوال نہ تھا۔ بس میں کیا کرسکتی تھی،،،،،،؟۔

ایک بے بس و لاچار عورت تھی جو بس اللہ تعالیٰ کے آسرے پر تھا، آنسو بھری آنکھوں سے بار بار خداوند کریم کو یاد کرتی رہی اور پانی کے تھمنے اور کم ہونے کی انتظار کرتی رہی۔

یہ مشکل ترین ایام لمحوں سے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ زندگی کی امیدیں چھوڑ چکی تھی۔ لیکن سب اللہ کی مرضی......ہم تین دنوں تک اس سیلابی پانی میں گرے رہے۔ تیسرے دن بعد جن لوگوں نے دریائے رخشان کے کنارے بلند مقامات، درختوں کے ٹہنیوں اور کھجور کے درختوں پر چڑھ کر زندگیاں بچائے تھیں ان میں سے ایک بجار بھی تھا۔ اور یوں چوتھے روز زندگی کی علامتیں آہستہ آہستہ نمودار ہوئیں۔ میں زندگی میں ان لمحوں کو کبھی بھی بھول نہیں سکتی جس میں ہم نے ہر لمحے موت کی آغوش میں رہ کر زندگی کی جنگیں لڑی۔

(ن ح)

بلوچی کتاب میراث سے لی گئی طوفان کے متعلق وہ شعر جو طوفان (ہار) کی تباہ کاری و بربادی کی کیفیات کو چند مصرعوں سے ظاہر کرتی ہیں۔

ھارءِ لچہّ

بازیں ھکل ءُ نھیب ات کوش اتاں ءَ کش اتاں بارگراں
سھبت ءُ چاپ ات چوگروکاں مسل ءِ آس ءُ انگراں
ترمپ رتک انت بےھساب ءَ ترھک ءُ ترھک انت مرواں
زلزلہ، باگلگلہ گویم بروز مھشر اں
کچتگ تو پان چارکنگ ماندات نوحی فراں
گرگ ءُ میش، گربہ ءُ موش، آدمی ءُ سوس ءُ مار
مدعی با مدعی ھچ ءَ نہ کت گپ ءُ گزار
چو جھارزی مرکباں وشبارات انت تاکنٹ ءُ دار
جا گھے بر پشت ءِ آدم، گاہے آدم شد سوار
پہ ھمک ترزءَ بہ رپت انت تاں دودلیل ءُ سے نھار
درسیم روچ ءَ کت انت مردگ ماں دریا یا پتار
یک علامتے بہ رست انت ماں ورایت آشکار
مغرب تاں مشرق تمام تاں یمیں ناں یسار
توشہے پگر کن بہادراست انت ترامرگ ءِ سفر
دستاں برزے ءُ دارءُ دعا کن نزشاھیں معتبر
قبرءِ ایں مکین بگر دین ماں مدینہ نامہ ور

وباءِ سال:۔(ستمبر/اکتوبر 1960ء)

جس طرح کہ ہر علاقے اور خطے کی مختلف حوالوں سے تہذیب وتمدن، ثقافت، قدیم و جدید تاریخی مقامات ونوادرات اوراہم تاریخی واقعات سے ایک خاص پہچان و شناخت ہوتی ہے۔تو اسی طرح وادی پنجگور کی تمام تر تاریخی لمحوں اور دل و دماغ میں نقش المناک واقعات میں سے ایک وباءِ سال یعنی (متعدی بیماری) کا سال ہے۔ اسے کئی دہائیاں گزرنے کے باوجود اب بھی عمر رسیدہ مرد اور خواتین اشکبار آنکھوں سے اس تاریخی لمحات کو یاد کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ ستمبر، اکتوبر 1960ء کی پہلی دہائی میں ایک متعدی مرض نے اس پورے علاقے کو دیکھتے ہی دیکھتے موت کی آغوش میں لیجا کر غضبناک تباہی و بربادی مچائی تھی۔ اس بیماری سے قلیل مدت میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ لقمہ اجل بن کر موت کے منہ چلے گئے تھے اور علاقے کی تمام تر آبادی اس قدر متاثر ہوئی کہ وباء کے جراثیم ایک جگہ سے دوسری جگہ جنگل کے آگ کی طرح تیزی سے پھیلتی گئی جس سے پورا علاقہ زیر اثر رہا اور یہاں تک کہ لوگ بے گور وکفن تک ہوئیں۔

اس وبائی امراض سے پنجگور کے دو اہم علاقے خاص کر عیسیٰ اور بونستان زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ جہاں پر صحت وصفائی اور نا قابل استعمال پانی کے استعمال سے زیادہ اموات ہوئیں اور جس سے متعدی بیماری تیزی سے پھیلتا گیا۔ یاد رہے کہ بعد میں ان مذکورہ علاقوں سے صاف پانی کی عدم فراہمی پر بعض دیہاتوں سے لوگ نقل مکانی تک کرنے پر مجبور ہوئے۔

اس المناک واقعے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تمام تر اموات ہیضے کی بیماری سے ہوئے تھے۔ صحت وصفائی، ادوایات، ٹرانسپورٹ اور مواصلات کی عدم دستیابی نے پنجگور کی ایک تہائی آبادی کو شدید متاثر کی۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس المناک موقعے پر لوگ بیماروں اور لاشوں کے پاس جانے سے کتراتے رہے تو بعض ایسے انسان دوست اپنی زندگیوں کی پرواہ کئے بغیر بھرپور خدمات سرانجام دینے سے پیچھے نہ ہٹے۔ جن کا ذکر آج

تک انسان دوستی اور پنجگور کے خدمت کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک حاجی عزّت نامی شخص بھی تھا۔ جس نے اس موقع پر قابل ذکر تاریخی کردار ادا کیا تھا۔ یوں کثرت اموات سے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ملنے و تیمارداری اور کفن و دفن سے بھی کتراتے رہے۔ تو اس دوران حاجی عزّت نے اپنی انسان دوستی، خدادوستی اور پنجگور کے فرزند کا حقیقی حق ادا کرتے ہوئے بلاخوف خطر کمربستہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی اس شفیقانہ وانسان دوستی کے بدولت ایک طویل عمر بخش دی۔ وہ ایک سو پنتیس 135 سال کی عمر میں وفات ہوکر پنجگور کی تاریخ کا طویل عمر پانے والے انسان کا اعزاز حاصل کر گیا۔

یہ اپنے اعتبار سے عجیب وحیران کن ہے کہ جو لوگ اس ناگہانی موقعے پر موت سے چھپ کر بھاگتے رہے اور انہیں موت آتی گئی اور جو موت سے آنکھیں ڈال کر موت سے لڑ کر زندگیاں بچانے اور خدمت کرنے میں مشغول رہا مگر موت چھو کر بھی ان کے ہاں نہ گزر سکی۔

☆

گرمپکے پر نام لکوسیہ تپیں بوتیں پدا
سیزدہ ھشتاد ہجری کپت وباپے ناگتہ
ھر کجا دیے تہار کت بازے کت چتر پتا
گپت ئے لاھور تا بہ کوئٹہ گوست چہ مستونگ بے نپ ءَ
چہ بلوچستان ءَ پنجگور بوت بلاہانی دپ ءَ
مرکزئے گپت ماں بُنستان مانے شانتیں ھر گورا
شست ءُ ہفتاد تا نود شتِ یکپرا

مولانا عبدالحق حقانی

برف ءِ سال:۔(30/31 جنوری 1971ء)

7 فروری 1970ء کا دن پنجگور کی تاریخ میں ایک یادگار تاریخی لمحے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ برف ءِ سال جو ایک بلوچی کا لفظ ہے جس کے معنی ''برف کا سال'' اسی سال پنجگور میں ایک ہفتے تک تواتر کے ساتھ برف باری میں قریباً چھ سے سات فٹ برف پڑی تھی۔ اور اس کے بعد موسم سرما کی مشہور ہوا جسے مقامی زبان میں گوریچ (Gurech) کہا جاتا ہے نکلنے سے اتنی زیادہ سردی پڑی کہ لوگ مہینوں تک گھروں میں محسور رہنے پر مجبور ہوئیں۔ اس سال کو پنجگور کے عوام آج تک تاریخی طور پر یاد کرتے ہیں اور یہ پنجگور کے تاریخ کے ساتھ مکمل طور پر جڑی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگ دس دنوں تک سورج کی روشنی سے محروم رہے تھے اور سورج دس دنوں بعد نظر آئی تھی۔

پنجگور کے تاریخ میں ماضی حال میں رونما ہونے والے واقعات میں سے برف ءِ سال کے واقعات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ دیگر اہم تاریخی واقعات کے نسبت سے اس تاریخی لمحے کو کثرت سے یاد کی جاتی ہے۔ اِس تاریخی واقعہ کے بار بار ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس علاقے کے عوام کے دل ودماغوں میں کتنی ضبط ہو چکی ہے۔

پرانے زمانے کے اہم قصّہ کہانیوں کو تواریخ اور ایاّم کے ذکر کرنے کے بجائے آج تک اسے برف ءِ سال کے واقعات سے منسوب کر کے کہنے کی روایت عام ہے۔ حتی کہ اپنے بچوں کی پیدائش، اموات، دیگر خوشی، غموں کا ذکر برف ءِ سال سے باقاعدہ منسوب کر کے کہنے کی روایات بھی پنجگور میں عام ہے۔ اور پرانے زمانے میں لوگ اپنے بچے اور بچیوں کے نام اسی واقعہ سے منسوب کر کے رکھتے رہے ہیں مثلاً اب بھی برپو، برپیں برپک جیسے لڑکے لڑکیوں کے نام تک اسی سال کے مناسبت سے رکھے جاتے ہیں۔

☆

باب ہفتم

اہم تاریخی مقامات (Important Places)

پنجگور کے اہم تاریخی مقامات جو کہ زیادہ تر مذہبی دور ہی کے علامات ونشانات کے طور پراس خطے کی قدیم وتاریخی اہمیت کواجاگر کرتی ہیں۔ بہت ہی قدیم وتاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ بہت سے مقامات سے آثار قدیمہ کے ماہرین کی کھدائی وتحقیق میں ایسے آثاروعلامات ملے جوکہ قبل مسیح کے زمانے کے بتائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہاں پر مزید تحقیق وکھدائیوں کی ضرورت ہے تاکہ اس خطے کی مکمل قدیم تاریخ، تہذیب وتمدن بہتر انداز میں اجاگر ہوسکیں۔

شاہوقلندر:۔(Shaho Qalander):

شاہوقلندر کا مقبرہ یونین کونسل چتکان (شاپاتان) میں دریائے رخشان کے ساتھ بالکل جنوب میں واقع ہے۔ یہ مقبرہ ایرانی وترکی طرز تعمیر کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں اینٹیں خوبصورتی اور بہت بڑی مہارت وکاریگری کے ساتھ استعمال کی گئی ہیں جو اس زمانے کی ہنروکاریگری وشاہکارانہ فن کی واضح نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ باہر سے ایک خوبصورت و چھوٹا سے قلعہ اور اندر سے ایک کشادہ مکان جیسا ہے جس میں باقاعدہ طور پر بالا خانے و قبریں موجود ہیں۔ البتہ قوی اندازہ یہی ہے کہ یہ تیرہویں صدی کے دہائی کے ادوار وزمانے کے وقت کے ہوسکتے ہیں۔

لیکن شاہوقلندر کا مقبرہ وقت کے ساتھ اپنی قدیم شکل وصورت اور اپنی پرانی حالت میں برقرار نہ رہ سکی ہے۔ قدیم زمانے میں بیرونی حصے میں جو اینٹیں استعمال کیئے گئے تھے ان میں مختلف جانوروں کے خوبصورت تصاویر بڑی کاریگری وہنرمندی سے نقش تھیں۔ ان سے بخوبی یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس زمانے میں اس طرح کے تصاویر محض زرتشتی یا آتش پرست مذاہب کے لوگ استعمال کیا کرتے تھے۔ تو اس سے یہ گمان مزید پختہ ہوگا کہ اس

زمانے اس علاقے میں لوگ اسی مذہب کے پیروکار رہے ہونگیں۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود پنجگور کے بہت سے قدیم مقبروں، مزاروں اور قلعوں سے اسی طرح کے نقش نما اینٹیں ملی ہیں جو اس گمان و شک و شبہ کو تقویت دیتے ہیں کہ بادشاہ اور حکمران انہیں خوبصورتی اور تزہین وآرائش یا مذہبی عقیدے کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔

شاہوقلندر کے متعلق مقامی لوگوں سے بہت سی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ان میں سے ایک یہ کہ یہاں تیرہویں صدی کے اوائل میں ایک شاہو نامی سردار کی حکمرانی تھی تو اس زمانے میں ایرانی لشکر بار بار اس علاقے پر حملہ آور ہوکر تخت و تاراج کرکے لوٹتا تھا اور خواتین کی بے حرمتی تک کرنے کو نہیں کتراتا تھا۔ یاد رہے کہ اس علاقے پر گجر (قاچار) لشکر کے لوٹ مار و حملے کی کافی روایات بھی ملتی ہیں کہ اس دور میں جب شاہو نامی سردار کی پنجگور پر حکمرانی تھی تو اسی دوران شاہو کو اطلاع ملی کہ گجر ایک بڑا لشکر لیکر پنجگور کو لوٹنے اور تخت وتاراج کرنے کیلئے آرہا ہے۔ چونکہ اسے اپنی عسکری وفوجی قوت و طاقت پر پختہ یقین تھا کہ وہ مقابلے و جنگ کی سکت وقوت نہیں رکھتی تو وہ اپنے خواتین کی بے حرمتی کے خوف سے انہیں اسی قلعہ میں زندہ دفن کرکے خود اپنے ساتھیوں کے ہمراہ علاقہ بدر ہوجاتے ہیں ۔اورانہوں نے اپنے خواتین کی عزت وآبرو کی خاطر اس مشکل فیصلے کو اپنی عافیت سمجھی۔ کچھ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ان کے مذہبی عقیدے میں خودکشی کرنا یا مشکل حالات میں زندہ درگور ہونا جائز تھا۔اسی نکتہ نظر سے انہوں نے اس طرح کا ایک بڑا و تکلیف دہ قدم اٹھایا ہوگا۔لیکن دوسری جانب اس خطے کی تاریخ کے بغور مطالعے سے یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس خطے میں قدیم عہد سے عزت وغیرت پر لڑنے اور مرنے کی عظیم روایات عہد بہ عہد تاریخ کو سنہری وتابندہ کرتی رہی ہے۔ بہرحال تحقیقی وعلمی اور ذہنی نکتہ نظر سے اس سے زیادہ اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے خواتین اور بچوں کی عزت وعظمت کو برقرار رکھنے کی خاطر اس طرح کے ٹھوس ومشکل قدم اٹھانے پر مجبور ہوئے ہونگیں۔

جبکہ شاہو قلندر کے متعلق مقامی طور پر لوگوں سے ایک الگ روایت ماخوذ ہے کہ شاہو قلندر کے مقبرے کے اندر بڑے بڑے تہہ خانوں کی موجودگی پر جب لوگوں میں تجسس ہوئی کہ اس مقبرے کا باقاعدہ معائنہ ہو تو چند لوگوں نے تہہ خانوں میں جانکنے کی کوشش کی۔ جس میں مزید تہہ خانوں کا انکشاف ہوا کہ اس میں ایک وسیع تہہ خانہ موجود ہے۔ جس میں ایک آدمی کو داخل کیا گیا تو اس سے اخذ ہے کہ جب مجھے تہہ خانے کے اندر رسیوں سے اتارا گیا تو تہہ خانے کے اندر اس قدر اندھیرا تھا کہ مجھے اندر کچھ نظر نہ آئی اور مجھے سخت خوف محسوس ہوئی تو میں نے اپنے دوستوں کو آواز لگائی کہ یہاں کافی وحشت و تاریکی ہے، مجھے باہر نکالو۔ لیکن دوستوں نے اصرار کی کہ آپ چراغ کی روشنی سے دیکھ لیں۔ جب میں نے ادھر ادھر دیکھا تو مجھے انسانی ڈھانچے باترتیب پڑے نظر آئیں اور ایک ڈھانچے کے گلے سے ایک تکونی تعویز ملی جس کا دھاگہ بالکل گل سڑ چکا تھا اور یہ سلور نما ڈبہ تھا۔ میں اسے اٹھا کر جب باہر پہنچا تو دوستوں کو اندر کی ساری روداد سنائی اور چاندی کے ڈبے کے تعویز ہاتھ میں تھما دی۔ ہمیں امید تھا کہ اس تعویز کے ذریعے کچھ نہ کچھ معلومات ملیں گے۔ لیکن جب چاندی کے ڈبے کا خول کو کھولا گیا تو بڑی افسوس ہوئی کہ اس میں پڑی تعویز مٹی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

شاہو قلندر کے متعلق مختلف حوالوں سے بھی اخذ ہے کہ یہ کسی پیر یا فقیر کا مقبرہ ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت میں اسی مقام پر رہا ہوگا۔ مقبرے کی بیرونی طرز تعمیر و گنبد سے بھی یہ اندازہ مستحکم تر ہو سکتی ہے کہ اکثر پیر و بزرگوں کے مزار و مقبرے اسی طرز تعمیر کے ہیں۔ لیکن اس پر حد درجہ مزید تحقیق و تجسس کی ضرورت ہے۔

چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مقامی لوگوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ چند قبروں کی اینٹیں گرنے سے اندر کچھ نظر آرہا ہے تو لوگوں نے باقاعدہ طور پر ان قبروں کے سوراخوں سے مشاہدہ کیا تو انہیں یہ قبریں صحیح و سلامت اور خواتین کپڑوں میں ملبوس نظر آئے جو بعد میں ان

قبروں پر دوبارہ اسی طرح اینٹیں رکھے گئے۔

اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت شہباز قلندر دشت شہباز سے ہوتے ہوئے لوگوں کے اصرار پر اس مقام پر کچھ وقت کے لئے ٹھہرے تھے۔ جو تقریباً تین چار مہینوں تک اسی مقام پر اسلامی تعلیمات دیتے رہے اور بعد میں اس جگہ پر مقبرہ تعمیر کی۔ جسے شاہو قلندر کے نام پر منسوب کیا گیا۔ بلوچی میں قلندر درویش یا فقیر کو کہا جاتا ہے اسی مناسبت سے بعد میں یہ نام اسی کے نام پر منسوب رہا۔ البتہ اس پر مذید تحقیق کی ضرورت ہے۔

پیر عمر:۔(Peer Umar):

پنجگور سے کافی زمانوں تک پیر عمر کے مزار سے دین اسلام کی تبلیغ واشاعت ہوتی رہی ہے۔ چونکہ پرانے زمانے میں اس علاقے میں ایک اہم مزار پیر عمر کے نام پر کافی مشہور تھا۔ جہاں پر ہر وقت عوام اور خاص کر فریادیوں ومنّتیں رکھنے والوں کا کافی ہجوم لگا رہتا تھا جو اپنی منتیں پوری کرنے آتے تھے۔ پیر عمر کا مزار پنجگور کے جنوب مشرق میں 10 دس کلومیٹر پر ایک وسیع میدانی علاقے میں واقع ہے۔

پیر عمر کو پنجگور کی تاریخ میں اپنی اولیانہ صفات و بزرگی اور درویشانہ صفتی و بزرگی کے سبب کافی عزت واحترام دی گئی ہے۔ ماضی بعید سے تاحال اس مقام کو جہاں پر پیر عمر کی عبادت گاہ ومسکن گاہ تھی بڑی اہمیت اور فضیلت دی جاتی ہے۔ چونکہ پیر عمر کی ہجرت اور وفات کے بعد درگاہ پران کے پیروکاروں مریدوں اور عوام کی ہجوم رہی تو اس دوران مزار کی دوبارہ تعمیر وتزئین کی گئی تو یہ مقام مستقلا پیر عمر کے زیارت گاہ کے طور پر کافی مشہور ہوا۔

علاوہ ازیں یہ قابل غور ہے کہ پیر عمر کے زیارت گاہ اور مسجد کے اندر بڑے بڑے پتھروں کے کتبے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ ان بڑے پتھروں کے کتبوں پر فارسی اور عربی کے واضح عبارات تحریر ہیں۔ دو بڑے پتھروں پر فارسی اور عربی زبان میں میر محمد علی گچکی 1213 ھجری تحریر ہے۔

پیر عمر کے مزار کے اندر چھوٹے بڑے کتبے موجود ہیں جو کہ اندازہ ہے کہ یہ کسی اور جگہ سے لائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان پر گچکی خاندان کے بہت سے مرد اور خواتین کے تاریخ و پیدائش اور وفات کندہ شدہ موجود ہیں جو واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ان پر بعد میں جلی حروف میں آیا ئیں کندہ کی گئی ہیں۔ اغلب ہے کہ گچکی خانوادوں کے قبروں سے اٹھا کر یہاں لائے گئے ہیں اور پھر یہاں کیلئے استعمال ہوئے ہیں۔

لیکن اس سے قطع نظر حتمی طور پر پیر عمر کے بارے میں کوئی خاص رائے پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ البتہ اس سے یہ گمان مستحکم ہوگا کہ یہ حلیفہ حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں یا اس کے بعد مکران میں کسی مہم یا لشکر کشی کے دوران اس علاقے میں آ کر مقیم ہوئے تھے اور پنجگور کے اس مقام پر دین اسلام کی اشاعت اور اللہ تعالیٰ کی عبادت وریاضت میں مشغول ہو کر کافی وقتوں تک اسی مقام پر قیام پذیر رہے ہیں۔

بعد میں یہ پرہیز گار متقی اور دور اندیش صفت انسان خضدار سے چند کلومیٹر دور آر سی ڈی روڈ کے کنارے سمان کو اپنا مستقل و آخری آرام گاہ بنا کر وہی پر وفات ہوتے ہیں۔

انکی آخری آرام گاہ پر اسی طرح مزار تعمیر کی جاتی ہے جس کے ساتھ ایک بڑا پانی کا چشمہ بھی ہے جس طرح پنجگور کے مزار کے ساتھ ہے۔

علاوہ ازیں تاریخی حوالے سے اخذ ہے کہ ایک بزرگ حضرت عمر بن مرطفہؒ نے دعوت اسلام کی اشاعت کیلئے پنجگور آئے تھے۔ لیکن ناخواندگی جہالت سے ان کے آمد کی صحیح تاریخ بیان نہیں کی جاسکتی پھر بھی کچھ شواہد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پنجگور میں سولہویں صدی کے ابتدائی دور میں آئے تھے اور آبادی سے دور ایک ویران میدانی علاقے میں مستقل مسکن بنا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت و ذکر میں مشغول رہے۔ جب یہ خبر لوگوں تک پہنچی تو وہ ان کی درویشانہ و بزرگانہ صفات سے متاثر ہو کر ان کے گرد جمع ہونا شروع ہوئے۔ بعد میں یہ علاقہ ان ہی کے نام سے منسوب ہوا۔ چونکہ اس جگہ پر پانی کی شدید قلت تھی تو ان کے مریدوں نے پانی کے طلب کیلئے درخواست کی روایتوں کے مطابق انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک لکیر کھینچی تو اس مقام سے دیکھتے ہی دیکھتے پانی کا ایک بڑا چشمہ امڑ آیا۔ پانی

اس مقدار میں دستیاب ہوئی کہ اس زمانے میں باقاعدہ طور پر اسے زرعی مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا جاتا رہا۔

لوگ اس کی پرہیزگاری و نیک سیرتی اور اللہ تعالیٰ سے لگاؤ اور جذبے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے پیروکاروں اور مریدوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور جلد ہی اس مقام کے قریب ایک بڑی آبادی ہوئی اور بعد میں اس کے قرب و جوار کی آبادی کو زیارتی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اور اب بھی علاقے میں زیارتی کے نام سے ایک قبیلہ موجود ہے۔ جب آبادی میں روز بروز اضافہ ہوا تو چشمہ کے پانی پر تنازعہ ہوا تو قدرتی طور پر پانی ایک دائرے میں محدود ہوئی جس میں بہنے کی سکت وقوت باقی نہ رہی۔

بعد میں حضرت عمر بن مرطفہ پنجگور سے ہجرت کر کے خضدار کے علاقے سمان کے مقام پر دعوت اسلام کی خاطر گئے اور وہیں پر وفات ہو کر وہی دفن ہو جاتی ہیں۔ ایک دوسری روایت کے مطابق انہوں نے اپنے مریدوں و مرشدوں کو نصیحت کی کہ میری میت کو اونٹ پر باندھ کر چھوڑ دو جہاں یہ اونٹ رک جائے وہی پر میری آخری آرام گاہ ہوگی۔ اِن تمام حوالوں سے قطع نظر یہ یقینی ہے کہ وہ بعد میں پنجگور سے ہجرت کر کے خضدار کے علاقے سمان میں مستقل مقیم رہے۔ مزار پہاڑی سلسلوں اور ندی نالوں کے بیچ میں گرا آرسی ڈی روڑ کے کنارے پر واقع ہے۔ مزار کے قریب پانی کا چشمہ اور گنبد موجود ہے جسے پیر عمر کے مزار کے طور پر جانا جاتا ہے۔

پنجگور کے عوام آج بھی پیر عمر کے مقام پر زیارت کیلئے جاتے ہیں۔ اور اس بزرگ سے والہانہ محبت و عقیدہ رکھتے ہیں حتیٰ کہ پرانے زمانے میں اپنے بچوں کے نام تک اسی پیر سے عقیدت و احترام کے طور پر پیر جان، پیر بخش، پیری وغیرہ رکھتے رہے ہیں۔

دشت شہباز :۔(Dasht Shahbaz):

دشت شہباز کا علاقہ کوہ بن کے ایک میدانی جگہ میں واقع ہے۔ چونکہ بلوچی میں دشت بے آب وگیاباں میدانی علاقے اور شہباز بڑے بزرگ وصوفی کو کہا جاتا ہے۔اور اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ شہباز قلندر (سیون) حضرت عثمان مروندویؒ اسلام کی اشاعت وتبلیغ کیلیئے اسی مقام پرآیا تو لوگوں نے جلد ہی بھانپ لیا کہ یہ واقعی اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ اور بزرگ وصوفی ہیں ۔تو لوگوں کے کافی اصرار پر وہ کئی مہینوں تک اس مقام پر رہے۔ جسے آج تک دشت شہباز کے نام سے پکارا جاتا ہے۔حضرت عثمان مروندویؒ پنجگور سے ہوتے ہوئے آخر میں سکھر (سندھ)سیون کے مقام تک پہنچے ہیں۔

دشت شہباز کا علاقہ شہباز قلندر سے منسوب ہے۔''شاہ قلند'' خطاب کا اشارہ حضرت لعل شہباز قلندر کی سوانح عمری میں بھی ملتا ہے ۔ان کے ایک سوانح نگار الحاج شاہ مانا صاحب قادری لکھتے ہیں'' آپ کے والد سید کبیر نے خواب میں دیکھا کہ قلندروں کی ایک جماعت دف بجا کر گا رہی ہے اور بلند آواز سے کہتی جاتی ہے کہ سید کبیر کا بیٹا قلندروں میں ''امیر قلندر'' ہوگا کچھ عرصہ بعد آپ پیدا ہوئے تو آپ کے والد نے گھوارہ میں آپ کی حرکات وسکنات کو دیکھ کر یقین کرلیا کہ میرا خواب سچا تھا اور اس بچے میں ابھی سے قلندرانہ رنگ دکھائی دے رہا ہے''۔

حضرت لعل شہباز قلندر جن کا اصل نام سید محمد عثمان حنفی تھا۔آپ آزر بائیجان کے صدر مقام تبریز کے ایک گاؤں مروند میں 573 ھجری بمطابق 1177 عیسوی میں پیدا ہوئے بعض کتابوں میں 583 ھجری اور بعض میں 538 ھجری بھی لکھا ہوا ہے۔

حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی نے خواب میں آپ کو سندھ جانے کی ہدایت کی چنانچہ آپ مکران کے راستے سندھ کے لئے روانہ ہوئے ۔پنجگور کے سیدان دشت کے مقام پرآپ نے چند عرصہ قیام فرمایا۔ وہ جگہ پھرآپ کے نام دشت شہباز سے مشہور ہوگیا۔

آپ کی عقابی شخصیت اور کرامات کو دیکھ کر بلوچوں نے آپ کو''شہباز'' کہا وہ عقیدت ومحبت سے آپ کو لعل کہا کرتے تھے۔

اس طرح پنجگور کی سرزمین میں سے لعل ''شہباز'' کا بلوچی خطاب آخر دم تک آپ کے نام کا لازمی جز بنا۔

نیز یہ بھی ثابت ہے کہ مکران وارد ہونے سے پہلے آپ کے نام کے ساتھ امیر قلندر اور شاہ قلندر مستعمل تھا۔

آپ 263-64 عیسوی میں سندھ تشریف لائے اور سیوستان (سیوھن) میں قیام پذیر ہوئے۔ جہاں آپ نے 1274-5 میں وفات پائی۔

کمبر دمب :۔(Qamber Dumb)

گچک کے مقام پر ایک گنبد کے آثار ہیں جو کہا جاتا ہے کہ یہ عظیم بلوچ جنگجو میر کمبر کے ہیں۔ جواب کافی منہدم ہو چکا ہے اور اب صرف نام ہی باقی ہے لیکن اب بھی اس جگہ کو کمبر دمب کہا جاتا ہے۔ جب میر کمبر اپنے جنگی مہموں کے دوران ایران سے پنجگور تک آئے تو انہوں نے پنجگور کے ایک دور آفتادہ علاقہ گچک کو اپنا مستقل مسکن بنایا اور ایک قلعہ تعمیر کی اور اپنے زمانے کی ایک مضبوط بلوچی لشکر کے ساتھ کئی وقتوں تک اس مقام پر ڈیرہ جمائے رکھا۔ چونکہ بدقسمتی سے اس علاقے کے لوگوں کی لاپرواہی اور غفلت سے قومی ہیرد کے آثار مٹتے چلے گئے۔ لیکن پھر بھی اس جگہ پر جہاں میر کمبر نے قلعہ تعمیر کر کے قیام کیا تھا اسے کمبر دمب کے نام سے جانا جاتا ہے۔

میر کمبر بلوچ تاریخ کے وہ ہیرو ہیں جسے بلوچ شاعری میں میر چاکر رند کے بعد سب سے زیادہ خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ میر کمبر نے بلوچی تاریخ میں جو مقام پایا وہ اپنی بہادر شمشیرزنی اور اپنے بزرگ باپ کی نیک تمناؤں اور دعاؤں کی وجہ سے پایا تھا۔

وہ ایک عام دیہاتی مگر تلوار بازی میں یکتائے روزگار تھا۔ وہ قرآنی زیور تعلیم سے آراستہ تھا۔ نوجوانی ہی سے اس نے قبائلی جنگوں میں بھرپور حصہ لیا اور اپنے قبائل کا دفاع کیا۔

وہ ایک تجربہ کار اور عاقل دور اندیش شخص تھے۔وہ اس سے پہلے بھی ایسے پیچیدہ حالات کا سامنا کر چکے تھے۔اور ایسی کئی شورشوں کا پوری قوت سے مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کر چکے تھے۔مختصراً میر کمبر وہ عظیم سپوت تھا۔جس کی پوری زندگی رزم آرائی اور جنگی مہمات میں گزری۔وہ آدھے بلوچستان کا فاتح اور مرکزی بلوچستان میں بلوچی حکومت کا معلوم بانی تھا۔جسے جدید بلوچستان کا بانی کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔جس پر بلوچستان اور خصوصاً پنجگور کی سرزمین جتنا فخر کرلے کم ہے۔

میر کمبر نے اپنی عسکری زندگی میں جہاں کئی فتوحات حاصل کی تھیں ان کے ہزاروں دشمن بھی پیدا ہو چکے تھے۔جو ہمیشہ اسی تاک میں رہتے تھے کہ درخشندہ ستارہ ان کے ہاتھ لگے اور اس کے خون سے انتقام کی پیاس بجھائیں۔

ایک موقعہ پر خاران کے جدگالوں نے علاقے میں لوٹ مار اور لوگوں کے مال مویشی لوٹ کر بیسمہ کی پہاڑیوں میں روپوش ہو گئے میر کمبر نے ایک لشکر ان کے پیچھے روانہ کیا۔ لیکن باغیوں نے اپنی طاقت بڑھانے کیلئے دیگر جدگال سرداروں سے مدد مانگی مولا اور زہری سے نہمر دیوں کے لشکر باغیوں کی مدد کے لئے بیسمہ کی پہاڑیوں کی طرف بڑھے جب اس کی اطلاع میر کمبر کو مل گئی تو انہوں نے اپنی ساری مہمیں چھوڑ کر ایک لشکر کے ہمراہ بیسمہ کا رخ کیا۔

بیسمہ کے پہاڑوں میں رئیس اور جدگال لشکروں نے گھمسان کی لڑائی لڑی۔جس میں روایتوں کے مطابق بلوچوں کا یہ بے مثال ہیرو شہید ہوئے۔

جنہیں قریب ہی ایک پہاڑی دامن میں دفن کر دیا گیا۔بیسمہ کے جس ریت کے ٹیلے کے نیچے میر کمبر کی لاش امانتاً دفنائی گئی تھی۔اس ٹیلہ کا نام ''کمبر ریک'' پڑ گیا۔جو کہ ابھی تک اسی نام سے مشہور ہے۔

بلوچ بہادروں کی تلوار کو کمبر کی تلوار سے تشبیہ دیتے رہے ہیں۔جنگوں کے مواقع پر شاعروں نے بلوچ سپاہیوں کو قمبر کی تلوار بن کر دشمن کو کاٹنے کی ترغیب دی ہے۔

کمبر کی دلیری و بہادری کے واقعات اور فتوعات کی داستانیں اور تذکرے آج بھی مکران اور خاص طور پر پنجگور کے بوڑھوں اور بڑوں کے سینوں میں کسی حد تک محفوظ ہیں۔

میرکمبرءِ شئر

میر کمبر ءِ زھم ءِ شروک
مثلے کہ اِستین ءِ گروک
سی مرد دگے دیم ئےِ در اَتک
چہ سیھیناں چاردہ جتگ
چو کوٹگ ءَ کپ ئےِ کُت اَنت
چو تیجگ ءَ چاک داتگ انت
دیم ئےِ نہ دار اَنت پونگری
کوش وار ، ھراکموریں ھَریٔ
ڈن ءَ تچان اَنت شالگوری
جنگ ئےِ جتگ واتر کُتگ
جاگاں پہ فرمان ءِ ھُدا
تیرے منا جمپ ءِ سرءَ
لگ اِت منی میر ءِ دل ءِ۔
پاگ ئےِ لگُشتگ چہ سر ءَ

بُرجی هرُتلگ نر مزار
بنداں هلو هالو گُتگ
میر کمبر اش سالونک کتگ
چنڈینگ ءُ ماتی ستا
آ پاسی شپ ءِ میچینگاں
آ روچ کہ شیر ءَ جنگ کتگ
روباہ ءُ ڈالاں پُل کتگ
بیگاہ ءِ کوش ءَ کش اِتگ
پنچاں کپرگ مان کتگ
میر کمبر ءِ زهم ءِ توار
دهلی ءِ زهم ءِ توار
کشمیر تا بلگ تا کندهار
چانگو تا سیستان هر قدر
شئرے نبشتگ دانشوراں
گوں انت گشوکیں شائراں
شنگ اِنت ماں گُنڈ ءُ کشوراں

ساکائی قلعہ گچک :۔(Sakai Kalat Gichk)

ساکائی قلعہ پنجگور کے شمال میں 90 کلومیٹر دور یونین کونسل گچک میں واقع ہے۔میر ساکا اپنے دور کے ایک مشہور و معروف سردار تھے۔جنہوں نے گچک کے مقام کو اپنا مستقل مسکن بنایا اور ایک قلعہ تعمیر کی جو آج تک ساکائی قلات (قلعہ) کے طور پر مشہور ہے۔اور اس وقت بھی قلعہ کے قرب و جوار کے لوگ اپنے قبیلے کو ساکازئی ظاہر کرتے ہیں۔چونکہ ساکازئی ساسانی دور حکومت کے حکمرانوں کے شجرہ نسب سے ہیں جو مائیگریٹ ہو کر ایران میں بادشاہت کرنے کے بعد میں گچک ،گریشگ کے علاوہ ایران اور افغانستان کے ملکوں تک آباد ہوئے تھے۔انہوں نے اپنا ایک قلعہ گچک ،گریشگ وایران کے علاقے بمپور میں تعمیر کی۔ساجدی قبیلہ اپنے آپ کو ساکائی کے اولاد کے تصور کرتے ہیں۔ابتداء میں یہ زرتشت مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔لیکن بعد میں ذکری اور اب ان میں اکثریت نماز کی جانب راغب ہیں۔

تاریخی شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغلوں کی حملے سے قبل یہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ سکیھتیائی یا ساکاؤں پر مشتمل تھا۔جن کے تاریخی آثار وسطی بلوچستان میں گیر بندوں کے نام سے ہیں اور دور دور تک پائے جاتے ہیں۔وادی مشکے کے ساجدی قبیلہ کی اصلیت بھی ساگاتائی ہے۔اس قبیلہ کا سردار خیل طائفہ ساکازئی کہلاتا ہے اور ایک ممتاز بلوچ قبیلہ تصور کیا جاتا ہے۔ایک اور مورّخ کی نظر میں یہ ایرانی نسل سے تعلق رکھنے والے قدیم صحرائی نسل سیت اور سارمات کی ایک شاخ ہے۔قبائل یوچین کی اس علاقے میں آمد اور ساکا قبائل پر ان کے حملے کے نتیجے میں خانہ بدوش ساکا قبائل کا دباؤ مشرقی یونانی بادشاہوں کے علاقے کی طرف بڑھ گیا جو سکندر اعظم کے جانشین تھے۔ان قبائل نے سندان اور باختران پر قبضہ کرلیا اور یونانیوں کے علاقے میں آباد ہو گئے۔

ساکا قبائل 140، 130 ق۔م کے دوران اس علاقے میں پہنچے اور یوچین قبائل کے دباؤ کی وجہ سے 128-127 ق۔م میں جنوب کی طرف حملہ آور ہوئے۔اس زمانے

میں زرنگیان (سیستان) اور آراخوزی پر فرہاد ثانی اشکانی کی حکومت تھی۔ ساکا قبائل ان علاقوں پر قابض ہو گئے اور ریاست سکستان کا قیام شاہ مہرد ثانی کے دور میں عمل آیا۔ اس وقت یہ ریاست اشکانی سلطنت کی باجگزار تھی۔

سکان سلاطین، ہندوسکائی کے لقب سے معروف ہیں۔ انہوں نے چین میں بھی اس نام سے ریاست قائم کی تھی جس کو کی بین بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دریائے ارغنداب کے علاقے میں واقع تھی۔ دریا ارغنداب دریا سندھ کے زیریں علاقے میں ہے۔

امیر علی محمد خان باران زئی:۔

امیر علی محمد خان باران زئی اپنے دور کے ایک نڈر بہادر بلوچ جنگجو حاکم رہے ہیں۔ اس قبیلے کے افراد بلوچستان کے مختلف اضلاع خاص طور پر سراوان ڈویژن اور دزک اور ایرانشہر ڈویژن کے اضلاع سرباز اور راسک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

بارکزئی قبیلہ متعدد شاخوں اور برادریوں پر مشتمل ہے۔

یہ قبیلہ انفرادی اور اجتماعی طور پر افغانستان سے ہجرت کر کے آیا ہے۔ اس لئے افغانستان کے سیاسی اور اجتماعی معاملات میں ان کے کردار اور ایرانی ساحلی علاقوں میں ان کے تاریخی کارنامے موجود ہیں۔ اس قبیلے نے ایران، افغانستان اور بلوچستان کے بڑے حصوں پر کئی دہائیوں تک حکومت کی ہے۔

امیر علی محمد خان باران زئی نے اپنے دور حکومت میں ایرانی بلوچستان کے مختلف علاقوں میں بڑے بڑے شاہی قلعے تعمیر کروائی۔ قلعہ دزک امیر علی محمد خان بارکزئی کا حکومتی مرکز اور صدر مقام تھا۔ پھر مرکزی حکومت کے فوجی حملے کے بعد یہ ایرانی حکومت کا علاقائی مرکز قرار پایا۔ چونکہ یہاں میجر جنرل داور پناہ مارے گئے تھے۔ اس لئے اب یہ انہی کے نام سے منسوب ہے۔ اس قلعے کے قریب ہی ایک گاؤں ہے۔

جسے اس علاقے کے لوگ ''کوہ مہر جان'' (یعنی پارسیوں کی عید، تہوار یا جشن کا پہاڑ) کہتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کا کہنا ہے کہ اس ٹیلے کے باشندے اسلام سے پہلے زرتشتی (پارسی) مذہب کے پیروکار تھے۔ بارکزئی قبیلے کی حکمرانی رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت میں زوال پذیر ہوئی۔

یوں جب 1339 ھجری بمطابق 1920ء میں سردار بہرام خان کے انتقال کے بعد بلوچستان ایک مرتبہ پھر انتشار کا شکار ہوگیا اور ہر علاقے میں بلوچ سرداروں کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ انجام کار بلوچستان کا انتظام بہرام خان کے بھتیجے اور امیر علی محمد خان باران زئی کے فرزند امیر دوست محمد خان باران زئی کے ہاتھ میں آ گیا۔ امیر دوست محمد خان نے اواخر 1348 ھجری بمطابق 1928ء تک حکومت کی۔ انہوں نے حکومتی اراضی سے حاصل ہونے والی آمدنی کو علاقے کی تعمیر و ترقی میں صرف کی اور تنخواہ دار مسلح فوج کی بھرتی کر کے بڑے پیمانے پر اس کیلئے ہتھیاروں کا بندوبست کیا۔

انہوں نے سراوان کا پانی، کھیتوں اور کھجوروں کے باغات سے مالا مال علاقہ جہاں متعدد مضبوط قلعے بھی تھے۔ اپنے والد علی محمد خان اور بھائی نوشیروان خان کے سپرد کیا اور اس سرسبز و شاداب خطے کی حفاظت اور دفاع کیلئے ایک حفاظتی دستہ بھی تعینات کیا۔

امیر دوست محمد خان کا یہ عزم تھا کہ وہ بالآخر مرکزی ایرانی حکومت کو وسائل سے مالا مال بلوچستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے بالکل روک دیں گے۔ لیکن اس وقت مرکزی ایرانی حکومت بہت طاقتور اور مضبوط تھی اور اس کے لئے بلوچستان جیسے اہم خطے سے غفلت برتنا اور دستبردار ہونا ممکن نہ تھا کیونکہ اس طرح بلوچستان انتشار اور طوائف الملوکی کی حالت سے نکل کر اپنے آزاد بلوچ قبائل اور عوام کی مدد سے بالآخر ایک آزاد اور خودمختار حیثیت حاصل کر لیتا۔

1927ء میں مرکزی ایرانی حکومت نے بلوچستان میں فوجی مداخلت کا فیصلہ کیا اور فوجی قیادت کو بلوچستان میں داخلے کیلئے نہایت باریک بینی اور تفصیل سے رپورٹ تیار کرنے کا حکم دیا۔ 1928ء کے موسم گرما میں سرکاری افواج نے اپنی کاروائی کا آغاز کر دیا۔ اس دوران امیر دوست محمد خان کو تہران طلب کیا گیا مگر انہوں نے اس حکم کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ مرکزی ایرانی حکومت نے بلوچستان کی جداگانہ حیثیت کا خاتمہ کر دیا اور اس فیصلے کی اطلاع بلوچ سرداروں کو کر دی گئی۔ امیر دوست محمد خان نے حکومت کے خلاف

جنگ کا آغاز کر دیا اور حکومت کے ساتھ ان کی کئی گھمسان کی جنگیں ہوئیں لیکن انجام کار انہیں شکست ہوئی اور قیدی بنا کر تہران لے جایا گیا۔

1929ء میں انہیں رضا شاہ پہلوی کے دربار میں پیش کیا گیا جہاں انہوں نے بلوچستان کے مخصوص صورت حال کی وضاحت پیش کر کے معافی طلب کی۔ شاہ ایران نے انہیں معاف کر دیا مگر انہیں تہران میں اقامت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔

امیر دوست محمد خان باران زئی کی اپنی نگرانی پر مامور محافظ کو قتل کر کے فرار ہونے کی کوشش ناکام رہی اور انہیں گرفتار کر کے فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا جس نے ان کی سزائے موت کا فیصلہ سنایا۔ 1929ء کو اس فیصلے پر عمل درآمد کیا گیا۔ اس دوران مرکزی حکومت نے بلوچستان پر اپنا قبضہ مزید مستحکم کر لیا اور اس پر اپنی گرفت کو اور زیادہ سخت کر لیا۔

امیر علی محمد خان باران زئی کے فرزند امیر دوست محمد خان باران زئی کے پھانسی کے بعد رضا شاہ پہلوی نے ان کی جائیدادیں ضبط اور سخت سزائیں سنائی اور ان پر سخت تادیبی کاروائیاں اور ان پر ان کے حمایتی قبائل پر ظلم وستم روا رکھی تو اس کے نتیجے وہ روپوش یا زیر زمین یا ان کے زیر اثر علاقوں سے نقل مکانی پر مجبور ہوئیں۔ اس دوران میر دوست محمد خان باران زئی کے والد محترم امیر علی محمد خان باران زئی پنجگور کی جانب کوچ کرنے پر مجبور ہوئے۔

انہوں نے دریاء رخشان کے جنوب میں واقع پنجگور کے تاریخی شہر شاپاتان (چتکان) میں سکونت اختیار کی۔ وہ ایک شاہانہ ٹاٹ وباٹ ورعب دبدبہ رکھنے والے خوش لسان وخوش لباس شخص تھے۔ وہ بلوچی رسم ورواج وثقافت کے امین شخصیت جانے جاتے تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں بادشاہانہ وحاکمانہ صفات کے حامل عادات وروایات رکھتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بڑے تیراک وتیرانداز (نشانہ باز) تھے۔

وہ کئی سالوں تک پنجگور میں خاموشی کے ساتھ پر امن و پرسکون زندگی گزارنے کے بعد وفات ہوئے۔ وہ شاپاتان (پنجگور) کے قدیم قبرستان میں دفن ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے ایران کے حکمران رضا شاہ پہلوی سے جنگ کے بعد ان کے قبیلے

کے انتشار و تقسیم و زیر عتاب ہونے سے ان کے وفات کی حتمی تاریخ محفوظ رہ سکی اور نہ قبر پر کوئی مقبرہ تعمیر ہوا۔ لیکن تاہم اندازہ یہی ہے کہ وہ 1935 سے 1940 کے درمیان وفات ہوئے تھے۔

بنگائی قلعہ:۔(Bangai Kalat)

(نگر) پہاڑی ٹیلہ میں ایک مکان کی صورت میں موجود ہے۔

بگدر قلعہ:۔(Bagder Kalat)

(بگدر کور) اکثر [illegible] علاقے سے باہر ہونے کی صورت میں یہ نام پڑ گیا۔ بگ بلوچی میں [illegible] اور در کے معنی باہر کے ہیں یعنی [illegible] کا باہر ہونا یعنی اپنے مسکن گاہ سے دور ہونا۔ بگدر ندی میں پانی آنے کی وجہ سے اپنے مسکن گاہ پر نہ پہنچنے کی صورت میں یہ نام پڑ گیا۔ خاران اور کوہ سبز سے آتے ہوئے [illegible] اس مقام پر ڈیرہ ڈالتے۔ لیکن اصل میں ایک قلعہ نما ہے جو کہ پہاڑی کے اوپر پتھروں کے ذریعے ایک بندھ کی صورت میں تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی تعمیر چرواہوں نے اس وجہ سے کی تاکہ ان کی بگ موسم کی شدت سے محفوظ رہ سکیں۔

سوروان قلعہ:۔(Surwan Kalat)

یہ قلعہ سوروان کے علاقے میں موجود ہے لیکن اب اس قلعہ کے آثار ہی رہ گئے ہیں۔ اس قلعہ میں بھی زیادہ تر پتھروں کا استعمال ہوا ہے۔

بیٹانی قلعہ:۔(Betani Kalat)

بیٹانی قلعہ پنجگور کے حکمران پرک شاہ کی رہی ہے۔ شاہ نادر شاہ کے زمانے کا ہے۔ قلعہ میں کنواں اور قبرستان موجود ہے جو کہ اب صرف قبروں کے ڈھانچے موجود ہیں۔ پانی کے ابھار کی وجہ سے قبروں کی سطح ٹیلوں کی صورت میں نمایاں ہیں جو کہ عجب قدرت کی شاہکار اور اپنی قدیم دور کی عکاسی کرتی ہیں۔

خدابادان قلعہ:۔(Khudabadan Kalat):

قلعہ خدابادان پنجگور کے علاقے خدابادان کے وسط میں واقع ہے ۔یہ قلعہ کئی دہائیاں گزرنے کے باوجود اب بھی واضح طور پنجگور کے دیگر قلعوں کی نسبت صحیح وسالم انداز میں نوشیروانی قبیلے کے حکمرانی وبالادستی کی یادیں تازہ کرتی ہیں۔

یہ قلعہ نواب حبیب اللہ خان نواب آف خاران نے تعمیر کی اور قدیم زمانے کی فن تعمیر و خوبصورت اینٹوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ ایک لمبا چوڑا قلعہ ہے جو اس زمانے کی خوبصورت فن وتعمیر کی بہترین علامت ہے۔اس کے اردگرد اب بھی نوشیروانی قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔واضح رہے کہ ایک زمانے میں خدابادان کا علاقہ نواب آف خاران کے زیر اثر رہا ہے۔وہ اس علاقے سے ٹیکس و مالیہ وصول کرتے رہے اور ان کے نائبین کے ذریعے اس علاقے پر ان کی حکمرانی و گرفت کافی مضبوط رہی تھی ۔جبکہ نوشیروانی حاکم صرف خدابادان اور چتکان کے علاقوں تک ٹیکس وصول کرتے تھے۔بعد میں ایک خوبصورت بلند و بالا قلعہ تعمیر کی یہ پنجگور کے دیگر قلعوں کی نسبت صحیح وسالم حالت میں برقرار ہے۔

عیسیٰ النگ قبرستان:۔(Essai Allang Graveyards)

یہ قبرستان پنجگور کے قدیم ترین قبرستانوں میں سے ہے جس میں محمد ہاشم نامی شخص کا مقبرہ تعمیر ہے۔اس قبرستان میں قبروں کی طرز تعمیر بالکل قدیم دور کے مانے جاتے ہیں۔محمد ہاشم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک تاجر وکاروباری شخص تھے۔اس زمانے میں پنجگور کا علاقہ کاروبار وتجارت کے حوالے سے کافی مشہور تھا اور یہ اس پورے خطے کے کاروباری مرکز جانا جاتا تھا۔یہاں پر ہر وقت کاروباری منڈی لگتا تھا۔اور لوگ دور دراز سے یہاں تجارت کیلئے رخ کیا کرتے تھے۔اور یوں محمد ہاشم کاروبار کے سلسلے میں پنجگور کے علاقے میں آکر کافی بیمار رہو جاتے ہیں۔اور اسی مقام پر علیل رہنے کے بعد وفات ہوجاتے ہیں۔ اور اسی قبرستان میں دفن ہیں۔بعد میں ان کے قبر پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا جو اب بھی اپنے اُسی سالم حالت میں موجود ہے۔

مقبرہ ملک عصاء:۔ (Malik Assa Tumb)

ملک عصاء پنجگور کے علاقے تسپ میں مدفون ہیں۔ وہ ایک امیر آدمی اور اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے ہونے کے بناء پر کافی مال و جائیداد رکھتے تھے۔ جب وفات ہوجاتے ہیں تو ان کے قبر پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ لیکن صحیح تاریخ و وقت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں بس روایتوں پر انحصار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس تمام تر روایتوں اور زبانی کہانیوں کے برعکس ملک عصاء کے مقبرہ کی فن تعمیر استعمال شدہ رنگ بہ رنگیں اینٹیں جن میں اونٹوں، ہاتھیوں اور گھوڑوں کے ضبط شدہ نقوش عہد قدیم کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ اس خطے کی مذہبی رجحانات و میلات کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔ جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ایک عہد تک یہ علاقہ زرتشی، زمرک کے بعد ہی اسلام کے زیر اثر آئی تھی۔ کیونکہ یہ آثار اسی جانب متوجہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملک عصاء کے مقبرے کے تعمیر میں پانی کے بجائے دودھ استعمال ہوئی تھی۔ جو ملک عصاء سے اس کی ماں کی والہانہ محبت و دوستی کی اظہار تھی۔ جس کا اس دور میں بھرپور و شاندار اور بے مثال اظہار رہوا۔

گروگ چشمہ:۔ (Grawag Spring)

یہ تفریح گاہ/ پرندوں اور مچھلیوں کے شکار کیلئے بھی کافی مشہور ہے۔ اِس چشمے کے پانی میں کافی مقدار میں مختلف قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں زندگی کا بھرپور مزہ لیا جاتا ہے۔ ایرانی سرحد سے منسلک گروگ چشمہ پنجگور سے 90 کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک خوبصورت و دلکش نظاروں سے بھرپور چشمہ ہے۔ یہ تقریباً ایک کلومیٹر کے دریے کے آر پار کے علاقے کو سرسبز شاداب کرتی ہے۔ یہاں پر کھجور کے درختوں کا جھنڈ اور دیگر قدرتی خودرو پودے اور درختیں انسانی دل و دماغ کو اپنی جانب راغب کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔

ایک ایسا تفریحی مقام ہے جس کے دور دور تک خشک وادیاں، پہاڑوں اور میدانی سلسلوں کے بیچوں بیچ جو کہ ہرگز کسی جنت سے کم نہیں۔ اور یہ مقام اس مصداق کے برابر ہے کہ ''کبھی کبھی ویرانوں میں گُل کھلتے ہیں''۔ پنجگور کے علاقے میں بارشوں کی مقدار بہت کم ریکارڈ کی جاتی ہیں۔ مگر گروک چشمہ کا پانی سال بھر بہتا رہتا ہے۔ گروک کور کے آر پار پہاڑی سلسلوں میں ایک پہاڑ کے دامن سے چھ فٹ کی بلندی پر پانی نکل کر گروک کور میں

بہتا ہے۔ اور یہ چشمہ وسیع نالہ میں بہہ کر مشہور دریاء ماشکیل میں آ کر گرتا ہے۔ یہ کور ایک خوبصورت و دلکش نظارہ پیش کرتی ہے۔ یہاں لوگ سیر و تفریح کے علاوہ مچھلی اور پرندوں کے شکار کے لئے بھی آتے ہیں۔

بد قسمتی سے اعلیٰ حکومتی اختیار کی عدم توجہ و دلچسپی کے سبب یہ مقام تفریحی اور زرعی اہمیت کے باوجود اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ اس مقام کو صحیح منصوبہ بندی اور توجہ سے ایک تفریحی اور ساتھ ساتھ اس کے پانی کو بروئے کار لا کر کئی ایکڑ اراضی کو زیر کاشت لا کر زرعی مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پاردانی نل:۔(Pardani Nal)

پاردانی نل پنجگور کے شمال میں کوہ سبز کے کوہی سلسلے میں واقع ایک وادی ہے۔ پنجگور کا وہاں تک ایک دشوار گزار راستہ جاتی ہے جو کہ خاص طور پر گدھوں اور اونٹوں کیلئے بنائی گئی ہے۔ یہ ایک خوبصورت و دلکش تفریحی چشمہ ہے۔ مگر اس کے دشوار گزار راستے کے سبب اس خوبصورت وادی سے عام لوگ ناواقف ہیں جبکہ اس مقام پر صرف تفریح کے شوقین افراد سیر و تفریح و شکار ہی کیلئے جاتے ہیں۔

پاردانی نل کے خوبصورت وادی میں مسجد و مکانات کو بہت بڑی محنت و مشقت سے تعمیر کی گئی ہیں۔ اس خوبصورت وادی میں ایک خوبصورت باغ عجب نمونے کا شاہکار ہے۔ جو اس زمانے کے لوگوں کی اس طرح کے مقام پر دلچسپی و جانفشانی کی بڑی علامت اور زمینداری و زراعت سے محبت کا والہانہ اظہار بھی ہے۔ ایک زمانے میں اس مقام پر پیدا ہونے والے تمام فروٹ و سبزیاں انجیر، انار، انگور، سیب اور کھجور کے مختلف اقسام پیدا ہوتے تھے۔

لیکن اب عدم دلچسپی و عدم توجہی کے سبب یہ پیداوار ناپید ہو کر آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں اور اس تفریحی مقام کی سابقہ اہمیت و خاصیت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔

یہ قدرت کی کاریگری کا عجب نمونہ ہے کہ ایک پہاڑی دامن سے چشمہ نکل کر دریاء پاردان میں خوبصورت نمونہ پیش کرتا ہے۔ لیکن اس پانی کو مکمل ضائع ہونے سے بچانے کے لئے بڑی مہارت و کاریگری سے دریاء کے کناروں کے بالائی سطح زمین کو ہموار کر کے سرسبز و شاداب رکھا گیا ہے۔

حالانکہ یہ پہاڑی سلسلوں میں گرا ایک ایسا خوبصورت مقام ہے جس کے اِرد گرد دور تک جنگلات ہی جنگلات و پہاڑیں نظر آئیں گے۔

سعید آباد گڈگی:۔(Saeedabad Gadagi)

گڈگی دریاء کیلکور کے سنگم پر واقع مختلف ویرانوں اور پہاڑوں میں گرا ایک سر سبز و خوبصورت اور دلنشین وادی ہے ۔جس میں کھجور اور انگور وغیرہ کے بہت بڑے باغات ہیں۔ یہ قدرتی طور پر پہاڑوں کے دامن واقع ہے یہ بالگتر کے علاقے سے تقریباً 30 منٹ کے مسافت پر واقع ہے۔ اس قدرتی تفریح گاہ کو لوگوں نے زرعی مقام کے طور پر بھی استعمال کی ہے۔ اس کے چاروں اطراف میں بڑے بڑے باغات و گھنے جنگلات ہیں۔ یہ مقام سیر تفریح کے لئے ایک بہترین مقام تصور ہوتی ہے۔

بالگتر کے علاقے میں دو تفریحی مقام اسی نام پر موجود ہیں۔ ایک کو چیری گڈگی اور دوسرے کو سری گڈگی کہتے ہیں۔ یہ دونوں مقامات اسی نوعیت کے لحاظ سے یکساں طور پر خوبصورت و دلفریب وادیوں کے مناظر پیش کرتے ہیں۔

مچ کدگ (کھجور کے بالترتیب باغاب) انگور، انار، سیب، انجیر کے علاوہ سبزیوں میں بھنڈی، کدو، ٹماٹر و دیگر سبزیاں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اِس تفریحی و زرعی مقام پر فوری طور پر مواصلات اور فارم ٹو مارکیٹ سڑکیں تعمیر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس تفریحی مقام اور وادی کی رونقیں بحال ہوں۔

حوالہ جات

بلوچ تاریخ و عرب تہذیب :ڈاکٹر اسماعیل دشتی البوشہری

کمبران :الفت نسیم

ماہنامہ بلوچی دنیا؛ ملتان

باب ہشتم:

پنجگور جدید دور میں

اِس خطے نے زمانہ قدیم سے جدید عہد تک بڑے معرکوں اور نشیب وفراز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بہت سے عروج وزوال سے گزر کر ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ پنجگور کا ذکر زمانہ قدیم سے جغرافیائی، سیاسی وتجارتی نقطہ نظر سے ایک اہم خطہ ہونے کی بناء پر سیاحوں، جنگجوؤں ولشکر کشیوں کے حوالوں سے بھی عیاں ہیں۔ اس خطے نے اہم عالمی و تاریخی شخصیات جیسے سکندر اعظم، محمد بن قاسم و دیگر کئی جنگجو فاتحین کے علاوہ اہم بزرگ ہستیوں اولیاء اور صحابہ کرام کو اپنے دامن میں جگہ دے کر عزت واحترام بخشی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہی سے اسلام کی شمع پورے برصغیر میں پھیلی ہے۔ اسی لئے اس خطے کو باب الاسلام کا اعلیٰ اعزاز بھی حاصل ہے۔ تاریخی طور پر فنز بور، کنز بور اور فنزابور سے پنجگور کا تاریخی اور طویل سفر اس خطے کو قدیم تہذیب وتمدن کا حامل بناتا ہے۔ اور اپنی وجہ تسمیہ کے برعکس یہ علاقہ جغرافیائی، سیاسی اہمیت، قدرتی حسن ودلکش مناظرات اور پانچ بزرگ ہستیوں کی آرام گاہیں اسے مذہبی اعتبار سے پورے خطے کے اندر اولیانہ وبزرگانہ صفات کے حامل خطہ بنا دیتا ہے۔ اس علاقے کو دو تہذیبوں کے پر واقع ہونے پر عمومی اور تاریخی طور پر زمانہ قدیم سے وادی رخشان سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ علاقہ دلفریب نخلستانوں، میدانوں خشک و بلند بالا پہاڑوں چھوٹے بڑے دریائی ندی نالوں پر مشتمل ہے۔

محل وقوع:۔(Area)

جغرافیائی اعتبار سے پنجگور کا علاقہ دیہی وشہری علاقوں کے درمیان واضح طور پر منقسم ہے۔ شہری علاقے محظ 30% فیصد رقبے پر اور باقی ماندہ 70% فیصد دیہی علاقے پر محیط ہے۔

پنجگور کا کل رقبہ 16891 کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔جس کے مغرب میں عظیم اسلامی ملک ایران واقع ہے۔مشرق میں کیچ (تربت) اور شمال میں کوہ سیاہان کا ایک طویل پہاڑی سلسلہ اسے خاران اور واشک سے جدا کرتی ہے اور جنوب میں مشکے ضلع آواران واقع ہے۔

یہ سطح سمندر سے تقریباً تین ہزار (3000) میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔مشرق سے مغرب میں ایرانی سرحد جو تین مقامات پر پنجگور کے سرحدوں کی تعین کرتی ہیں اور پنجگور سرحد پر ایرانی بلوچستان کا پہلا علاقہ کوہگ اہم کاروباری اور تجارتی علاقہ کے طور پر مشہور ہے۔

پروم سرحد، یونین کونسل پروم مغربی جانب آخری دہانے پر ایک اہم سرحدی علاقہ ہے۔کاروبار اور نقل حمل و آمدورفت کے لئے اتنا اہم تو نہیں پھر بھی یہاں سے محدود پیمانے پر کاروبار ہوتی ہے۔پنجگور کے دیگر علاقے جو ایران سے ملتے ہیں جس سے آمدورفت و کاروبار ہوتی ہیں ان میں تمپ، سرکی زئی اور چیدگی اہم طور پر قابل ذکر ہیں۔

انتظامی وسیاسی:۔(Administrative & Politicaly)

بلوچستان کو 1970 میں صوبائی درجہ ملنے کے بعد پنجگور کو باقاعدہ طور پر ضلع کا درجہ دیا گیا۔اسے ایک سب ڈویژن، دو تحصیلوں پنجگور، گوارگو اور دو سب تحصیلوں گچک اور پروم کے علاقوں پر مشتمل کیا گیا۔انتظامی لحاظ سے پنجگور کے 25 کلومیٹر بعد کے علاقے کو بی ایریا کا نام دیا گیا ہے۔جس کی نگرانی لیویز کے سپرد ہے۔اور ضلع کا سربراہ ڈپٹی کمشنر ہے۔ دیگر سرکاری اداروں کے علاوہ ڈسٹرکٹ کورٹس (عدالتیں) موجود ہیں۔ایڈیشنل سیشن جج، سول جج، قاضی اور مجلس شوریٰ کے عدالتوں سے باقاعدہ طور پر دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعتیں ہوتی ہیں۔ضلعی انتظامیہ اور پولیس علاقے کے تمام معاملات کی نگرانی کرتے ہیں۔

قدیم زمانے میں پنجگور کو ہژدہ (اٹھارہ) شہر یعنی اٹھارہ شہروں کے نام سے پکارا جاتا تھا اور اسی حوالے سے کافی مشہور بھی تھا۔چونکہ پنجگور کا علاقہ اٹھارہ سے زیادہ چھوڑے بڑے قصبوں و دیہاتوں پر مشتمل ہے۔اس کے باوجود پنجگور کو عام طور پر (ہژدہ شہر پنجگور)

کہا جاتا تھا۔ یعنی اس زمانے میں بھی یہ لفظ پنجگور کے علاقے کی وسعت کو ظاہر کرتی تھی۔

آبادی:۔ (Population)

عموماً پنجگور کو دیہی وشہری علاقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دیہاتی علاقے کی آبادی دور دراز اور منتشر ہے۔ دیہی علاقے گچک، سبز آب، کوہ بن، دشت، پروم اور کلگ وغیرہ کے علاقوں میں منقسم ہے۔ جبکہ شہری علاقوں میں تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی چتکان، وشبود، گرمکان، خدابادان، تسپ اور عیسیٰ کے علاقوں میں نظر آتی ہے۔ اور بلوچستان میں اس ضلع کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی جو کہ شرح پیدائش میں دیگر علاقوں کے نسبت بہت تیز رفتاری سے آگے جارہی ہے۔

1988ء کے سرکاری مردم شماری کے مطابق پنجگور کی کل آبادی 234069 ہے۔ جس میں مردوں کی کل تعداد 136847 اور عورتوں کی مجموعی تعداد 126321 ہے۔ دیہاتی علاقوں میں آبادی تیزی کے ساتھ شہروں میں منتقل ہورہی ہے۔ کیونکہ دیہاتی علاقوں میں زندگی کی بنیادی سہولیات، تعلیم وصحت ناپید ہیں اور گزر بسر محظ کھیتی باڑی اور ریوڑوں تک محدود ہے۔ دیہاتی علاقوں میں پانی کی کمی بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ پانی کا سب سے بڑا ذریعہ بارشوں پر منحصر ہے۔

پنجگور کو انتظامی و بلدیاتی لحاظ سے بھی شہری و دیہی علاقوں میں ظاہر کیا گیا ہے جو کہ سولہ یونین کونسلوں پر مشتمل ہے۔ اور یونین کونسل چتکان ضلع کے ہیڈکوارٹر میں واقع ہے۔

2002 کے حلقہ بندیوں کے نتیجے میں پنجگور کو کیچ (تربت) کے بجائے ضلع خاران سے ملا کر این اے 271: پنجگور خاران، واشک کے ساتھ ملا کر رقبہ کے اعتبار سے ایک وسیع حلقے میں تبدیل کیا گیا۔ اور دریائے رخشان کے شمال و جنوب میں واقع علاقوں کو دو صوبائی اسمبلی کے حلقوں پر مشتمل کیا گیا۔

حلقہ پی بی 43 پنجگور ii : یونین کونسل وشبود، گرمکان، سراوان، خدابادان، سریقلات، تسپ، کلگ کے علاقوں پر مشتمل ہے۔

حلقہ پی بی 43 پنجگور ii: مرد ووٹرز: 17,614 خواتین 15,679 یہ زیادہ تر شہری

علاقوں پر مشتمل انتخابی حلقہ ہے۔

حلقہ پی بی 42 پنجگور i : یونین کونسل گچک، سوردو، چتکان، بونستان، عیسٰی، کوہ بُن، کیل کور پر مشتمل ہے۔

حلقہ پی بی 42 پنجگور i: مرد ووٹرز: 21,247 خواتین، ووٹرز 19,224 کل رقبہ زیادہ تر دیہی علاقے پر مشتمل ہے۔

ضلع میں انتظامی دفاتر اور اداروں کے علاوہ پنجگور کے عقب میں فرنٹئر کور FC کا کیمپ موجود ہے۔ جو بازار کے بیچ و آبادی کے درمیان واقع ہے۔

جنوب میں وسیع میدانی علاقے میں پنجگور ایئرپورٹ بھی موجود ہے۔ جہاں سے روزانہ ڈومیسٹک پروازیں روانہ ہوتی ہیں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ پنجگور کا علاقہ بین الاقوامی فضائی روٹ پر واقع ہے۔جس کے فضائی حدود سے روزانہ بین الاقوامی پروازیں گزرتی ہیں۔اس علاقے میں نصب ریڈار اور بین الاالقوامی فضائی روٹ سے ملک کو وسیع پیمانے پر آمدنی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اب ایک بین الااقوامی پرواز شارجہ ٹو پنجگور کا کامیاب آغاز ہو چکا ہے۔

شرح خواندگی:۔(Literacy Rate)

شرح خواندگی کے اعتبار سے پنجگور کا شمار بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ کے بعد دوسرے نمبر پر کیا جاتا ہے۔ پنجگور میں انگریزوں کے زمانے ہی سے درس و تدریس کے لئے ایک اسکول تھی۔ جس سے آٹھویں جماعت تک تعلیم دی جاتی تھی۔ اب یہ ارتقائی دور میں ماڈل ہائی اسکول کے طور پر ایک منفرد و معیاری تعلیمی ادارے کے طور پر قائم ہے۔

پنجگور کے انٹر کالج کو 1993ء میں ڈگری کالج کا درجہ دیا گیا۔اساتذہ کے تربیتی ادارہ ایلمنٹری کالج کے علاوہ پنجگور میں گرلز کالج و سیکنڈری گرلز اور بوائز پرائمری اسکولوں

سے طلباء وطالبات کو تعلیم دیا جاتا ہے۔ کیڈٹ کالج، پولی ٹیکنیک کالجوں کے علاوہ، انٹر کالج غدا پادان اور وشبود تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔

جبکہ دوسری جانب علم کی شمع روشن کرانے میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں، کوچنگ سنٹروں کے کرداروں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں سے انگریزی میڈیم میں درس وتدریس کے علاوہ خاص طور پر قابل ذکر مادری زبان بلوچی کو ذریعہ تعلیم بنانے کا عمل ذاتی طور پر بلوچی زبان کی ترقی وترویج کے لئے ایک اہم پیش رفت ہے۔ جس سے یقیناً مستقبل میں مثبت نتائج کے برآمد ہونے کی شاندار توقعات ہیں۔

عزت اکیڈمی:۔(Izzat Academy)

اہل قلم، دانشوروں ادیبوں ودیگر علم ادب سے تعلق رکھنے والے احباب کرام وقت و حالات کے ساتھ ہمیشہ سے بلوچی زبان وادب کی سرگرمیوں میں بھی فعال ومتحرک رہے ہیں۔ لیکن اس دور میں کوئی قابل ذکر بنیادی علمی وادبی ادارہ نہ تھی جو کہ پنجگور کے تمام مکاتب فکر کے اہل علم، ادیبوں، دانشوروں کو ایک ادبی پلیٹ فارم مہیا کرسکیں۔

نامور بلوچ ادیب ودانشور مرحوم حاجی عبدالقیوم بلوچ کی انتھک محنتوں کے نتیجے میں 14 ستمبر 1984ء کو عزت اکیڈمی پنجگور کے قیام عمل میں آئی۔ باقاعدہ طور پر حاجی عبدالقیوم بلوچ کی سربراہی میں تنظیمی ڈھانچہ تشکیل دیکر آئین ومنشور وضع کی گئی۔ حاجی عبدالقیوم بلوچ صدر، حاجی عنایت اللہ قومی نائب صدر، کریم آزات جنرل سکریٹری، یارجان عجم ڈپٹی سکریٹری، محمد عمر بلوچ خازن اولین کابینہ کے عہدیدار منتخب ہوئے۔

یہ علمی وادبی ادارہ بلوچی زبان کے مایہ ناز شاعر اور اٹھارویں صدی کے اہم رومانوی داستان عزت ومہرک کی پاک وسچی رومانوی وقصہ کے اعتراف میں ملاّ عزت پنجگوری کے نام پر منسوب ہے۔ جو کہ اس عہد کے مشہور ومعروف شاعر تھے جس نے اپنے شاعری سے بلوچی زبان وادب اور خاص کر عشقیہ شاعری کو دوام بخشا۔ اور بعد میں ایرانی بلوچستان کے خوبصورت دوشیزہ کے حسن میں گرفتار ہوکر ایک اہم تاریخی رومانوی داستان رقم کردیتے ہیں۔ جس سے وہ مشہور ومعروف بن جاتے ہیں۔

عزت اکیڈمی جو کہ اپنے قیام ہی سے اس علاقے میں علم وادب اور نئی نسل کیلئے ایک بڑا علمی شمع رہا۔ بنیادی طور پر عزت اکیڈمی کے اغراض و مقاصد و بنیادی منشور میں بلوچی زبان وادب و ثقافت کے فروغ کے ساتھ ساتھ تمام اہل علم کو ایک پلیٹ فارم پر فعال و متحرک کرنا ہے۔ بلوچی ادب و تاریخ اور ثقافت کی تحقیق، ترقی و ترویج و اشاعت، بلوچی کے مختلف اصناف سخن، شعر وادب، نعت ضرب الامثال، روایات و حکایات جدید وقدیم ادب سے ہم آہنگ، افسانے، ڈرامے، قصے کہانیاں وغیرہ یکجا کرنا اور ان کو شائع کرنا، بلوچی ادب کو جدید علمی وفنی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا، بلوچی زبان کی جدید وقدیم ادبی شخصیات کی یادیں منانا اور ان کے علمی وادبی کارناموں کو اجاگر کرنا، قومی علاقائی اور دیگر زبانوں کے معیاری ادب کو بلوچی زبان میں ترجمہ کرنا اور بلوچی کے شہ پاروں کو قومی و علاقائی اور دیگر زبانوں میں منتقل کرنا، بلوچی زبان وادب کو اجاگر کرنے کئے لئے ماہانہ مشاعرہ یا میعادی اجلاس منعقد کرانا نیز ادبی احوال کارکنوں کی آگاہی کیلئے پیش کرنا، بلوچی زبان کے جدید اور قدیم شاعروں اور نثر نگاروں کا آپس میں میل جول قائم کروانا، بلوچی زبان کا ایک مستقل رسم الخط مروج کرانا، نیز پنجگور میں ایک لائبریری قائم کر کے اہل قلم، اہل دانش و اہل زبان کو اس سے استفادہ حاصل کرنے کی دعوت دینا۔ بلوچی زبان کے نئے اور پرانے ادبی انجمنوں اور اکیڈیموں کے ساتھ باہمی یکجہتی و میل و جول کے مواقع فراہم کر کے ان کے ساتھ تعاون یا شراکت سے ادبی خدمات سرانجام دینا، بلوچی زبان کی جدید شاعروں ونثر نگاروں کے ذریعے قومی جذبہ اتحاد و یگانگت کا اظہار کرنا، مقامی ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے فنی جرائد، ادبی تحریرات، دریافت کردہ قلمی نسخے اور دیگر مواد باری باری اکیڈمی کی طرف سے چھاپ کر شائع کرنا، غریب و نادار طلباء کو وظائف، کتب اور دیگر تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا، عزت اکیڈمی کی جانب سے ہر سطح پر مختلف قسم کے کھیلوں کی سرپرستی کرنا اور لوگوں میں اس کا شعور پیدا کرنا اور کھیلوں کی ترویج کیلئے انعامات دینا۔

یہ ادارہ نہ صرف پنجگور بلکہ بلوچستان بھر کے علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز ومنبع ہے۔ اس ادارے کے قیام و سرگرمیوں میں کئی علمی وادبی شخصیات فقیر محمد عنبر، پروفیسر غنی طارق،

پروفیسر ریاض بلوچ ، محمد کریم آزات ،عنایت اللہ قومی، پروفیسر اکبر غمشاد ،صادق رھچار، بشیر شہزاد، عارف علیم، ظہور زیبی، بالاچ غنی، پروفیسر اسماعیل سماء، غلام نبی باھند، غنی گنوک اور حمزہ بلوچ ودیگر نے اہم کردار ادا کی۔

عزت اکیڈمی اپنے قیام ہی سے تاحال بلوچی زبان وادب وثقافت کی ترقی وترویج میں مصروف عمل ہے۔ اس ادارے کی عمارت میں سینکڑوں نایاب کتابوں پر مشتمل لائبریری، کانفرنس ہال بھی موجود ہے۔ اس ادارے سے وقتاً فوقتاً مشاعروں ، ادبی ریفرنسوں، علمی وادبی بحث ومباحثوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ جوکہ ملک کے اہم سیاسی وعلمی شخصیات کو مشاعروں، سیمیناروں اور لیکچروں کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔

اس ادارے کے شاعر و دایب، دانشور ،افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار بھی بلوچی زبان و ادب میں اپنا الگ پہچان وتشخص رکھتے ہیں۔عزت اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک رسالہ چراگ کے نام سے کئی سالوں سے شائع ہوتی رہی۔ جوکہ بلوچی زبان وادب کے فروغ میں بڑی اہمیت کے حامل ومعیاری رسالہ تھا۔اس کے علاوہ اب رسالہ ''نِوان'' کے نام سے شائع ہورہی ہے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام کئی شعراء کرام ،افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نویسوں کی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

آب وہوا:۔(Environment)

یہ علاقہ آب وہوا کے لحاظ سے (Temprate zone) میں واقع معتدل آب و ہوا رکھتی ہے۔موسم سرما میں بہت سردی اور موسم خزاں میں درمیانہ درجے کی گرمی پڑتی ہے۔شمالی ہوائیں جنہیں مقامی زبان میں (گوریچ) کہتے ہیں۔سال بھر تمام موسموں اور خاص کر سردی کے موسم سے شروع ہوکر موسم خزاں تک چلتی ہے۔جس کے سبب موسم سخت سرد ہوتی ہے۔سال میں دوبار یعنی بشّام اور بہار گاہ میں بارشیں ہوتی ہیں۔ تقریباً 25/20 ملی میٹر تک سالانہ بارشیں ریکارڈ کی جاتی ہیں۔

موسم گرما میں درجہ حرارت 40 ڈگری تک جاتی ہے۔اور موسم سرما میں درجہ حرارت منفی ڈگری تک پہنچ جاتی ہے۔

کھیل کود:۔(Sports)

خاص کر کھیل کھود میں علاقے کے نوجوان عمومی طور پر بہت دلچسپی لیتے ہیں۔فٹبال اس علاقے کا قدیم اور پسندیدہ کھیل ہے اور بلوچستان میں فٹبال کو پنجگور کا گیم کہا جاتا ہے۔ یہ کھیل علاقے کا قومی کھیل ہے جسے تمام علاقوں میں یکساں طور پر کھیلا جاتا ہے۔ فٹبال کی پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ ہر موسم میں چاہے گرمی ہو یا سردی اس میں کمی نظر نہیں آتی۔فٹبال پنجگور کا عام پسندیدہ و مقبول گیم ہے۔

جدید دور میں کرکٹ بھی تیزی سے علاقے میں مقبول ہوتی جارہی ہے۔لیکن قدیم زمانے کی کھیل کود مثلاً مولائی، مجولی، جی، وغیرہ بالکل ناپیدہ ہوکر ختم ہوگئے ہیں۔ان کی جگہ فٹبال نے منظم طریقے سے لے لی ہے۔مختلف علاقوں میں فٹبال گراؤنڈ اور کلبوں کے بہترین عمارتیں بھی قائم ہیں۔پنجگور کے مرکزی شہر چتکان میں ایک معیاری فٹبال اسٹیڈیم شہید حمید بلوچ کے نام سے موجود ہے۔علاوہ ازیں شہداء آجوئی اسپورٹس کمپلیکس کے طور پر قائم ایک قومی ادارہ موجود ہے اسے اسٹیڈیم ودیگران ڈور اور آوٹ ڈور اسپورٹس کے لئے آراستہ کرکے ایک یادگار ادارے کے طور پر قائم کیا جانا چاہئے۔جو پنجگور کا ایک بہترین معیار اور شناخت ہوتا کہ یہ اسپورٹس کے لئے ملکی اور بین الاقوامی سطح کے معیار کے مطابق ہو۔

محمود پدگیر ا(کھوجی):۔

بلوچستان اور خاص کر پنجگور کی تاریخ میں محمود (پدگیر) کو کھوج و سراخ رسانی (Blood Hound) کے بناء پر وہ تاریخی مقام حاصل ہے جو شاید کسی اور کو حاصل ہوا اور تاریخ میں اب تک اس طرح کا کوئی ثانی اور نعم البدل پیدا نہیں ہوا ہے۔وہ اپنی بے پناہ قدرتی صلاحیتوں کے بدولت بلا کی فٹ فنگر مہارت رکھنے والے انسان تھے۔وہ اپنی فن میں اس قدر بلاشک وشبہ سو فیصد قابل اعتماد وآخری وحتمی فٹ فنگر (کھوجی) تھے۔ان کے متعلق یہ مقولہ بلوچی میں مشہور تھا کہ ''آپ ءِ تہ ءِ پداں زانت'' ، ''آپ ءِ تہ ءَ پد کنت''

وہ اس قدر پہچان رکھتے تھے کہ وہ پانی میں بھی پاؤں پڑنے پر خوب پہچان رکھتے تھے۔ اس کے اس زبردست فن و مہارت پر بہت سی روایتیں اور ناقابل یقین قصہ کہانیاں بھی مشہور ہیں۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر تھے کہ انہوں نے ایک خرگوش کو پکڑ کر دائیں کان کاٹ کر چھوڑ دی۔ جب وہ دو سال بعد کسی جنگل میں شکار پر تھے کہ کسی خرگوش کے پاؤں کے نشانات پر تعاقب ہوا تو انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ یہ وہی خرگوش کے پاؤں کے نشانات ہیں جسے میں نے دو سال قبل پکڑ کر کان کاٹی تھی۔ جب پیچھا کر نے پکڑ ھا تو دوست ششدر رہ گئے کہ یہ واقعی وہی خرگوش ثابت ہوا۔

وہ پاؤں کے نشانات زمین پر پڑنے پر عجیب پہچان رکھنے والا قدرت کا ایک انمول و عجیب ناقابل یقین انسان تھا۔ اسی طرح ایک دفعہ وہ سردار پنجگور سر بلند خان گچکی کے ساتھ گچک سے واپسی پر پنجگور کے قریب ہانے تھل میں رکے۔ تو انہوں نے کسی کے پاؤں کے نشانات پر کہا کہ یہ معروف ڈکیت گل محمد عرف گلو گرمکانی کے پاؤں کے ہیں۔ سردار پنجگور و دیگر دوستوں نے ان کی اس بات پر مذاق اڑائی کہ گلو جو ڈکیتی کے جرم میں دو ماہ سے عیسیٰ قلعے میں قید ہیں، بلا وہ کیسے ہوسکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے بڑی زور دے کر کہا کہ ان نشانات کا پیچھا کیا جائے جب پیچھا کیا گیا تو کسی پہاڑی دامن میں گلو کو نیند میں پایا گیا جو کہ آج ہی عیسیٰ قلعہ کے جیل سے فرار ہوا تھا۔ وہ واقعی زبردست قدرت کے شاہکار تھے وہ بعد میں لمبی عمر پانے کے بعد 1985 ءکو وفات ہو جاتے ہیں۔ لیکن آج تک کوئی کھوج میں اس بلا پد گیر کا ثانی نہ رہا۔ وہ اپنے اس سراخ رسانی پر قدرت رکھنے والے باکمال شخصیت تھے۔

بنیادی ضروریات زندگی:۔(Basic Emenities of Life)

اس پورے علاقے میں کہیں پر بھی بنیادی ڈھانچہ (Infrastructure) نہیں۔ علاقے کی ہیڈکوارٹر و دیگر مضافاتی علاقوں و یونین کونسلوں حتیٰ کہ بازار اور رہائشی علاقے غیر منصوبہ بندی unplanned کی وجہ سے دور قدیم کے نادر نمونے پیش کرتے ہیں۔ اور قدیم زمانے کے عکاس ہیں اور یہاں تک کہ پنجگور بازار (چتکان) میں نہ سڑکیں اور نہ

اسٹریٹ لائٹس اور نہ جدید طرز تعمیر ہے۔ بلکہ اس علاقے میں پرانی روایتی تعمیر شدہ سبزی منڈی اور ٹرانسپورٹ کمپنی و دکانیں تنگ و بے ترتیب گلیاں قدیم طرز تعمیر کی عکاس ہیں ۔ جسے جدید دور کے مطابق ہم آہنگ کرنے کی ضرورت تھی جواب تک نہ ہو سکی ہے۔

اس وقت پنجگور سمیت پورے مکران ڈویژن کو ایران سے بجلی سپلائی کیا جاتا ہے۔ گذشتہ ادوار میں پنجگور سے 39 میگاواٹ گیس ٹربائن کے ذریعے مکران کو بجلی فراہم کی گئی۔ لیکن بعد میں ایران کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت 35 میگاواٹ کا معاہدہ کر کے بجلی فراہم کیا گیا۔ مگر اس وقت محظ پنجگور کے 30 فیصد علاقوں کو بجلی فراہم کی جارہی ہے۔ جس سے علاقے میں بجلی کی کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے پورے مکران کیلئے ایران سے مزید 50 میگاواٹ کے معاہدے کے بعد 100 میگاوٹ کی بجلی فرائم کی جارہی ہے۔

پنجگور بلوچستان کے مغرب میں واقع ایک سرحدی علاقہ ہے جہاں سے کراچی اور کوئٹہ تک رسد اور بہتر سڑکوں کی عدم موجودگی سے علاج معالجے و دیگر ضروریات کیلئے کافی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں ۔ سول ہسپتال و دیگر علاقوں میں قائم بنیادی مراکز صحت سے ادویات کی عدم سپلائی اور ڈاکٹروں وجدید ساز وسامانون کی کمی جیسے مسائل سے عوام کافی مشکلات کے شکار ہیں۔ اب پنجگور کے علاقے خدابادان میں 50 بستروں پر مشتمل ایک جدید ہسپتال قائم ہے۔ قابل ذکر جاوید میڈیکل کمپلیکس کے نام پر جدید طبی آلات وسہولتوں سے آراستہ ایک نجی ہسپتال بھی موجود ہے۔

باب نہم

ملّا عزت پنجگوری

(داستانِ عزت ؤمہرک)

بلوچستان کی قدیم و جدید تاریخ جنگی معرکوں، لشکرکشیوں، تخت و تاراج اور عروج زوال کے ساتھ ساتھ رومانوی قصہ کہانیوں، مہر محبت اور ایثار روفاء کے لازوال داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ انہی زندہ و جاوید حقیقی عشق کی زرّین داستانوں میں سے ایک انیسویں صدی میں وقوع پذیر ہونے والا عزّت و مہرک کی سچی مہر وفا و محبت اور دوستی کا اہم عشقی داستان ہے جو کئی دہائیاں گزرنے کے باوجود آج کے دورحاضر تک ہر زندہ دلوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی رہتی ہے۔

ملاّ عزّت پنجگوری جو مہر خاتون (مہرک) نامی ایک پرکشش خوبرو حسین وجمیل دوشیزہ کے حسن و جمال میں گرفتار ہوکر پاگل پن کی حدتک محبت میں گرفتار ہوجاتی ہیں۔

بعد میں جلد ہی یہ عشق ومحبت کی عظیم داستان بڑی بڑی لمبی سرحدوں کوعبور کر کے مشہور ومعروف رومانوی داستانوں کی روپ دھار لیتی ہے اور یوں عزت ومہرک کی داستان اہم رومانوی داستانوں میں سے ایک اہم داستان کے طور پر تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔

ملاّ عزّت پنجگور کے مشہور ومعروف علاقہ تسپ میں اللہ کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی سن پیدائش پر حتمی رائے رکھنا کافی دشوار ومشکل ہے۔ پھر بھی زیادہ تر مورخ وقصہ گو اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں کہ انکی پیدائش 1795ء تاں 1800ء کے درمیان ہوئی ہوگی۔ انہیں اس عہد کے بلوچی زبان کے اہم شعراء ملا بوھیر، ملا قاسم، ملا فاضل کے ہمعصر شاعروں میں شمار کرنے کی بناء پر انہی ادوار میں بھی ان کی پیدائش بیان کی جاتی ہے۔ بلوچی زبان کے معروف شاعر ملاّ فاضلؔ کو ان کے قریب ترین دوستوں اور ہمنواؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ملاّ عزت بچپن ہی میں والد کے سائے سے محروم ہوجاتے ہیں اور ان کے چچا ہی ان

کی تعلیم وتربیت و پرورش کرتی ہیں۔ اُس زمانے میں ذریعہ تعلیم محظ فارسی یا عربی ہی میں تھی اس لئے انہوں نے ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی ہی میں حاصل کی۔ وہ مزید تعلیمی سلسلے کو آگے لیجانے کے بجائے کاروبار سے منسلک ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ بچپن ہی میں ایک ذہین و ہوشیار انسان تھے۔ چونکہ ان کے آباؤ اجداد کئی دہائیوں سے سونار کے پیشے سے منسلک چلے آرہے تھے تو انہوں نے اس کاروبار کی مہارت اپنے چچا ہی سے حاصل کی اور خود اس پیشہ سے مستقل طور پر وابستہ ہوئے۔ ملاّ عزت کے پنجگوری نام کے لاحقے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچپن ہی میں شاعری کی جانب راغب ہوئے تھے۔

مہرجان (مہر خاتون) اپنی پرکشش اثر پزیر حسن ومعصومیت کی وجہ سے بعد میں مہرک کے نام سے پورے علاقے میں مشہور ومعروف ہوجاتے ہیں۔ وہ انیسویں صدی میں ایرانی بلوچستان کے ضلع سراوان (سرباز) کے گاؤں پیردان میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ پنجگور سے تقریباً دوسو350 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک دیہاتی علاقہ ہے۔ جو پہاڑوں میں گری ایک دور آفتادہ چھوٹا سا خوبصورت گاؤں ہے۔

مہرک خوبصورتی حسن و جمال میں لاجواب حسینہ تھی۔ اپنے گھنے لمبے بالوں کے ساتھ اسکی کوئی ثانی وجواب نہ تھی۔ اسی وجہ سے جلد ہی اسکی حسن و جمال کی تعریفیں جغرافیائی سرحدوں سے باہر نکل کر دور دور تک پھیلی۔ حتیٰ کہ اسے اس عہد کے اہم شعراء کرام تک نے اپنے شاعرانہ خیالات وتصورات کا اہم موضوع ومرکز بنایا تھا۔ بلوچی زبان وادب کی دوسری دور اور انیسویں صدی میں اس خطے سے رزمیہ شاعری میں کسی نہ کسی حوالے سے مہرک کے حسن و جمال اور خوبرو پرکشش رنگت کی جھلک پھول وگلاب وخوشبو ومہک کی طرح جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہ حقیقت خوب آشکار ہوجاتی ہے کہ مہرک کے حسن کو الفاظِ بیانیہ وتذکروں میں پیرویا نہیں جاسکتا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی کالی ریشمی لمبے گھنے بالوں نے اسکی خوبصورتی پر چار چاند ضبط کی تھی۔ جس نے ملاّ عزت بن اللہ کو ایرانی بلوچستان کی بلوچ حسینہ مہرجان معرف بہ مہرک نے جلد ہی اپنا دیوانہ عاشق بنایا۔

ہوا یوں کہ ایک دن ان کے دوستوں کے محفل میں بلوچی زبان کے مایہ ناز شاعر ملاّ

فاضل بھی موجود تھے تو یہ مجلس جلد ہی مشاعرے میں تبدیل ہو کر شاعرانہ کلمات کی روپ دھار لیتی ہے۔ تو ملا فاضل کے شاعرانہ کلمات شاعری کے خدوخال مہرک کے حسن و جمال و خوبصورتی پر مبنی ہوتے ہیں۔

ملاّ فاضل کے شعر سنتے ہی عزت پنجگوری کے تصورات و خیالات و دل و دماغ پر ان کے خوبصورت کلمات جو مہرک کے متعلق تھے نہ ختم ہونے والی گہری اثر مرتب کرتے ہیں۔ اور دل پذیر اثرات دل و دماغ پر برابر چھا جاتے ہیں۔ ملاّ عزت کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے ایک ایسے شاعر کے خیالات اور تصورات اس حسین پری کے حسن و جمال و خوبصورتی پر ہوں تو ضرور وہ حسن میں لاجواب اور یکتا ہوگی۔ اُس دن کے بعد ہی وہ مہرک کا نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے۔ بعد میں ان کا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے کاروبار و پیشہ اور حتی کہ تمام تر سماجی زندگی کو خیرباد کہہ جاتی ہے۔ آخر وہ مہرک کے دیدار کی ایک جھلک پانے کیلئے ان کے خوبصورت گاؤں وادی پیردان کی جانب کوچ کرتے ہیں۔ وہ کئی دنوں تک مہرک کے دیدار کیلئے ان کے گاؤں پیردان میں تاک لگائے بیٹھتا ہے۔ مگر اسے کسی طرح کامیابی نہیں ملتی کیونکہ مہرک اکثر اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہوتی تھی۔ یہ انتظار بے قراری اس کے دل میں محبت کی شدت کو بہت زیادہ بے چینی کی سبب بناتی ہے۔

مہرک اپنی سہیلیوں کے ساتھ شام کو کبھی کبھار باہر باغات میں سیر و تفریح کو نکلتی۔ بالآخر ایک دن عزّت کی آرزو رنگ لاتی ہے۔ اسکی نگاہ مہرک پر پڑ جاتی ہے تو وہ مہرک کے حسن و خوبصورتی کو ایک گلاب کی مانند پاتی ہے تو وہ انہیں اپنے تصور و خیالات سے کئی گنا حسین پاتی ہے۔ اور ایک جھلک دیکھتے ہی اس پر دیوانہ وار ہو جاتا ہے اور اپنا دل دے بیٹھتی ہے۔

سربازی شررنگیں جنک ہم یک انت
دز گہاران گوں قیمت ئےِ لکھ اِنت

''سرباز کی خوبصورت لڑکی جو لاکھوں میں ایک ہی ہے'' اس لئے کہتے ہیں کہ عشق و محبت میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ عزّت پرواہ کئے بغیر مہرک پر دیوانہ وار پاگل ہو کر ان کے عشق کی قیدی بن جاتے ہیں۔

اور بعد میں معلوم کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ مہرک علاقے کی ایک معتبر نامور شخصیت میر سا مک کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اور بچپن ہی میں اسکا رشتہ ان کے چچازاد سے طے ہو چکی ہے۔ جب گاؤں کے لوگوں کو عزّت کی مہرک کے ساتھ مہر و محبت کا پتہ چلتا ہے تو وہ انہیں سمجھاتے ہیں کہ مہرک کا بچپن ہی میں رشتہ ان کے چچازاد سے طے ہو چکی ہے۔

اور چونکہ مہرک کا رشتہ انکے خاندان ہی میں ہوا ہے اور یہ بلوچی رسم و رواج میں بھی ممکن نہیں کہ رشتہ توڑا جائے۔ مگر عزّت کسی بھی طرح راضی و تیار ہونے اور ماننے کو تیار نہیں رہتی۔ وہ اپنی سچی محبت و دوستی کو خوب آشکار کرتے ہیں کہ دیوانے بس اپنی محبوبہ ہی کو حاصل کرتے ہیں اور میرا یہی منزل و مقصد ہے۔ وہ مہرک کے رشتہ کے لئے پیغام کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ ابتداء میں میر سا مک انکی ان باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتی۔ لیکن جب اسے جلد ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دیوانہ عاشق کچھ کر جانے کی ٹھان چکے ہیں تو وہ کافی پریشان ہو جاتے ہیں۔ میر سا مک ابتداء میں اسے سمجھانے اور ٹالنے کی کافی تدبیر آزماتے ہیں کہ مہرک کا رشتہ توڑ کر آپ کے ساتھ کرنا مشکل ہے۔ مگر اسے عزت کی دیوانگی اور مہرک کی چاہت اور پاگل پن کے سامنے بار بار جھکنا پڑتا ہے۔

بالآخر وہ اپنے لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد اس بات پر اکتفادہ کرتے ہیں کہ عزت کو اس کی حیثیت و گنجائش سے زیادہ مال و متاع سے ٹالا جا سکتا ہے تو وہ کافی سخت شرائط مال و متاع کے عوض مشروط طور پر مہرک کا رشتہ عزت کے ساتھ کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ عزّت انکی تمام شرائط بغیر کسی حجت سے آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہیں۔

اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ میر سا مک نے عزّت سے دس جوانسال غلام اور کنیزیں، سو بھیڑیں، سات گائیں پانچ ہزار روپے نقد بہت سے جوڑے، زیوارت اور شادی کا خرچہ طلب کرتا ہے۔ اس وقت جو اس کے پاس تھا وہ میر سا مک کے سامنے ڈالتے ہوئے مہرک کو اپنے نام کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ دیگر مال و متاع کی خاطر میر سا مک سے مہلت مانگتے ہیں اور یوں انہیں مناسب مہلت دی جاتی ہے کہ دیگر مال و متاع پوری کرنے پر دلہن کی رخصتی عمل میں آجائے گی۔

عزّت اپنے حسین و خوبرو محبوبہ کو پانے کیلئے پنجگور اور پھر وہاں سے دیگر علاقوں میں مال و دولت جمع کرنے کیلئے مدتوں دربدر ریگستانوں کی خاک چھانتے رہتے ہیں۔ اسی طرح

اپنی محبوبہ کو پانے کی تمنا وخواہش میں معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہنچتا ہے۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتے ایک دن عزّت کے خوابوں کی شہزادی مہرک اپنی دیگر سہیلیوں کے ہمراہ گاؤں کے قریب جو عموماً سیر وتفریح کو نکلتے ہیں قریبی تالاب میں سہیلیوں کے ساتھ نہاتی ہیں۔ اور وہاں قریب سے ایک کاروان (قافلہ) گزرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب سہیلیوں کی آنکھیں ان پر پڑتی ہے تو سہیلیاں گھبرا کر جاگ اٹھتی ہیں۔ لیکن گھنے لمبے بالوں والی خوبرو مہرک پانی کے اندر عزّت کے خیالوں میں گم سم تیر رہی ہوتی ہے۔ انہیں سہیلیاں جگانے اور بیدار کرنے کی لاکھ کوشش کرتی ہیں اور پانی سے جلدی باہر نکلنے کو کہتی ہیں۔ خود تمام لڑکیاں پانی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ مگر بدنصیب عین وقت پر تالاب سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں رہتی۔

کاروان (قافلہ) بھی بالکل آن قریب پہنچ جاتی ہے۔ وہ پانی بھرنے اور جانوروں کو پلانے کیلئے تالاب پر پہنچ جاتے ہیں۔ مہرک کو پانی کے اندر چھپنے کے سوا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتی تو جلدی ہی اپنی گوری بدن کو پانی کے اندر ڈبوتی ہے۔ لیکن انکی لمبی لمبی ریشمی ملگور (بال) کافی کالے اور گھنے ہونے کی وجہ سے پانی کے اوپر کالے بادل کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ جب قافلے والوں کی نظریں تالاب پر پڑتے ہیں تو کافی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور خوف کے مارے سارے اس گمان میں بھاگ پڑتے ہیں کہ یہ کوئی دیوی، پری یا کوئی جن یا بھوت ہوگی۔ مگر قافلے میں سے ایک عیار و ہوشیار بوڑھا شخص جھاڑ کے پیچھے چھپ کر دیکھتی ہے جب قافلے جانے کی گمان پر حسین وخوبصورت مہرک تالاب سے باہر نکلتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس شخص کی نظریں اسکی خوبصورت گوری رنگت و لمبے گھنے گیسوؤں پر پڑتے ہی اسی وقت اس کے دل سے آہ نکلتی ہی اس پر نظرِ بد لگ جاتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد مہرک کبھی بھی سنبھلتی نہیں روز بروز بیمار سے بیمار ہو جاتی ہے۔ اور بستر مرگ تک کا آخری سفر عزّت کے جدائی میں طے کرتی ہے۔ حسین ودلکش مہرک پوری وادی پیردان کو سوگوار کر کے عزت سے ابدی جدائی کے راہ اختیار کرتی ہے۔

جب عاشق عزت اپنی حسینہ کو پانے کی تمنّا لئے مہرک کے والد کی تمام شرائط و مال و متاع مکمل کر کے پیردان کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔ اور مہرک کے گاؤں کے قریب پہنچ کر لوگوں کی ہجوم کو دیکھتی ہے اور پتہ چلنے پر کہ اب انکی دنیا اجھڑ چکی ہے اور اب مہرک قبرستان میں بھاری مٹی تلے دبی ہوئی ہے۔ تو اسکی دیوانگی اور پاگل پن کا کوئی حال نہیں رہتا لوگ تو مہرک کے قبر پر مٹی ڈال کر اپنے اپنے گھروں میں لوٹ چکے ہوتے ہیں۔ مگر اب ان کی زندگی اسی مٹی تلے دبی ہوئی تھی۔ وہ چالیس دنوں تک مہرک کے قبر کے سرانے بیٹھ کر روتا رہتا ہے۔

ارمان ارمان پا مہر خاتون ءَ
گوں نہ کپت اوں کہ بوانین یاسین ءَ
پہ مہر خاتون ءِ شکلیں گین ءَ
مَن ھم نزانت مہرک مریت
عزت پہ اے روچاں زریت
بڑن انت منارا اے ھبر
جانیگ ءِ بے حقیں مرگ

عزّت کو مہرک سے کافی دلی لگاؤ اور سچی محبت تھی۔ وہ حقیقی معنوں میں مہرک کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ مہرک کی اس اچانک و ناگہانی موت عزّت کو مکمل پاگل بنا کر دیوانہ بناتی ہے۔ مہرک کی جدائی میں اس قدر حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ دل سے پیردان کو بددعا دیتے ہیں۔

رَند مہرک پیردان بُنچات
حق درشات سیاہ ڈن ءِ تشات

☆

مہرک کے بعد اب پیردان پر برق گرے
اسکی آبادی اسے چھوڑ کر صحراؤں میں جا بسے

آخر میں مہرک کے پانے کی چاہت ودیوانگی اسے مکمل دیوانہ پاگل بناتی ہے۔اس کے بعد کسی کو کوئی معلوم نہیں کہ عزّت کہاں جاتی ہے۔

یہ عظیم داستانِ عشق حقیقی معنوں میں عزّت ومہرک کا کردار وفا اور پاکیزگی کی ایک خوبصورت وعظیم علامت ونشانی ہے۔

اور یوں تو پوری دنیا میں محبت وفا کی کئی عشقی داستانیں موجود ہیں۔ان ہی میں سے ایک میں عزّت ومہرک کی سچی پاک محبت کی عظیم داستان کی خوشبو جو پورے خطے میں مہک و خوشبو بن کر پھیلی۔اس دل سوز داستان محبت سرحدوں کے آر پار محبت ودوستی کی ہمیشہ حقیقی نمائندگی کرتی ہے۔

ملاعزت کی شاعری:۔(The Peotry of Mulla Izzat)

ملاّ عزّت ابتداء ہی سے زیادہ تعلیم و درس سے وابستہ نہ رہ سکے چونکہ بنیادی تعلیم فارسی اورعربی زبان میں حاصل کی۔ اس لئے ان کی تمام شاعری مین فارسی کے اثرات بہ آسانی نمایاں ہیں۔اس کے متعلق یہ کہا جاتاہے کہ انہوں نے ابتدائی زمانے میں فارسی زبان سے شاعری کی ابتداء کی تھی۔لیکن بڑی تحقیق وجستجو کے باوجود انکی فارسی شاعری کسی بھی طرح تاحال دستیاب نہ ہوسکی ہے۔اول یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ ان کی تمام تر بلوچی شاعری جوسینہ بہ سینہ منتقل ہوکرآئی ہے۔اورجبکہ ان کی فارسی شاعری کو بلوچوں نے نہ خاص پذیرائی دی اور نہ کوئی خاص توجہ حاصل نہ کرسکی اور یوں بھی ممکن ہے کہ فارسی ادب کا اس جانب کوئی لگاؤ اور دلچسپی نہ ہو۔ملاّعزّت کے متعلق یہ بھی کہا جاتاہے کہ ان کی مہرک کے ساتھ عشقی شاعری کے علاوہ زیادہ تر بلوچی شاعری بھی دستیاب نہیں۔

چونکہ وہ بلوچی شاعری کی جانب اس وقت راغب ہوجاتے ہیں جب انہیں ایرانی بلوچستان کے علاقے پیردان کے حسین وجمیل خوبروشہزادی مہرک سے بے پناہ عشق ومحبت ہوجاتاہے۔اوراسی طرح ابتدائی شاعری بھی دستیاب نہیں۔

بلوچی زبان میں انکی شاعری کے تھیم وتمام تر تفکرات وکلمات میں غم خیالات،

مٹھاس، رچاؤ اور بھرپور نغمگی پائی جاتی ہے۔ مہرک کے حسن وخوبصورتی انکی محبت، چاہت کی جنون انگنت تعریفی کلمات کے اظہار پر مبنی ہیں۔

عزت ومہرک کی مقبول داستان عشق کے زبان زد عام ہونے پر لوگوں نے انکی عشقی شاعری کو سینہ بہ سینہ منتقل کی جبکہ انکی دیگر تمام شاعری عظیم عشقی داستان کے ملبے تلے دب جاتی ہے یا توجہ کے طلبگار یا پذیرائی سے محروم رہ جاتی ہے۔

مہرک کے خیالوں وخوابوں میں مست رہنے کے بعد محظ ان ہی کے خواب وخیالات اس کے دل ودماغ پر اس قدر حاوی ہوجاتے ہیں کہ انکی تمام تر شاعری ان ہی گرد نظر آتی ہے۔

درحقیقت انہوں نے اپنی شاعری ہی سے بلوچی شاعری کو ایک نئی جہت اور روایت بخشی۔ بعض عالم وفاضل، تاریخ دان اور محققین ملا عزت پنجگوری کے اس شعر کے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں کہ انہوں نے پہلی دفعہ بلوچی میں اپنی محبوبہ مہرک کے حسن کے اسیر بن کر یہ شعر کہی تھی۔

ورد ءُ درود اکبر صحباں بنا کنت
دل بلبلے کہ نالیت صد ہو ءُ آہ کنت
بعد از ثناء جبار نعت رسول کنت
آچار یار نام ءَ ورد زبان کنت
من دیستگ لیلٰے اندام شمس ءَ تہار کنت
ابروئے دوئیناں دلبر چراغ کنت
گوں کنجلاں گل اندام نوبت پرست کنت
شہ گام کبگ رواجیں کل ءَ مدار کنت

یوں نئے رجحانات میں مست توکلی، رحم علی مری، ملا قاسم اور دوسرے شاعر بلوچی ادب میں شاعری کے حوالے سے ایک نئے دور کے آغاز کے سبب بنے۔ عطاء شاد کے

مطابق مست توکلی اور عزت پنجگوری کی شاعری تاریخی اور جغرافیائی حالات کی تبدیلیوں کے باوجود شہ مرید کے مکتب فکر سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ماحول نیا ہے حالات دوسرے ہیں۔لیکن فکر کی بنیاد وہی ہے۔سمی کو مست کی شاعری میں اور مہرک کو عزت کی شاعری میں وہ مقام حاصل ہے جو شہ مرید کی شاعری میں حانی کو حاصل ہے۔شہ مرید ایک شکست خوردہ عاشق بن کر جلاوطنی کی زندگی اختیار کر کے گوشہ فرار اختیار کر لیتا ہے۔اور ملا عزت اسی حالات وکیفیت سے گزر کر اپنی شاعری کو جلا بخشتا ہے۔

وہ اپنی ذات کے متعلق اور محبوبہ کا ذکر اپنی شاعری میں اس طرح سے کرتے ہیں۔

من عاشقاں خدا ءِ پیردان ءِ مصطفےٰ یاں
عزت بن للّٰہ یاں چو شہ مرید جلاّیاں
کچکول ءُ عصا ءَ زیراں چو کابل ءِ فقیراں
ٹکر ءُ گدائی پنڈاں من مہرک ءَ نہ گنداں

"میں خدا کا عاشق ہوں، دین مصطفویٰ پر فدا ہوں، میں عزت بن للّٰہ ہوں، عصا اور کشکول لیکر کابل سے آئے ہوئے فقیروں کی طرح در در ٹھوکر کھا کر گھومتا ہوں مگر مجھے مہرک نظر نہیں آتی"۔

وہ یہی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہرک کو محظ ان ہی کیلئے پیدا کیا ہے۔وہ ازل سے ابد تک ان ہی کا ہے اور رہے گا۔انکی شاعری ہر مہر و فا رکھنے والے دل میں پھیلا ہوا ہے وہ عہد وفا کی عظیم ترین داستان کے شاعر ہیں۔

اسے مہرک کے محبت کی دیوانگی نے بلوچی شاعری کرنے پر مجبور کی اور بلوچی زبان میں ملا عزّت کی جو شاعری دستیاب ہیں وہ اپنی محبوبہ کے متعلق ہی ہیں۔

پیار و محبت و مہر و فا کے عظیم ترین ایثار و جذبات و شدت ہی سب کچھ انکی شاعری میں ڈھل کر خوشبو، پھول و مہک بن کر گنگناتی ہے۔

میں حق کا متلاشی ہوں
اور دین مصطفیٰ پر قائم ہوں
عزت بن للہ ہوں
اور شہ مرید کی طرح شعلہ عشق میں جل رہا ہوں
ہر شہر میں حسن کی بھیک مانگتا ہوں
مگر مجھے مہر کہیں نظر نہیں آتی
پنجگور سے جیوانی تک
کابل سے غزنوی تک
اور گنداوہ سے مری کوہستان تک پھرتا
مگر مہرک جیسی پری کو نہ پایا
سرباز سے پیردان تک
اور تمام ایران کھنگال ڈالا
پیردان سے لوٹ کر
ایرافشان دیکھ ڈالا
مگر مہرک کو نہ پایا

اسے دوستی و محبت کا اظہار خوب آتا ہے جو کہ انکے شعروں کے اندر نمایاں اور خوب نظر آتے ہیں۔ جن میں ایک بہت بڑی دلگیر داستان بن کر جن میں کئی داستانیں بسی ہوئی ہے۔

وہ اپنے شاعری کے اندر مہرک کو اپنا حق سمجھ کر سچی پاک مذہب کے حوالے دیکر عیاں کرتا ہے جو کہ ان کی شاعری کی حسن وہ سحر انگیز کی بیانی ہے۔ انکی تمام شاعری کی پراسراری کیفیت اور ہیجانیت، تذبذب کے حصار سے باہر نکلتی ہے جو کہ بہترین شاعری کی ایک بہترین وخوبصورت حسن ہے۔ تلاش و جستجو میں مہ پرواز اور دوستی و محبت پانے کے خیالات

سے زیادہ تیز وگرج چمک ان کی شاعری میں خوب دکھائی دیتے ہیں۔

رندمہرک پیردان بسچات

حلق درشات سیاہ ڈن ءِ تشات

''مہرک کے بعداب پیردان پر برق گرے اوراسکی آبادی اسے چھوڑ کرصحراؤں میں جا بسے''

مہرک کو نہ پانے وحاصل نہ کرنے کے بعد انکی شاعری کا لب ولہجہ امید وآسرا اور تلاش وجستجو سے ناامید بن کرایک شعلہ برساتی، گرجتی، برستی اوراظہار بےزاری ونفرت میں بدل جاتی ہے جوکہ شاعری میں حقیقی طور پر ان کی مہرک سے محبت و سچی دوستی کو بیان کرتی ہے۔

پنجگور رتا جیونی ءَ	کابل تاں غزنی ءَ
گنداوہ ءُ مری ءَ	نگنداں چشیں پری ءَ
رفتوں پہ ملک تہران ءَ	واتر کت اوں ایرافشاں

من مہر گل ءَ نگنداں

اس شعر کا صرف وہی شخص معنی وپس منظر کو بہتر انداز میں سمجھ سکتا ہے جنہیں عزت کی عشق ومحبت کے پیمانے کا اندازہ ہو۔انہیں مہرک کی مہک وحسن کے علاوہ ہر وہ شے سے محبت ہے جومہرک سے بلواسطہ یابلاواسطہ قریب یا دور سے کوئی تعلق ورشتہ رکھتا ہو۔ پھول، شرارہ آنکھیں، گھنے بال حتیٰ کہ پیردان کی خشک پہاڑوں، پتھروں، در ودیواروں جوکہ بصیرتوں اور سماعتوں اور خواب وخیالوں میں بھی نہ ہوان کی خوبصورت کلمات میں سمٹ جاتے ہیں۔انکی شاعری خیالات وتصورات سے زیادہ تیز گرج چمک کے ساتھ دیوانگی اور پاگل پن کی حد تک مہرک کو دنیا کے ہر کونے وحصے میں جانا ممکن بھی نہیں تلاشتی رہتی ہے۔وہ اپنے آبائی علاقے پنجگور کوایرافشان کے ساتھ اسطرح جھوڑتا ہے جیسے محظ ایک ہی زمین کے دوٹکڑے ہوں جوکہ قدرتی طور پر ایک ہوں۔لیکن وقت وحالات نے محظ طاقت وقوت سے جدا کی ہوں۔ وہ اپنے سوچ میں اتنا کینوس رکھتے ہیں کہ مہر ومحبت کسی چیز ودائروں کی محتاج نہیں کوئی جغرافیہ حتیٰ کہ سرحدوں کو بھی نہیں۔

مجنون ءُ بے سرورمن اوں
فرہادسرگشتہ من اوں

من چومریدءَ عاجزوں
بے صبرءُ بے آرام دلے اوں

عزت منال چوبلبل ءَ
ہرروچ منی سرگوں گماں

نعت رسول آخرزمان
بیاات منی بیل ءُ یلاں

اے شاہیں خداءِ قدرتاں
چوستکیں پروانگاں

ان کی شاعری ماضی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حالات و سچی داستانوں سے بے خبر و آشنا نہیں۔انہیں بھی اپنے منطقی انجام و منزل کا خوب پتہ ہے۔جدا ہونا، بچھڑنا بذات خود ایک بے قراری اور تلاش و جستجو کی جانب ایک نئی سفر پر اکثر مجبور کرتی ہے۔وہ اپنی شاعری کے ذریعے مہرک کو قدرت کا ایک عظیم تحفہ قرار دیکر خود کو زندگی کی تمام آرام و آسائشوں اور کثافتوں سے بہر حال خود کو بچاتا ہے جو کسی کے یا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔عزّت اپنی شاعری سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک سچے و پاک محبت کی مضبوط دھاگے میں بندھے ہوئے ہیں جسے آسانی سے آزاد و جدا نہیں کیا جاسکتا۔

مہرک وتا لیلیٰ کنت
مہرک وتا شیریں کنت

مہرک وتا حانی کنت
زانیں منارا خوار کنت

نالگاں گل رحم کنت
گوں قادرءَ فریاد کنت

صدتحفہ صلوات کنت
زردوں مریت یے یات کنت

انکی شاعری میں اس کے جذبات اور احساسات کی وہ قدریں یکساں ہیں جنہیں جغرافیائی حدود اور تاریخی تقسیم میں منقسم نہیں کیا جاسکتا۔وہ اپنی شاعری میں مہرک کو قدیم و ماضی کے ان عظیم پاک و سچے محبوبوں سے جوڑتے ہیں جو تاریخی اعتبار سے عشقی داستانوں میں لیجنڈ روپ دھار کر ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔وہ اپنے لہجے و انداز میں اپنی داستان کو سمیٹنے کی بھر پور صلاحیت رکھتے ہیں جو کہ کسی شاعر کی علمی و شعوری وسیع سوچ و فکر کی غمازی کرتی ہیں۔اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی شاعری اس دور و زمانے کی زیادہ داخلی

حالات و مفکرات کی زبردست نمائندگی کرتی ہے جو اپنے ذات کے اندر گم سم نہیں۔ ان کی شاعری ان کے ذات تک محدود نہیں بلکہ عشق و محبت کی نمائندہ و پرورشاعری ہے۔

اس لئے کہا جاتا ہے کہ عشق و محبت کو کسی بھی جغرافیائی سرحدوں اور حدود و دائروں میں قید بند نہیں کیا جاسکتا۔ ملا عزت اپنی تمام تر شاعری میں اس دلیل و منطق کو خوب آشکار کرکے ثابت کرتے ہیں کہ حقیقی محبت پاک و سچی عاشق کسی معروضی و اندرونی و بیرونی حالات و موافقت کی کسی طرح محتاج نہیں۔ شاعر دراصل حساس شخصیت کے ساتھ ساتھ انسانی ضمیر کے حقیقی نمائندے وسفیر ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ محبوب اور عصر حاضر کی طرح بے حس و بنجر گیابان ہونے کے بجائے داخلی سطح پر بھرپور متحرک بن جاتے ہیں۔

وہ مہرک کے حسن میں دیوانگی کی حد تک پیردان کے گلی کوچوں میں اسے پانے کی چاہت میں دیوانہ شاعر بن جاتے ہیں۔ جس سے انکی شاعری میں ولولہ و جوش کے ساتھ پختگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

ہر بار اسے پڑھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ مہرک اس کے لئے اور وہ مہرک کیلئے پیدا ہوئی ہے۔ ایسے خیالات وتفکّرات کا ذکر انکی شاعری کی سب سے بڑی و جاندار خدوخال ہیں۔

ان کی شاعری کے سامنے سمجھوتے، ریاکاری اور کم ہمتی بالکل بے معنی زرّہ زرّہ بن کر خاشاک ونیست و نابود ہو جاتی ہے۔

موسے گوست تاں ہدّ ے نہہ ماہ ءَ　　　　تھپے جوانیں دات من ءَ شاہ ءَ

مہرک پیدا ک بوت چہ رب ءِ درگاہ ءَ　　　　مات ءَ پہ زاری پنڈا تگ چہ رب ءَ

پیرو رپتگ گوں شکل ءُ شیراں

''نو مہینے کی رُت کے بعد پروردگار کی جانب سے ایک نایاب تحفہ مجھے نصیب ہوا کہ مہرک پیدا ہوئی۔ پیرو بزرگوں اور ماں کی منتوں اور دعاؤں کے عوض، اسکی پرورش شہد و دودھ سے ہوئی تھی۔''

انکی شاعری عہد بہ عہد عشق و محبت کی عظیم داستان کو انسانی ذہن کی روح پرور تازگی

کے مترادف ہے۔ وہ اپنے اندر رومانوی داستانیں ساتھ لیکر کس خوبصورتی سے اپنی شاعرانہ مہارت کی غمازی کرتے ہیں۔

ننداءُ نیادے ماں حصارانت — دیمیں چونوک سجیں سگاراں انت
روئے چو شمس ءِ حاوری آں انت — پادئِ گوں کیچ دوچیں زری آں انت
مات اگاں شمشیری درے سندیت — پہ حسد چشیں دخترے گندیت

ملا عزت صاحب طرز شاعر تھے۔ ان کا اپنا جداوا الگ اسلوب تھا۔ جس نے بلاشبہ اپنی شاعری سے زبان وادب میں نئی تراکیب پیدا کی۔

عزت و مہرک کی داستان عشق جو محبت و دوستی کے عظیم کلمات و پیرائے میں مقید وسند ہیں۔ ان کی شاعری جدید دور تک ویسے ہی مقبول وزبان زدعام ہے جیسے پہلے ہی تھا۔ اب بھی ان کی شعر خاص موقعوں، تہواروں، محفلوں اور میلوں میں کثرت سے خوش الحانی سے گائے جاتے ہیں و یکساں طور پر مقبول ومعروف سدابہار ہیں۔

عزت پنجگوری

من رپتگوں خراساں

ھندوکٹ ءُ بوپاں

سیل داتگوں یہوداں

نیست صورت گل اندام

ایران رنگ تواران

اتکوں پہ اے خراساں

من مہرک ءَ نہ گنداں

آرام دل نہ ننداں

پنجگورتاں کولواہ ءَ

اور ماڑہ ءِ متاہ ءَ

جن کلمت ءِ جتاانت

بلے نئے چو مہرک ءَ انت

گوادر چہ پسنی ءَ

کپرتاں پیشکان ءَ

گرداں بسولکاں ءَ

من مہرک ءَ نہ گنداں

سرباز شہر پیردان

رپتوں تمام ایران

باب دہم

علمی وادبی شخصیات

کئی دہائیوں سے پنجگور علمی، ادبی اور سیاسی وسماجی سرگرمیوں کا محور ومرکز ہے۔ اس علاقے کو ایک مردم خیز خطے کا اعزاز بھی حاصل ہے جو کہ اعلیٰ ذہین، عالم وفاضل علمی وادبی و سیاسی وسماجی شخصیات کو اپنے وسیع دامن میں سمیٹتا رہا ہے۔ وہ نہ صرف اس خطے کے اندر بلکہ دنیا بھر میں اپنی فہم وفراست اور علمی ذوق وشوق کے بدولت ایک الگ شناخت و پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس علاقے کے لوگوں کا ماضی سے حال تک علمی وادبی ذوق وشوق یکساں طور پر بحال وبرقرار ہیں۔

چونکہ ملک کے دیگر علاقوں کی نسبت بلوچستان میں اعلیٰ تعلیمی اداروں اور ٹیکنیکل وفنی شعبوں کے نہ ہونے سے شرح خواندگی میں کم ترین سطح پر ہے۔ لیکن ان تمام تر حالات کے باوجود عوام کی علم دوستی کے والہانہ ذوق شوق کے بدولت پنجگور کا شمار اعلیٰ علمی علاقوں میں کیا جاتا ہے۔

بلوچستان پر انگریزوں کی تسلط وقبضہ گیریت کے زمانے ہی سے یہاں پر ایک تعلیمی ادارہ قائم تھا۔ جہاں جس سے آٹھویں جماعت تک درس وتدریس ہوتی تھی۔ یہ ادارہ پورے علاقے کے اندر درس وتدریس وعلم کی روشنی پھیلانے کا ایک واحد ذریعہ تھا۔ لیکن آٹھویں جماعت تک پڑھنے کے بعد امتحان کیلئے کافی دور کوئٹہ کے قریب مستونگ میں جانا پڑتا تھا۔ ان ہی دور میں کافی لوگ علم کے زیور سے آراستہ ہو کر مختلف قومی اداروں سے منسلک ہوئے۔ 1948 میں اس ادارے کو ہائی سکول کا درجہ دیا گیا اور یہ ادارہ اب ماڈل

سکول پنجگور کے نام سے قائم ہے۔مختلف زمانوں میں اس ادارے سے کئی نامور و اعلیٰ ذہین شخصیات علم کے زیور سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔اس ادارے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ دیگر کے علاوہ جدید عہد کے نامور اردو اور بلوچی زبان کے شاعر و ادیب اور قلمکار عطاء شاد نے دسویں جماعت تک اسی ادارے سے تعلیم حاصل کی تھی۔

جب کہ ماسٹر یار محمد بلوچ کا شمار انگریزوں کے زمانے سے ہی علاقے میں درس دینے والے پہلے شخص کے طور پر کیا جاتا ہے۔جنہیں پنجگور کے اولین معلم کا اعزاز بھی حاصل ہے جو کہ 105 سال کی عمر میں 2005 کو وفات ہوئے۔اور اسی طرح مکران ہی سے فقیر بلوچ اور حسن بلوچ علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔اور اس زمانے میں دنیائی تعلیم کے ساتھ دینی درس گاہوں سے محدود پیمانے میں درس تدریس سے بہت سے عالم و فاصل پیدا ہوئے جو تاریخی کردار کے حامل رہے ہیں۔

☆☆☆

ایوب بلوچ

ایوب بلوچ وادی پنجگور کے ایسے فرزند ہیں جو اپنی ذہانت، قابلیت وملنسار شخصیت کے بناء پر اپنی الگ وجدا شخصیت بنا کر ملک بھر میں جانے جاتے ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ابھارنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

خوش مزاج، خوش لسان، ادیب ودانشور ایوب بلوچ 8 دسمبر 1946ء کو پنجگور کے علاقے سوردو میں حاجی پھلین بلوچ کے گھر پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے علاقے ہی سے حاصل کی بعد میں تعلیمی منازل طے کرتے ہوئے کراچی یونیورسٹی سے سوشیالوجی (Socialogy) میں ایم اے کی ۔ 1970ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری بھی حاصل کی۔

اپنے پیشہ ورانہ ملازمت کے دوران کمشنر بلوچستان ایمپلائز سوشل سیکورٹی انسٹیٹیوٹ کے ساتھ ساتھ اطلاعات، انفارمیشن ٹیکنالوجی کے محکموں میں بطور سیکریٹری رہے اور اب اپنے علمی وادبی صلاحیتوں کے بدولت بلوچستان پبلک سروس کمیشن میں بطور ممبر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہیں ابتدائی ہی زمانے سے علم وادب اور خاص کر بلوچی زبان و ادب سے کافی گہری لگاؤ رہی ہے۔

انہوں نے قلیل مدت میں بلوچی ادب میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کیلئے بلوچی میں تاریخی ڈرامے تحریر کئے۔ جو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی تاریخ میں مدتوں تک یادر کھے جائیں گے۔ انکے زیر سایہ بلوچی اور انگریزی میں ماہنامہ "چاگرد"، جس سے بلوچی زبان وادب کوفروغ مل رہا ہے، ادارت میں شائع ہورہی ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

"پوریات ءِ ارزش" 1980 بلوچی اکیڈمی کوئٹہ اور "راجی خدمت" 1982 بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ان کی اہم تصانیف میں سے ہیں۔ انہیں بلوچی اکیڈمی کے جنرل سیکریٹری ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔

ان کو ان کی اعلیٰ کارکردگی اور علمی ادبی، سماجی اور علم ادب کے شعبے میں گراں قدر خدمات پر سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات سے وقتاً فوقتاً نوازا گیا ہے۔

پروفیسر غنی طارق

علمی ادبی اور سیاسی گلدستے میں پرورش پانے والے اعلیٰ وسیع تر ذہن وفراست پاکر بلوچ سماج میں ایک سایہ دار وتناور درخت کی روپ دھارنے والے واجہ غنی طارق نے 26 دسمبر 1947ء کو واجہ غلام محمد بلوچ کے گھر پنجگور کے علاقے خدابادان (سراوان) میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم پنجگور ہی سے حاصل کی اور بعد میں مزید تعلیم کیلئے کوئٹہ چلے گئے۔

انہوں نے تاریخ (History) میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی اور بی ایڈ (B.Ed) کی اضافی ڈگری لینے کے بعد کالج میں بطور لکچرار ملازمت اختیار کی۔

وہ بچپن ہی سے یعنی زمانہ طالب علمی سے علمی، ادبی وسیاسی سرگرمیوں میں متحرک و فعال رہے۔ وہ ایک سادہ وکم گو، کافی ذہین اوردانش مند وشعوری وفکری انسان ہیں جو کہ منطق، دلیل علم اور تجربات کے روشنی میں قائل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ خاموش مزاج وپرکشش انسان ہیں۔ جس سے دیوان کرنے وگفتگو سے ان کے اندر موجود بھرپور خداداد صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے تاریخ، سیاست اور علم وادب کا وسیع ذخیرہ جلد ہی امنڈھ کر سامنے آتا ہے جو کہ کم ہی شخصیات میں اسطرح کی خداداد تخلیقی وتحقیقی علم وشعور ہوتی ہے۔

ان کا علم وشعور سے مضبوط رشتہ وناطہ جنون کی حد تک قائم ہے۔ اسی بناء پر اس نے زندگی میں اس راستے کا انتخاب کیا جو درس گاہ سے درس گاہوں تک کا فکری سفر ہے۔ انہوں نے ہمیشہ زندگی بھر ذہنی وفکری سفر کو طے کرنے کو ترجیح دی۔ اسی لئے ذہنی شعوری وفکری سوچ کا منبع ومرکز ثابت ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ زندگی بھر علم وشعور کی روشنی پھیلانے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

اور یوں وہ سیاسی ونظریاتی حوالے سے ہر وقت اپنے کردار اور عمل سے صحیح معنوں میں قوم پرستانہ کردار کے حامل شخصیت جانے جاتے ہیں۔

وہ بلوچستان میں استحصالی، طبقاتی وفرسودہ قبائلی نظام کی جگہ ایک جدید ترقی پسند نظام

کے قیام کے تمام تحریکوں میں سرگرم وفعال دکھائی دیتے ہیں۔اور ہمیشہ ہرلمحہ قوم پرستانہ سوچ وفکر کوتقویت دینے میں دیگر رہنماؤں کے ساتھ برابر شریک کار رہے ہیں۔انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں عوام اور خاص کر نوجوان طبقہ کی بھرپور رہنمائی اور بلوچ طلباء تنظیم بی ایس او(BSO) کے قیام اور تحریکوں میں ایک نظریاتی وفکری کردار کے حامل جانے جاتے ہیں۔اور تمام مشکل حالات میں قوم پرستانہ کردار کے اہم پالیسیوں میں تھنک ٹینک کے طور پر رول ادا کی ہے۔

وہ ایک نامور ادیب وقلمکار ودانشور ہیں۔وہ بلوچی زبان وادب میں نثر نگاری اور افسانہ نگاری کی بنیاد اور مستحکم روایت ڈالنے والوں میں اولین کردار کے طور پر گنے جاتے ہیں۔

وہ اس عہد کے نامور افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔وہ کئی کتابوں کے مصنف و محقق ہیں۔اور 1987ء میں اکادمی ادبیات کی جانب سے انکے بہترین بلوچی افسانوں کا مجموعہ ''جلار'' کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پروفیسر شکر اللہ بلوچ

3 فروری 1931 / 13 نومبر 2000

پروفیسر شکر اللہ بلوچ ملک کے نامور ماہر تعلیم ، معاشیات دان اور ایک بہترین ایڈمنسٹریٹر اور دانشور مانے جاتے ہیں۔ وہ بلوچستان کے مردم خیز علاقہ پنجگور (خدابادان) میں 3 فروری 1931 کو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔

وہ اپنی انتھک محنت و مستقل مزاجی کے سبب جلد ہی تمام حلقوں میں پہچاننے لگے۔ اور ابتدائی تعلیم اپنے ہی ضلع میں حاصل کرنے کے بعد 1961ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے کی۔ اور 1963 کو کراچی یونیورسٹی سے معاشیات (Economics) میں ایم اے کی۔ بعد میں مزید تعلیم کے حصول کیلئے 1973 کو بیرون ملک چلے گئے ۔ یونیورسٹی آف وسکومنسزم امریکہ سے معاشیات میں ڈبل ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

چونکہ وہ 1962ء کو درس وتدریس کے عمل سے وابستہ ہوئے۔ تاہم اس دوران بھی باقاعدہ مزید علم کے حصول کیلئے سرگرداں رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی بھر کے تجربات و مشاہدات سے ثابت کی ہے کہ وہ علم کے دیوانے اور پیاسے تھے جو ہمیشہ اپنی زندگی کے تمام رشتے ناطوں کو اسی شعبے سے منسلک وابستہ بنائے رکھا رہا۔

وہ 1972ء کو بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کے چیئرمین ہوئے۔ وہ اپنے پروفیشن کے دوران یونیورسٹی کے اہم انتظامی و تدریسی شعبوں سے وابستہ رہے۔ وہ 1989-1990ء میں ایکٹنگ وائس چانسلر اور 13 نومبر 1993 کو پرووائس چانسلر اور 1995-1999ء ڈائریکٹر نیپا (NIPA) رہے۔

واجہ شکر اللہ بلوچ نے 2000ء کو بلوچستان یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد بلوچستان پبلک سکول سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ وہ بلوچستان کے علمی وتدریسی عمل کے گہرے ستون و علامت جانے جاتے ہیں۔ وہ زندگی بھر بلوچستان میں علم وآگہی پھیلاتے رہے۔ یہ علم وشعور کے چانسلر 2 جنوری 2000 کو وفات کرگئے۔

انکی سیمناروں، پرمغز حاصل سیر مکالمات اور تھیسز معاشیات کے شعبے میں بین الاالقوامی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ آج بھی ملکی سطح پر علم معاشیات کے شعبے کے اہم استاد و ماہر مانے جاتے ہیں۔

حاجی عبدالقیوم بلوچ

8 اگست 1925 / 28 نومبر 1999

ایک پر خلوص و مہربان شخصیت جو زندگی بھر بلوچی زبان و ادب کیلئے انتھک جد و جہد پر گامزن رہنے و ثابت قدم اور مہر و محبت بکھیرنے والے عبدالقیوم بلوچ 8 اگست 1925ء کو پنجگور کے مردم خیز علاقے خدابادان (سراوان) میں ولد شیر محمد کے گھر پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم پنجگور ہی سے حاصل کی۔ بچپن ہی میں اساتذہ کرام نے والدین کے نیاز محمد کو عبدالقیوم ہی بنا ڈالا۔ دنیا نیاز محمد سے تو فراموش رہی لیکن عبدالقیوم نے بلوچی زبان و ادب کے دامن کو اتنی جامع وسعت فراہم کی جو رہتی دنیا تک بلوچ قوم کے لئے ناقابل فراموش رہے۔

مارچ 1942ء کو اسٹیٹ ہائی سکول مستونگ سے میٹرک پاس کی اور بعد میں سکول ٹیچر کے طور پر ملازمت اختیار کی۔ انہوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو برقرار رکھتے ہوئے 1964ء کو بی اے اور 1967ء کو انگریزی ادب میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ 1971ء میں ایل ایل بی کی اضافی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ملازمت کو خیر باد کر کے قلات فیڈرل سروس میں ملازم ہوئے۔

حاجی عبدالقیوم بلوچ نے 1958ء کو ایوبی مارشلاء کے دور میں جہاں ملک میں سیاسی وسماجی سرگرمیوں اور تقریر و تحریر پر سخت پابندی و قدغن کے دوران ایک مرد آہن بن کر آمرانہ نظام اور بلوچ قوم کے سیاسی وسماجی و قومی حقوق کیلئے زبردست سیاسی تحریکوں کا حصہ بن کر فعال کردار ادا کی۔

وہ زمانہ طالب علمی ہی سے سیاسی و ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے ہیں۔ جب 14 اگست 1948ء کو جونئیر کلرک کے سرکاری عہدے پر تھے تو اپنی ملازمت کی پرواہ کئے بغیر بلوچی جذبہ و جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک بھر کے بلوچ رہنماؤں، سرداروں،

نوابوں، طلباء، دانشوروں اور قلمکاروں و سیاسی قیادت کی ایک ملک گیر کانفرنس بلوچستان کے علاقے مستونگ میں بلائی۔ یہ کانفرنس انکی خداداد صلاحیتوں کا مظہر تھا۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈپٹی کمشنر مستونگ اسلم باجوا اور عظیم بلوچ سیاسی رہنما میر غوث بخش بزنجو اور دوسری نشست کی پرنس آغا عبدالکریم بلوچ اور تیسری نشست کی بلوچ قوم پرستانہ سیاست کے روح رواں نواب خیر بخش مری نے کی۔ جبکہ اسی کانفرنس میں چیف آف سراوان نواب غوث بخش رئیسانی نے بلوچی رسم الخط کے بارے میں اپنی تحریر کردہ مقالہ بھی پیش کیا۔

یہ کانفرنس اپنی نوعیت و ہیت کے اعتبار سے پہلی بلوچ اجتماع تھی۔ جس میں تمام مکاتب فکر کے بلوچ شریک کار رہ کر پہلی دفعہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے تھے۔ جس کا کریڈٹ عبدالقیوم بلوچ کے سر ہی جاتا ہے۔ یہ کانفرنس بلوچی زبان وادب کی ترقی وترویج کے ساتھ ساتھ قومی اتحاد و یکجہتی اور بلوچ قوم پرستانہ سیاست کا ارتقاب بنا۔

مقتدرہ انکی سیاسی وسماجی وقومی بقاء و تشخص کی جدوجہد اور عوام کو سیاسی، فکری ونظریاتی بنیادوں پر منظم کرنے پر سخت خفا ہوجاتے ہیں۔ انہیں 18 اکتوبر 1948ء کو گرفتار کیا جاتا ہے اور ان پر سنگین قسم کے مقدمات قائم کئے جاتے ہیں۔ اور ملک میں مارشلاء نافذ ہونے کے بناء پر سیاسی و سماجی سرگرمیوں، تقریر و تحریر کی خلاف ورزیوں اور قوم دوستانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے پر چھ مہینے جیل کی سزاء ہوجاتی ہے۔ لیکن جوان مرد آہن کے حوصلے اور جذبے چٹان کی مانند قوی ومضبوط و پختہ تھے جو ہرصورت اپنے آپ کو قومی جدوجہد سے قطع تعلق نہ کی۔

انہوں نے ریڈیو پاکستان کراچی سے بلوچی زبان میں پروگرام کرانے میں اہم کلیدی کردار ادا کی۔ وہ زندگی میں کافی متحرک وسرگرم شخصیت کے حامل انسان سمجھے جاتے ہیں۔

جون 1957ء میں اپنے دیگر کئی علمی وادبی شخصیات کے ساتھ بلوچی زبان وادب کی ترقی وترویج کی خاطر بلوچی دیوان کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کرنے میں کامیاب

ہو جاتے ہیں۔ بعد میں یہ تنظیم بلوچ قوم کیلئے ایک بڑا قومی ادارہ بننے کا سبب و بنیاد بنا۔ وہ بلوچی اکیڈمی کے قیام کیلئے کافی سرگرم و متحرک ثابت ہوئے۔ وہ ملک میں بلوچی زبان کو قومی زبان بنانے کیلئے ہر فورم واداروں میں دلیل دیتے رہے۔ اسی حوالے سے انہوں نے مغربی پاکستان اسمبلی کے بلوچ ممبران سردار عطاء اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری، نواب غوث بخش رئیسانی، میر یوسف علی خان مگسی، شیخ عمر خان گچکی، جام غلام قادر اور میر بلوچ خان نوشیروانی کو بلوچی زبان کو قومی زبان قرار دلوانے کی تحریک اور بلوچی اکیڈمی کے مالی معاونت کیلئے آمادہ کرانے میں کامیاب ہوئے۔ آخر کار 1960ء کو باقاعدہ طور پر ان کی سربراہی و سرپرستی میں بلوچی اکیڈمی کے قیام کا اعلان ہوا۔ وہ اس عظیم قومی ادارے کے پہلے کنوینر مقرر ہوئے۔

وہ ایک متحرک و فعال شخصیت تھے۔ وہ بلوچ سیاست و ادب کو علمی و سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کے راہ پر ڈالنے میں ہمہ وقت سرگرم و متحرک رہے۔

وہ ایک روشن خیال اور ترقی پسند لبرل ذہنیت کے حامل قوم پرست سوچ و فکر رکھنے والے شخصیت تھے۔ اگر انہیں بلوچ قوم پرستانہ سوچ و فکر کی ابتدائی روح رواں اور آبیاری کرنے والوں میں شمار کیا جائے بھی تو غلط نہ ہوگا۔

1960ء کے زمانے میں جب وہ ملازمت کے سلسلے میں کوئٹہ میں مقیم تھے تو وہ بلوچ نوجوان سیاسی کارکنوں کی علمی و ذہنی و سیاسی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دیگر تعلیمی، سیاسی و سماجی مسائل سے قطع تعلق بھی نہ تھی۔

ان کی علمی و ادبی کارنامے یقینی طور بلوچی زبان و ادب کیلئے ایک ذخیرہ سے کم نہیں۔ انہوں نے ہمیشہ ایک محقق، مورخ نثر نگار اور ایڈیٹر کے طور پر اپنی قابلیت و صلاحیتوں کو اجاگر کی ہے۔

وہ بلوچی زبان کے پہلے معیاری و جامع رسالے ''زمانہ'' کے ایڈیٹر و سرپرست رہے اور انکی نگرانی میں یہ رسالہ کئی سالوں تک چھاپ و نشر ہوتی رہی۔

عزت اکیڈمی پنجگور ہی کا قیام انہی کی مرہون منت ہے۔ان کا اس علاقے میں علمی و ادبی وسیاسی ماحول بنانے میں بڑا کردار ہے۔ وہ اس عہد کے ایک مردآہن تھے جو ہمیشہ اپنے مقاصد وفکر کی تکمیل کیلئے تمام مشکلات ومصائب کی پرواہ کئے بغیر ثابت قدم رہے۔ انہیں اس مشکل و کٹھن جدوجہد میں کافی اذیتیں و تکالیف برداشت کرنی پڑی انہیں ملازمتوں سے برخاستگی اور جیل وقید بند و مالی مشکلات سے دوچار ہوتے ہوئے بھی ان کے ارادے وعزائم میں کبھی بھی کمی اور نہ کہیں کسی بھی مرحلے پر قدم ڈگمگائے۔

وہ ہمیشہ ایک باعلم و باصلاحیت تاریخی کردار کے طور پر جانے جاتے رہینگے۔وہ اپنے اندر تمام خداداد صلاحیتوں کو سمیٹے ہوئے ناموراد یب ودانشور محقق ومورخ تھے۔کئی کتابوں کے تصنیف وتالیف اور مصنف رہے۔

''بلوچی بومیا'' 1964ء بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

''بلوچی رنگ'' 1972ء بولان کارپوریشن کوئٹہ

''رسول ءِ پاکیں زند'' 1980ء بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

''بلوچی بومیا'' دوئم 1997ء بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

ان کی کئی کتابیں ان کی زندگی میں تصنیف سے رہ گئیں۔

''بزانت بلد'' بلوچی انگریزی، اردو لغت

''زھگ رُدوم''

اور اسی طرح قران مجید کا بلوچی ترجمہ جو کہ انہوں نے کافی جامع وآسان وقابل فہم بنا کر تیار کی لیکن تاحال چھاپ نہ ہوسکی ہے۔

یہ بلند پایہ کے علمی وادبی وسیاسی شخصیت 28 نومبر 1999ء کو کراچی میں وفات ہوکر وہی پر مدفن ہیں۔انکی زندگی حقیقی معنوں میں نوجوان نسل وقومی سوچ وفکر رکھنے والے ہر انسان کیلئے ایک تابندہ روشن ستارہ ومشعل راہ ہے۔

حکیم بلوچ

عبدالحکیم بلوچ 25 دسمبر 1946ء کو مچگور خدا باداں میں نور محمد کے گھر پیدا ہوئے۔
بنیادی تعلیم مقامی تعلیمی ادارے سے حاصل کی۔ وہ مزید تعلیم کیلئے کوئٹہ اور کراچی گئے۔
ڈگری کالج کوئٹہ اور کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کی تعلیم حاصل کی۔

انہوں نے 1972ء میں بلوچستان پبلک سروس کمیشن کے امتحانات پاس کی اور بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر سرکاری ملازمت کا آغاز کیا۔ وہ اپنے پیشہ ورانہ ملازمت کے دوران کوئٹہ، سبی اور ژوب ڈویژنوں میں بحیثیت کمشنر بھی فائز رہے۔

وہ علاقے کے ان ہی کم شخصیات میں سے تھے جو اپنی اعلیٰ تعلیمی وقابلیت کی بنا پر اہم اعلیٰ سرکاری عہدوں پر رہے۔ صوبائی محکمہ لیبر، داخلہ، تعلیم، خوراک اور ایس اینڈ جی اے ڈی کے سیکریٹری اور آخر میں ایڈیشنل چیف سیکریٹری کے اعلیٰ صوبائی عہدے پر ہی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

حکیم بلوچ زمانہ طالب علمی سے سیاسی، علمی و ادبی سرگرمیوں میں فعال اور متحرک رہے۔ وہ 1962ء میں ورنا وانندہ گل جو بعد میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (BSO) میں تبدیل ہوئی کے بانی صدر رہے۔ علم و ادب میں بلوچستان کے ان منفرد شخصیات میں سے ہیں جن کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ ایک منفرد ماہر لسانیات اور انہیں کئی زبانوں پر عبور و دسترس ہے۔ وہ کافی زمانوں تک ماہنامہ اولس (بلوچی) کے ایڈیٹر بھی رہے۔

وہ ایک بڑے ادیب ودانشور تاریخ دان اور محقق ہے جو آج تک مسلسل ملکی روزناموں میں اردو، انگریزی میں سیاسی تجزیہ وکالم لکھتے ہیں۔ انکی بلوچی اردو، انگریزی میں مختلف موضوعات پر کئی کتابیں دستیاب ہیں۔

افسانہ نویسی، ڈرامہ نویسی، سیاسی تجزیہ نگاری اور کالم نویسی انکی خاصی دلچسپ ترین موضوعات ہیں۔ وہ اردو، انگریزی اور بلوچی میں دس کتابوں کے مصنف ہیں۔

گچین، شبیہ شاد، آس ءِ چہر، Tears of Ressuxtion، سنگ گران، کاندیت اور بلوچ قومیت خانیت وسرداریت انکی اہم تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی

اگر اس عہد کے ان بلوچ شخصیات کا تذکرہ ہو تو یقینی طور پر ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی جو ایک ایسے محقق، تاریخ دان، نامور ادیب و دانشور و قلمکار ہیں جو بلوچ قوم و اپنی سرزمین کے لئے علم و شعور کی طاقت اور قلم کی تیز دھار پر الم بغات سے تبدیلی کے خواہاں دکھائی دیتے آرہے ہیں۔

وہ زمانہ بچپن ہی سے ایک ایسے معاشرے و سماج میں شعوری و فطری طور پر لڑ رہے ہیں جو کہ غلامی، بدحالی اور مفلسی کے زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو تمام مشکلات و مصائب کو اپنے دہلیز پر پا کر بھی راہِ فرار اختیار کرنے کے بجائے ہمیشہ جدوجہد کو ترجیح دی اور میدان عمل میں برسر پیکار رہ کر مرد میدان ہونے کا عملی ثبوت دیتے رہے۔ حاکم طبقہ سے سماجی تعلق اور وابستگی بھی اسے اس راستے پر گامزن ہونے سے نہ روک سکی جو کہ اکثریت کو سماج کے پر تعیش و بارونق حسین زندگی کے اسیر و قیدی بنانے پر مجبور کرتی رہتی ہے یا اکثر قوم و سرزمین کے سیاسی و سماجی ترقی و خوشحالی کے کھٹن جدوجہد کے عمل کو ترک کر کے راہ خاموشی و گمنامی میں چلے جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی 1942ء کو پنجگور میں میر یوسف خان گچکی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بچپن ہی میں علمی و ادبی و سیاسی ماحول میں تربیت و پرورش پائی تھی۔ چونکہ ان کا سلسلہ نسب مکران کے حکمران طبقہ سے جا کر ملتی ہے۔ تو ان کو یہ ماحول زمانہ بچپن ہی میں اٹھتے بیٹھتے قدرتی طور پر ورثے میں ملی۔ وہ ایک اعلیٰ و دور اندیش ذہین اور فہم و فراست کے مالک شخصیت ہیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم پنجگور ہی سے حاصل کی۔ 1958ء کو میٹرک کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے کوئٹہ چلے گئے۔ جہاں انہیں تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ذہین و معتبر علمی ادبی اور سیاسی و سماجی شخصیات کی قربت و نزدیکی حاصل رہی جس سے ان کو اپنی ایک الگ پرکشش شخصیت نکھارنے کا بڑا موقع ملا۔

گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے ایف ایس سی اعلیٰ نمبروں سے پاس کرنے کے بعد کراچی

سے ایم بی بی ایس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بعد میں ان کو اعلیٰ تعلیم کیلئے امریکہ اور پھر جرمنی جانے کا موقعہ ملا۔ جہاں سے انہوں نے ماسٹر کی ڈگری اور ڈپلومہ حاصل کیا۔ کراچی میں ان کو بہت بہترین دبی اور سیاسی ماحول میسر آیا۔ جس سے انہوں نے آج تک اپنا مظبوط ناطہ جوڑے رکھا۔

اسی اثناء میں انہوں نے باقاعدہ سرکاری ملازمت اختیار کی۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے ایک لائق و ہونہار طالب علم رہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ علمی وادبی و سیاسی سرگرمیوں میں برابر شریک رہے اور ہمیشہ سے بلوچ قوم پرست سیاسی قائدین کے ساتھ قریب ترین رشتہ و ناطہ رکھتے رہے۔ وہ ابتدائی ہی سے ترقی پسند، روشن خیال ولبرل اور تخلیقی ذہنیت کے حامل شخصیت جانے جاتے ہیں۔

وہ عملی زندگی میں شعوری وفکری اور علمی بنیادوں پر تبدیلی کیلئے جدوجہد کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہی سے زندگی کو دائروں میں بند کرنے اور محدود کرنے سے گریزاں رہے اور اپنی فکری نظر کو وسیع رکھا۔

انہوں نے اپنی گہری اور وسیع صلاحیتوں سے علمی ادبی، سیاسی وسماجی بنیادوں پر اپنے قوم کی ہر محاذ و پلیٹ فارموں پر رہنمائی کی۔

کراچی میں تعلیمی اداروں کے بلوچ دوست طلباء کے ساتھ مل کر جلد ہی کراچی کو قوم پرست سیاست و بلوچی زبان وادب کا مرکز ومحور بنانے میں اہم کلیدی کردار ادا کی اور ابتداء میں ایک ادبی تنظیم قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور کراچی سے گچین کے نام سے بلوچی ادب، سیاست، تہذیب وتمدن پرمبنی ایک رسالے کی اشاعت شروع کی۔ وہ جدید دنیا کی تیز اور روان دھارے میں بہہ جانے کے بجائے وقت کے دھارے کو اپنے مقاصد کی طرف موڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہر وقت اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بلوچی زبان وادب وقوم پرستانہ سیاست پر مرکوز کی۔

وہ زمانہ طالب علمی سے لیکر ملازمت کے ادوار تک ایک ہی پیمانے میں جدوجہد اور علم وادب سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک اچھے و نامور ادیب و دانشور اور

اپنے اندر خود انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بلوچی زبان وادب میں انگنت کام کئے ہیں۔ اُن کا نثر نگاری وتخلیق وتحقیق میں کوئی ثانی نہیں۔

انہوں نے بڑی کاوشوں سے بلوچی زبان کے بہترین وقدیم افسانوں کا مجموعہ بنا کر شائع کی۔ وہ بلوچی ادب میں افسانہ نگاری کے مستحکم روایت قائم کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں پر مبنی دو کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں کا محور ومرکز وزیادہ تر سماج کے اندر ہونے والے خرابیوں سے لڑنے، معاشرے کی فلاح وسماجی بہتری وترقی ہے۔ ان کی کہانیاں بلوچ سماج، معاشرے اور تہذیب وتمدن وثقافت سے کافی گہری قربت رکھتے ہیں جو ان کی بلوچ سوسائٹی کو عاقلانہ نگاہوں سے مطالعہ وقربت ونزدیکی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر قدیم زمانے کو جدید رنگ میں ڈھالنے کی مہارت نظر آتی ہے جو آج کے تحریر کردہ افسانوں میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا فسانہ وخلاصہ بلوچ سماج میں طبقاتی نظام، سماجی برائیوں، ظلم وجبر اور بدحالی کے خلاف لڑنے کی درس وسبق کے ساتھ، حوصلہ وجرأت مندی قوم وسرزمین کیلئے انگنت سبق آموز قصہ کہانیوں کے گرد گومتے نظر آتی ہیں۔

انہوں نے بلوچی زبان میں کافی پرانے اور غیر مستعمل الفاظ تلاش کئے۔ جس سے یقیناً بلوچی زبان وادب کو گہرائی اور وسعت ملی۔ ایک روشن خیال اور ترقی پسند دانشور وسیاسی سوچ وفکر رکھنے کے ناطے ہر طرح کے ظلم واستحصالی وطبقاتی نظام کے خاتمے کے خواہاں ہیں۔ اور اسی طرح وہ سائنسی وعلمی تقاضوں سے ہم آہنگ جدید دنیا کے بدلتے ہوئے حالات ومنظر نامہ کے عین مطابق بلوچ قومی جدوجہد کو منظم ومتحرک کرنے کے خواہاں ہیں۔ قومی اتحاد ویکجہتی وقومی تشکیل کے لئے مختلف گروہی وقبائلی لبادے سے باہر نکالنے کے لئے بلوچ قوم کو علم وہنر کے زیور سے آراستہ کرنے پر مکمل یقین سالم رکھتے ہیں۔

یاد رہے کہ ملازمت سے فارغ ہونے پر اکثر لوگ تھک ہار جاتے ہیں یا آرام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں یا خواب آشنائی کا دلدادہ ہوجاتے ہیں۔ لیکن وہ اس عمر میں بھی بلوچ نوجوانوں کے ساتھ مل کر جوش وجذبہ وہمت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔

وہ ایک ایسے زندگی کے فلسفے کے قائل ہیں جو شاید زندگی کو جاگتے وروانی کے ساتھ

گذارنا چاہتا ہو۔ انہوں نے ابھی بھی اپنے اور دوسروں کے درمیان فاصلہ و دوریاں پیدا نہ ہونے دی۔ ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی بلوچ تاریخ کے ان شخصیات میں سے ہیں جسے پڑھتے ہوئے اور سنتے ہوئے بھی کافی تشنگی اور خواہش باقی رہ جاتی ہے۔

وہ اپنی مادری زبان بلوچی کے علاوہ انگریزی اور اردو زبانوں پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان زبانوں میں مختلف موضوعات پر معلومات افزاء مکالمے، مضامین و تھیسز لکھے۔ وہ بلوچستان بائبلوگرافی (Balochistan a Biblography) نامی انگریزی زبان کے کتاب کے مصنف ہیں۔

ان کی بلوچی میں تحریر کردہ افسانوں کی کتابیں ''مہر ءِ تیاب'' 2008ء میں اور 2011ء میں ''شکل ءُ زہر آپ'' اور 2012 کو الم داستان (اردو) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ کئی غیر ممالک کا دورہ کر چکے ہیں اور اپنا ایک سفرنامہ طبع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

وہ اپنی ملازمت کے دوران کئی اہم کلیدی عہدوں پر خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ وہ بلوچستان کی واحد میڈیکل کالج (BMC) کے پرنسپل کے علاوہ ڈاریکٹر ہیلتھ بلوچستان و دیگر اعلیٰ وکلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ این جی او سیکٹر میں بھی بہت کام کر چکے ہیں۔ وہ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن (PMA) کے سرگرم رکن ہونے کے علاوہ اس کے صوبائی اور مرکزی صدر بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں کیمپوں کے ذریعے علاج معالجے کی سہولتیں پہنچانے کے یادگار کام کیئے۔

علاوہ ازیں وہ ایک بین الاقوامی این جی او فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن (FPA) کے سربراہ کی حیثیت میں انگنت فلاحی کام سرانجام دے چکے ہیں۔ جن میں کوئٹہ اور تربت میں سائیبان اور ساچان کے نام سے زچہ اور بچہ ہسپتال قائم کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی اس وقت بلوچستان ٹی بی ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔

وہ ایک عرصے سے کوئٹہ میں اپنے ایک ذاتی پیرا میڈیکل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ کوئٹہ (PMTI) کے سربراہی کرنے کے علاوہ بولان میڈیکل ڈائجسٹ کے نام سے ایک سہ ماہی انگریزی رسالہ بھی شائع کر رہے ہیں۔

وہ اپنی علمی و ادبی، سیاسی و سماجی اور تحقیقی و تخلیقی خداداد صلاحیتوں و نمایاں کردار و عمل کی رو سے ہمیشہ ایک تاریخ ساز شخصیت کے طور پر جانے جاتے رہینگے۔

ڈاکٹر علی دوست بلوچ

ڈاکٹر علی دوست بلوچ کو اعلیٰ ذہانت وفراست نے علمی وادبی مقام اور معروف معالج کی حیثیت نے جلد ہی علاقائی سرحدوں سے نکال کر ایک معتبر اور اعلیٰ درجے کا مقام دیا ہے۔

وہ 10 مئی 1955ء کو پنجگور کے ایک پسماندہ ترین گاؤں سریکوران میں واجہ مراد جان بلوچ کے غریب پرور گھر میں پیدا ہوئے۔ پسماندگی غربت اور پست معاشرہ انہیں ان کی منزل اور مقصد سے دور نہ کر سکی ہے۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد 1970ء کو گورنمنٹ ڈگری کالج کیچ سے ایف ایس سی شاندار نمبروں سے پاس کی اور 1980ء میں بولان میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ وہ زمانہ طالب علمی میں علمی وادبی سرگرمیوں کے ساتھ طلبہ سیاست میں فعال و منظم رہے۔

ایم بی بی ایس پاس کرنے کے بعد بطور میڈیکل آفیسر بلوچستان کے مختلف پسماندہ علاقوں میں شب وروز عوامی خدمت کی۔ انہوں نے ملک سے باہر پوسٹ گریجویشن کی اعلیٰ ڈگری آسٹریلیا سے حاصل کی۔

اب وہ صوبائی دارالحکومت کے سول ہسپتال اور بولان میڈیکل کالج میں نفرالوجی ڈیپارٹمنٹ میں کئی وقتوں سے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے منسلک ہیں۔

انہیں اپنے پیشہ ورانہ ملازمت کے ساتھ ساتھ زمانہ طالب علمی سے بلوچی زبان و ادب سے والہانہ لگاؤ جذبہ رہا ہے۔ وہ اپنے والہانہ جذبے و اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت بلوچی و اردو کے معروف قلمکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ کافی عرصے سے بلوچستان کی ایک معروف اردو روزنامہ ''جنگ'' میں بلوچی دیوان کے نام سے ادبی کالم تحریر کر رہے ہیں۔ جس سے بلوچی زبان وادب وثقافت اور تہذیب وتمدن کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔

وہ بلوچی میں شاعری کے ساتھ ایک منجھے ہوئے ڈرامہ نگار ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایپکیں راہ سر، ''برتاب'' کے مصنف ہونے کے ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن میں بحیثیت نیوز ریڈر، کمپئیر اور پی ٹی وی بولان سے بلوچی پروگراموں کی میزبانی بھی کر رہے ہیں۔

لچہ

ڈاکٹر علی دوست

گُجاشت اَنت آ گاراں
کہ گوست اَنت بے گُمانی ءَ
آ روچ ءُ آ تلائیں شپ
آ درد ءُ رژن ءِ ھمسپر
آ مہر درنزیں ماہکان
آ رست دلاناں تازگی
آ ساھتاں کہ گوستگیں
آ یات ءُ گیر ءِ ماہ ءُ سال
آ روچ ءُ آ تلائیں شپ
آ مہلبیں سمین ءُ کوش
آ نند ءُ نیاد دلبریں
ماں شیر گریں ساھگاں
کہ بیتگ انت دمانے ءَ
پہ ما گشے کہ مرچی ھم
آ ھست ءُ تازگ اَنت مُدام

فقیر محمد عنبر

اپنے گفتار و گفتگو میں عنبر و خوشبو پھیلانے والے فقیر محمد عنبر پنجگور کے علاقے گرمکان میں 1935ء کو واجہ پیر بخش بلوچ کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پنجگور ہی سے حاصل کی۔ انہیں بچپن میں لاشعوری انداز میں بلوچی شاعری کا ذوق وشوق پیدا ہوا تھا۔ اور بعد میں اسی ذوق وشوق نے اسے اس وقت کے بڑے پایہ کے شاعروں کے صف میں لاکر کھڑا کیا۔

وہ اپنے عملی زندگی میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر کوئٹہ میں مقیم رہے۔ اسی مناسبت نے انہیں نامور شاعروں، ادیبوں کے محفلوں اور مجلسوں کے بہت قریب لایا۔ انہوں نے بلوچی زبان کو ایک اچھی سنجیدہ اور باسلیقہ وشعوری شاعری دی۔ بلکہ وہ بلوچی نثر کی ابتداء وروانی اور رواج دینے والوں میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ بلوچی زبان کے ایک اچھے آزمانک کار (افسانہ نگار) ناول نگار اور ڈرامہ نویس ہیں۔ واجہ فقیر محمد عنبر ایک کیثر الجہتی شخصیت کے مالک ہیں۔ اور بلوچی ادب میں وہ واحد ادیب و دانشور ہیں جنہوں نے بلوچی ادب کو اپنی شعروں، افسانوں، ناولوں اور نثر نگاری سے بہت کچھ دیا ہے۔ وہ بلاشبہ اس عہد کے ان علمی و ادبی شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے بلوچی ادب کے دامن کو اپنی اعلیٰ علمی ذہانت اور قابلیت سے ایک جامع وسعت بخشی ہے۔

فقیر محمد عنبر کی شاعری میں جدّت، روانی و احساسات کی بھرمار اور سادگی ہے۔ جسے آسانی سے اپنے اندر سمویا جاسکتا ہے۔ ان کی سادہ شاعری میں سماج سے گلوے شکوے کے پردے میں کافی حکایات و بہتری نمایاں ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کو محظ شاعری میں قید ومحدود نہیں رکھتے وہ ادب کے تمام قلمی ذریعوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ بلوچی ادب کے ان پرانے ناول نگار و افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جو بلوچی ادب میں افسانہ نگاری اور خاص کر ناول کی روایات کو جنم دیتے ہیں۔ فقیر محمد عنبر کے شاعری، افسانوں اور ناولوں میں زندگی کے ہر کردار میں قدیم روایات کی جدّت رچی بسی ہوئی ہے جوان کے

اپنے نفسیاتی رشتے وتعلق کے اظہار ہیں۔ وہ ایک حساس انسان ہے جو اپنے عہد کے مسائل ومشکلات کا خوب ادراک رکھتے ہیں اور شعوری وفکری بنیادوں پر ان کے جامع حل کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔

عنبر اپنی شاعری میں خوشبو ومہر دوستی اور قوم ووطن سے والہانہ محبت کی واشگاف اظہار کرتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ مزاج ونفسیات وطن سے محبت ودوستی کی سب سے بڑی ثبوت ہے۔

وہ بلوچی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں لیب گوازی، شوھاز، اشکر، نل ءِ توار اور سنگرءِ ساھگ بہت اہم ہیں۔ وہ اب بھی اپنے علاقے میں علمی وادبی سرگرمیوں میں برابر شریک وسرگرم ہیں۔

ان کے سوچ وفکر میں اپنی زمین سے محبت اور اہل زمین سے گہری محبت وابستگی نمایاں ہیں۔ جو ان کی تمام تر شاعری وقصہ کہانیوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ وہ حقیقی معنوں کے ساتھ جدید زمانے میں داخل ہو کر ایک بلوچی قدیم روایات، تہذیب وتمدن وثقافت کو جدّت سے ابھارنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ ایک ذہین اور باعلم شخصیت ہیں۔ جس نے تخلیقات کے سفر میں اپنے تجربات اور فکری ہنرمندی کو ایک اعلیٰ مقام دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

دستونک

عنبر پنجگوری

نہ داریں من دل ءَ گیشیں تماھے
ھزار نازیں سر ءِ سوگند مارا

مہ ڈوباریں گلیں ھانل پہ چوشی
دل ءِ چماں دمانے گند مارا

نہ سندان اِش دل ءَ یاتاں او بیلی
بہ دنت کوڑو اگاں پَر سند مارا

نلکیں نشگاں تنگاں زھیراں
نہ پِیتی بے مرادیں نند مارا

نہ بنداں پہر پہ دور ءِ ربیھاں
نہ ئینت درکار گداریں زند مارا

جن ءَ بیگانگ ءِ زنگ ءَ تو عنبر
مروچ پیکور ءِ زنگ ءَ تو عنبر

عنایت اللہ قومی

1933 / 23 اگست 2009ء

عنایت اللہ قومی پنجگور کے علاقے خدابادان میں قاری عبدالخالق بلوچ کے گھر 1933ء میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کی لاکھ بھر کوششوں کے باوجود انہیں درس وتدریس سے دلچسپی نہ رہی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی اور بعد میں کچھ وقتوں تک مختلف دینی اداروں سے مذہبی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

انہیں تمام تر حالات کے باوجود فطری طور پر بلوچی لبزانک وادب سے ہمیشہ سے گہری لگاؤ رہی۔ انکے اس جذبہ وجوش نے جلد ہی انہیں ایک باصنف افسانہ نگار، قلمکار ومعروف ومقبول شاعر بنایا۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بلوچی رسالے ''اومان'' سے شروع کی۔ اس کے بعد وہ بلوچی ادب میں شاعری اور افسانہ نویسی میں اپنا الگ ومنفرد مقام پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

بلوچی لبزانک میں ان کے افسانے ''شیشلو'' کو بلوچی کا ابتدائی اور اولین افسانہ کہا جاتا ہے جو ماہنامہ ''اومان'' میں 1952ء شائع ہوئی تھی۔

وہ ایک گہری وحساس شخصیت کے مالک تھے۔ جس کے دیوان ومحفل سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

عنایت اللہ قومی بلوچی زبان وادب میں شاعر کے طور بہت ہی پر مشہور ومعروف رہے ہیں۔ لیکن تاہم 1950 میں بلوچی زبان میں انکی پہلی (افسانہ) شیشلو سے بلوچی آزمانک (افسانہ) سے افسانہ نگاری رواج پاتی ہے۔ وہ زمانہ بچپن ہی سے بلوچی زبان وادب سے کافی زوق وشوق رکھتے تھے۔ لیکن وہ ابتداء ہی سے درس وتدریس سے دور رہے اور اپنے ذاتی کاروبار کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ بلوچی ادب سے کافی نزدیک رہے۔

وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ان کے صفات وشخصیات نے جلد ہی اپنے قریبی ماحول کو متاثر کی اور اپنے آبائی علاقے پنجگور میں اپنے اردگرد ایک علمی وادبی ماحول بنانے میں کامیاب ہوئے۔وہ ہمہ وقت تعلیم یافتہ اور ادبی ذوق وشوق رکھنے والوں سے کافی محبت ونزدیکی رکھتے تھے۔وہ عزت اکیڈمی کے بانی و اولین کابینہ کے عہدیدار بھی رہے۔عزت اکیڈمی کے قیام و پنجگور کے علمی وادبی سرگرمیوں میں انکا بڑا کردار تھا۔

عنایت اللہ قومی پنجگور کے ادبی حلقوں میں کافی زمانے سے شریک سفر رہے اس زمانے میں جب بلوچی ماہنامہ ''زمانہ'' چھپ رہی تو اس نے اسی زمانے میں پہلے شاعری اور بعد میں وافسانہ نگاری کی ابتداء کی۔

انہوں نے اپنے شاعری کے ذریعے بلوچ معاشرے کی خوب عکاسی کی ہے۔ان کی شاعری کے اندر تشنگی اور مایوسی کہیں پر نظر نہیں آتی۔ان کی شاعری بلوچ عوام میں یکجہتی، اتفاق اور حقوق کے حصول وجدوجہد کے راستے کو اپنانے پر تلقین کرتی ہے۔وہ بلوچی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ان میں زردءِ ارمان،، دلءِ توار، جگرءِ کپوت اور جلشک اہم تصانیف میں سے ہیں۔

عنایت اللہ قومی کی تمام شخصیت کے اہم پہلوؤں میں سے سب سے زیادہ بھاری اور اہمیت کے حامل سادگی، انسانیت دوستی اور وطن دوستی ہے جو کہ انکی شاعری میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

وہ 23 اگست 2009ء یکم رمضان المبارک میں وفات ہوئے۔یقیناً ان کی وفات سے بلوچی زبان وادب ایک نایاب قیمتی گوہر سے محروم رہی۔لیکن انہوں نے مختصر زندگی میں بلوچی ادب کیلئے کافی لمبی سفر طے کی جو بہت ہی کم ایسی شخصیت ہونگیں جو اتنی قلیل مدت میں اتنی لمبی سفر طے کر سکیں۔

وہ پنجگور میں علمی وادبی اور خاص کر بلوچی زبان کے معلم ورہنما تھے جو نوجوانوں اور علم وادب سے ذوق شوق رکھنے والوں میں کافی مقبول ومعروف تھے۔انہوں نے اپنی انتھک علمی وادبی جدوجہد سے بلوچی زبان وادب کے دامن کو کافی وسعت و گہرائی بخشی۔

لچہ

عنایت اللہ قومیؔ

پادامنی میریں بلوچ

جان کاہلیں واب ءَ بسوچ

آلم شنگ ماہ ءَ سرانت

تئی بڑء َ لچ ءُ پشت ءَ ہرانت

آتنگہ ایں نچ ءَ بچار

پہ لنکہ یے در پہ درانت

تو کپتگ ءِ چوڑ ندءُ موچ

جان کاہلیں واب ءَ بسوچ

☆☆☆

عبدالحق حقانی

1930/2000

بلوچ تاریخ میں ایسے کم ہی شخصیت ہونگیں جو مذہبی مکتبہ فکر سے تعلق کے باوجود بلوچ تاریخ، ادب سیاست سے گہری تعلق ووابستگی سے جڑے ہوں۔

ان ہی میں سے ایک مولانا عبدالحق حقانی جو اپنے عہد کے ایک جید عالم دین مذہبی اسکالر و فلاسفر ہونے کے ساتھ ایک بڑے پائیہ کے شاعر وادیب اور قوم دوست وطن دوست ہیں جو کہ علم وادب کے بڑے کرداروں میں ہی میں شمار ہوتے ہیں۔

وہ 1930ء کو پنجگور کے علاقے پروم میں پیدا ہوئے۔لیکن ان کا نفسیاتی و جزباتی تعلق ایرانی بلوچستان اور اپنے آبائی علاقے سے بدستور یکسان طور پر برقرار رہا۔

چونکہ اس زمانے میں اس پورے خطے کے اندر ایران کو علم وادب وفنون کے حوالے بڑا درجہ ومقام حاصل تھا تو اسی مناسبت سے انہوں نے ابتدائی تعلیم ایران ہی سے فارسی اور عربی زبان میں حاصل کی۔

وہ بچپن ہی میں بے پناہ خداد صلاحیتیوں کے مالک تھے۔اور انہی خداد تخلیقی وتحقیقی ذہنیت کی بدولت فارسی اور عربی زبان میں اعلی دینی تعلیم حاصل کی۔

وہ حقیقی معنوں میں اس عہد کے ایک جانے مانے علمی وادبی جانشینوں میں شمار ہوتے ہیں۔

وہ اپنے وسیع مطالعے ومشاہدات واعلی علمی صلاحیتوں سے علم ودلیل کے اعلی مدبر استاد رہے۔

انہوں نے نہ صرف مذہبی فکر وفلسفے کی پرچار کی بلکہ اپنی مادری زبان بلوچی زبان و ادب کی ترقی وترویج میں نمایاں کردار ادا کی۔

وہ بلوچ سرزمین وقوم دوستی کے حقیقی الم بردار بھی تھے۔جن کا اظہار ان کی شاعری سے نمایاں اور خوب آشکار ہے۔انہیں بلوچی روایات، زبان وثقافت کا حقیقی نمائندہ وامین قرار دیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق حقانی بلوچی زبان وادب میں ایک بڑے پائیہ شاعر وادیب تھے۔ان کی شاعری میں قدیم روایات اور بلوچ سماج کے درست اور صحیح سمت کی تعین ہوتی ہے۔

اسے ایک عہد کا شاعر بھی کہا جاتا ہے جو مکمل طور پر جدت کے ابھار کی نمائندہ شاعر ہیں جو زندگی کے تمام مکاتب فکر کے لئے یکساں طور پر اہمیت کے حامل وقابل غور ہیں۔ یعنی ان کے شاعری میں قدیم وجدت کا امتزاج دونوں بہ یک وقت پایا جاتا ہے۔وہ شاعری میں بلوچی زبان کے معروف شاعر واجہ عبداللہ پیشنی کے ہمعصر تھے۔چونکہ وہ ایک مذہبی وعلمی شخصیت تھے۔تو اسی مناسبت سے ان کی شاعری میں زیادہ مذہبی رنگ وتصورات وخیالات کو محسوس کیا جاتا ہے۔لیکن ان کی شاعری کے اہم رنگ میں وطن دوستی وقوم دوستی کی جھلک بھی نمایاں ہے۔اور ساتھ ہی قدیم زمانے کے واقعات وحالات اور جنگ وامن،مہر دوستی اور خاص طور پر مذہبی جنگی واقعات کو خوبصورت پیرائے میں ڈالنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔وہ اپنے وسیع و جامع علم میں فارسی اور عربی زبان وادب پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے اسی مناسبت سے انہوں نے اپنی بلوچی شاعری میں دیگر الفاظ کو بلوچی زبان میں مستعمل کئے جو کہ ان کے علم ومطالعے کی غماز دیگر زبانوں پر دسترس کی بڑی علامت تھی۔

مولوی عبدالحق حقانی کی شاعری ایک زندہ وسدا بہار شاعری ہے جسے ہر دور وزمانے کی نمائندہ شاعری کہا جاتا ہے جو عہد بہ عہد وقت وزمانے کے ساتھ روانی وروح پر تازگی کا باعث ہے۔

ان کی شاعری میں گلوے شکوے حکایات، درس وسبق کے پیمانے لفظوں کے بے ہنگم ذخیرے کو شاعری کے پیرائے میں ڈالنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

مولوی عبدالحق حقانی کے شعری مجموعہ؛زندءحق: ایک ایسا مجموعہ ہے جو سماج، تاریخ، واقعات اور زندگی سے گہری تعلق اور وابستگی رکھتی ہے۔

انہیں ان کے کردار عمل شرافت مذہبی و دینی خدمات، بلوچی زبان وادب کی ترقی و ترویج کے لئے جدوجہد ہی ایک بڑے پائیہ کے شخصیت کے مالک بنادیتی ہے۔

ڈیہہ.................مولانا عبدالحق حقانی

جی وطن لوٹ آں ترا من ملگزارانی تہ ءَ
موسمی گرند ءُ گورت ءُ گوارانی تہ ءَ
تئی ھوا سُہبانی سردیں دنت سمین یادے من ءَ
مسکیں زیدانی خیالے ماں بہارانی تہ ءَ
جلوہے وشیں دینت سبزیں کپوتانی توار
تئی گیابیں کوچگ ءُ کِشت ءُ کِشارانی تہ ءَ
یاد کاینت وژدلیں تئی سید ءُ کوہانی شکار
ماں گر ءُ گٹ ءُ جُڈ ءُ پبّ ءُ تلارانی تہ ءَ
ماں ڈلاں کرگوشک ءُ آھوگ، پٹ ءُ پُراہ تلیں پڑاں
تازیانی دنز ءُ دوری ماں اگارانی تہ ءَ
بُراہ دینت مُرگانی آواز ھین ءُ سہبانی سر ءَ
بلبلانی رقص ءُ باھو باغ ءُ شہرانی تہ ءَ
سنّت ءُ بربند انت قومی سانگ ءُ سوری شادہان
کرگزانی نند ءُ نیادے دزگہارانی تہ ءَ
جرگہ ءُ دیوان انت رندی قومی گرانیں مشکلاں
مجلس ءُ قومی صلاح ماں بیل ءُ یارانی تہ ءَ
تئی سر ءَ سانگ ببات اِنت نود سہبانی مُدام
لوٹ ایت حقانی ترا ماں ھور ءُ ھارانی تہ ءَ

میر محمد حسین عنقا

30 ستمبر 1907، 28 اکتوبر 1983

میر محمد حسین عنقاؔ بلوچستان و بلوچ تاریخ کے اُن ہونہار و ثابت قدم حقیقی عظیم سپوتوں اور ہیروؤں سے ہیں جس کے تذکرے کے بغیر بلوچ سیاسی، سماجی و معاشرتی تاریخ ادھوری اور نامکمل و کورا ہی رہے گا۔ میر محمد حسین عنقا کو بلوچستان کی سیاسی، سماجی اور علمی جدوجہد میں عظیم ہائے کارنامے کے منفرد شخصیات میں سے گردانا جاتا ہے۔

وہ جرات مند، باہمت و مستقل مزاج، دوراندیش فہم وفراست کے خداداد صلاحیتوں کے تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے نہ صرف بلوچستان کی سیاست میں فعال ومتحرک کردار ادا کی بلکہ وہ اس پورے خطے میں غیر ملکی استحصال و قبضہ گیریت و غلامی کے خلاف طویل اور صبر آزما جدوجہد کرنے والوں میں رہے۔ انہوں نے ہمیشہ زندگی کے تمام شعبوں میں یکسوئی کے ساتھ فعال ومتحرک کردار ادا کی۔ محمد حسین عنقا کی زندگی کے نمایاں پہلو ہی ان کی خداداد صلاحیتوں کے حقیقی اعتراف ہیں کہ وہ بہ یک وقت ایک ممتاز، منفرد و معروف دانشور، سیاستدان، صحافی ادیب، محقق، مورّخ ومترجم کئی زبانوں کے نامور شاعر و ادیب تھے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے بلوچی زبان وادب کے دامن کو جامع وسعت بخشی۔ انہوں نے سیاسی اور سماجی جدوجہد میں نمایاں انگنت و دیرپا نقوش چھوڑے۔ ویسے ہی ان کے آباؤاجداد ان کی پیدائش سے کئی دہائیاں قبل ہی ذریعہ معاش کی تلاش میں اپنے آبائی علاقے پنجگور کو چھوڑ چکے تھے۔ جبکہ اس زمانے میں غربت، پسماندگی، بدحالی، ناخواندگی اور معاشی تنگدستی نے تمام قوم کو مفلوج بنا رکھی تھی۔

ان گھمبیر ومشکل حالات نے محمد حسین عنقاؔ کے خاندان و دیگر مفلوک الحال بلوچوں کو پوری طرح لپیٹ لیا تو وہ پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر کئی سالوں تک اپنے وطن سے دور آسام اور بنگال کے علاقوں تک مزدوری کرتے رہے وہ کئی سالوں تک کوئلے کے کانوں میں محنت ومزدوری کرتے رہے۔

''وائے وطن هشکیں دار'' کے مصداق آخر کار اپنے مادر وطن بلوچستان کی جانب کوچ کر جاتے ہیں۔ انکی ہنر مندی، محنت و جفاکشی کے اعلیٰ ثبوت مادر وطن میں سیوی کوسٹ سیکشن پر ریلوے لائن کی تعمیر اور اسی طرح مانگی کے سخت و سنگلاخ چٹانوں کو چیرنا ہی محنت کشی و جفاکشی کے تا قیامت نشانیاں و علامات میں سے ہیں۔ اسی طرح درّہ بولان کے سنگلاخ پہاڑوں میں ریلوے لائن کی تعمیر بھی ان ہی کے مرہون منت ہے۔

دراصل میر محمد حسین عنقا کے آباؤ اجداد کا بنیادی تعلق پنجگور کے معروف و مشہور علاقے سریکوران میں قبیلہ گزازئی سے ہے۔ وہ بلوچستان کے مشہور درّہ بولان کے پہاڑی دامن مچھ میں 30 ستمبر 1907ء کو محمد عبداللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مچھ کے پرائمری سکول سے حاصل کی۔ میٹرک سیوی (سبی) سے پاس کرنے کے بعد کاہان کے ایک سکول میں بطور ٹیچر درس و تدریس کے عمل سے وابستہ ہوئے۔

چونکہ محنت و جفاکشی بنیادی طور پر ان کے جینز میں تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ جب انہوں نے اپنے اردگرد کے ماحول کا بغور مشاہدہ کیا تو بلوچستان میں انگریزی راج اور وحشت، ظلم و تشدد و استحصالی نظام کیساتھ مستحکم ہو کر فوری جڑ پکڑ چکی تھی۔ انگریزی حکومت نے بلوچ قوم کے تمام سیاسی، معاشی، حقوق طاقت کے بل بوتے پر غصب کر رکھے تھے۔
ان حالات نے میر محمد حسین عنقا جیسے باضمیر انسان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ مجبوراً ملازمت کو خیر باد کر کے بلوچ قومی بقاء و تشخص کی جدوجہد میں سرگرم ہوئے۔ اُس زمانے میں برصغیر پر انگریزی ظالمانہ و جابرانہ طرز حکومت اپنی مکمل پوری آب و تاب سے مستحکم جڑ پکڑ رہی تھی۔

بلوچستان اپنی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیش نظر برطانوی حکمرانی کو دوام بخشنے میں بہت اہم خطہ تھا۔ برطانوی حکمران اپنے عزائم کی تکمیل میں بلوچستان کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت سے خوب آشنا تھے۔ اسی بناء پر بلوچستان پر اپنی گرفت و قبضہ گیریت کو مضبوط کرنے کیلئے طاقت و قوت کے ساتھ وقتاً فوقتاً ہنر مندی و بڑی مہارت سے تمام تر حربے بھی آزماتے رہے۔

اسی دوران اس پورے خطے کے اندر برطانوی راج کے خلاف زبردست سیاسی تحریکوں کا آغاز ہوا اور اس دوران بلوچ سیاسی جدوجہد کا آغاز ہی انگریزی استعمار کے قبضہ گیریت ہی سے ہوئی۔ انہوں نے اس خطے کے اندر برطانوی تسلط و قبضہ گیریت کے خلاف ہونے والے تحریکوں میں ایک فعال و متحرک سیاسی رہنما کے طور پر کردار کی۔ وہ ایک حقیقی اور سچے وطن دوست وقوم پرست رہنما تھے۔ جن کے خیالات و تفکرات وطن دوستی وقوم دوستی کے جذبات سے سرشار تھے۔

انہوں نے اس دور کے اہم قدآور سیاسی رہنماؤں میر یوسف عزیز مگسی عبدالعزیز کرد، عبدالصمد اچکزئی و دیگر کئی رہنماؤں کے ساتھ ملکر اپنی عاقلانہ سیاسی بلوغت و دانش مندی سے بلوچستان کی غلامی اور آزادی کیلئے ہر محاذ پر بھرپور جدوجہد کی اور جلد ہی اپنے منظم و فعال کردار کی بدولت اس تحریک کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہونے لگا۔

وہ انگریز حکمرانوں کی غیض وغضب اور قید بند کے صعوبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر کے ہمیشہ ثابت قدم رہے۔

1926ء کو بلوچستان کے چند وطن دوست وقوم پرست رہنماؤں نے خفیہ طور پر ایک اجلاس میں بلوچستان کی آزادی اور برطانوی تسلط کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا اور اسی اجلاس میں میر محمد حسین عنقا اور دیگر ساتھیوں میں محمد حسین نظامی، واجہ نسیم تلوی اور خان عبدالصمد اچکزئی کی ولولہ انگیز قیادت میں ایک تحریک کی بنیاد پڑی۔ اور اسی طرح میر یوسف عزیز مگسی کے انجمن وطن نے بلوچ قومی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی اور میر محمد حسین عنقا کے جذبہ اور ولولوں نے بھی ایک نئی جوش و شدّت پیدا کی۔

انہوں نے نہ صرف سیاسی عمل میں رہ کر جدوجہد کا سہارا لیا بلکہ وہ قلم کی طاقت وقوت سے خوب آشناء تھے اور آزمانے سے کبھی بھی گریز نہ کی جو کہ آخر کار انگریز حکمرانی کے تخت و تاراج ہونے کا یقینی سبب بنا۔

ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بلوچستان میں صحافت کی روح اور بنیاد رکھنے کا اعزاز بھی ان ہی کے سر جاتا ہے۔ انگریز ان کی سیاسی و علمی بصیرت سے خوفزدہ ہونے پر

بلوچستان میں ذرائع ابلاغ پر سخت سے سخت ترین پابندیاں عائد کرنے کی پالیسیوں پر گامزن رہے۔ اور تادیبی کاروائی کے طور پر ان کے بلوچستان میں شائع ہونے والی اولین اخبار ''البلوچ'' پر پابندی لگا کر انہیں ملک بدر کر کے جلاوطن کی۔ البلوچ اخبار میں انگریز استعمار کے خلاف زہر افشانی، بلوچ قومی حقوق اور آزادی کے مواد شامل ہونے اور انگریز کے خلاف عوام کو اکسانے پر تمام کاپیاں بھی ضبط کئے گئیں۔

جہاں تک بلوچی ادب میں نثر کا تعلق ہے انہوں نے اپنے اخبار بولان میں اردو کے ساتھ بلوچی نثر بھی چھاپی۔

انکی کوششوں اور جدوجہد کے نتیجے میں 1933ء کو کل ہند بلوچ کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ کانفرنس میں بلوچستان کے متعلق ایک اہم تاریخی پالیسی وضع ہوئی اور آخری قراردادوں پر محمد حسین عنقا اور عبدالعزیز کرد نے دستخط کئے۔

جب انگریزی حکومت منظم وفعال تحریکوں کے نتیجے میں آخر کار اس قدر خوفزدہ اور حواس باختہ ہوئی کہ بلوچستان میں سیاسی وسماجی سرگرمیوں پر سخت قدغن اور میر یوسف عزیز مگسی اور محمد حسین عنقا کو دوبارہ جلاوطن کر دی۔

وہ دس سالہ جلاوطنی کے بعد دوبارہ اپنی سرزمین میں آکر بلوچ قوم کو سیاسی طور پر برطانوی تسلط کے خلاف منظم کرنے لگا۔ جس کے نتیجے میں پورے خطے کے اندر سیاسی منظر نامہ تیزی کے ساتھ تبدیل ہونے لگی تو برصغیر کے اندر مسلمانوں کیلئے الگ ریاست کی تحریک کو میر محمد حسین عنقا و دیگر بلوچ رہنماؤں نے بھرپور ساتھ دیا۔ تقسیم کے نتیجے میں معرض وجود آنے والے پاکستان کے متعلق ابتداء میں بلوچوں کا خیال تھا کہ اس سے بلوچستان کی آزاد وخودمختار حیثیت و معاملات میں کبھی مداخلت نہ ہوگی۔ لیکن جب بلوچستان کی جبری طور پر پاکستان میں شامل کرنے کی حربہ آزمائی اور سازشیں ہونے لگی تو محمد حسین عنقا اور شہزادہ عبدالکریم خان احمدزئی جو کہ ان رہنماؤں میں تھے جنہوں نے شدید ردعمل کے ساتھ بھرپور مزاحمت کی جس کی پاداش میں انہیں دو سالوں کی سخت سزائیں سنا کر ہری پور جیل میں بند رکھا گیا۔

وہ اپنے نظریات اور پختہ سوچ وفکر پر اٹل وقائم رہنے والے ایک بااصول سیاستدان تھے۔ انہی نظریات واصولوں کی خاطر قید وبند، جلاوطنی و دیگر صعوبتیں بھی برداشت کی۔

وہ مختلف ادوار زمانوں میں اپنی زندگی کے بیس سالوں تک عقوبت خانوں اور جیلوں میں مقید رہے لیکن کبھی بھی اپنے نظریات واصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ وہ اپنے ایک شعر میں بھی اس بات کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ

اگر جلا وطنی دس برس سہی میں نے
اگر قید بیس برس کاٹ لی میں نے

وہ تمام مصائب ومشکلات کی پرواہ کئے بغیر مسلسل جدوجہد عمل میں برسر پیکار رہے۔ ان کی زندگی کے بیش تر ایام حتیٰ کہ جوانی کے خوش کن ترین لمحات تک ریاستی اذیت خانوں قلی کیمپ لاہور، شاہی قلعہ، ایبٹ آباد اور ہری پور کی مقید خانوں کی نذر ہوئی۔

انہوں نے بلوچستان کی اہم سیاسی تحریکوں اور قوم دوست وترقی پسند جماعتوں اُستمان گل، نیپ، انجمن وطن کے قیام تحریکوں میں کلیدی کردار ادا کی۔

وہ اعلیٰ فہم وفراست رکھنے والے بااصول، باہمت دوراندیش سیاستدان کے طور پر کم و بیش پچاس سالوں تک بلوچستان کی سیاست میں فعال ومتحرک رہے۔

10 اکتوبر 1973ء کو بلوچستان کا یہ عظیم سیاسی، سماجی، علمی وادبی شخصیت کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر وفات ہوئے۔

وہ تاریخ میں اپنے عظیم وطویل سیاسی، ادبی وعلمی جدوجہد کی بدولت بلوچستان کے درخشندہ ستارے اور تاریخی باب کے طور جانے جاتے رہینگے۔

میر محمد حسین عنقا کی شاعری وادبی خدمات:-

بلوچی زبان وادب کے تیز رفتار ارتقاء اور اس میں نئی اصناف واسالیب اور فکری رجحانات کا آغاز باقاعدہ چند جرائد ہی سے ہوئی۔ اور اسی سے بلوچی نثر نگاری کی روایت اور بنیاد مضبوط دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے تین قابل ذکر جرائد بولان، بلوچستان جدید اور نوائے وطن کے مدیران میں نامور بلوچ دانشور اہل قلم میر محمد حسین عنقا، میر گل خان نصیر اور محمد پناہ تھے۔ جو بلوچی زبان وادب کے درخشندے ستارے بلوچی نثری ادب کو نئی جہت واصناف سے روشناس کرانے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

انہوں نے زندگی بھر زبان کو وسیع تر کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار

لا کر بہت سے نئے الفاظ ونئی تراکیب اور نئی اصلاحات سے روشناس کرائی۔ میر محمد حسین عنقا حقیقی معنوں میں بلوچی نثر میں تخلیقی و تحقیقی ادب کی روایات کو پروان چڑھانے والوں میں سے تھیں۔ ان ہی کے دور میں بلوچی ادب میں نثر ابتدائی مراحل سے گزر کر ارتقائی مراحل میں داخل ہو کر فروغ پاتی ہے۔

ان کی تمام تر ادبی کاوشیں بے مثال وانگنت ہیں۔ اُن کی تمام تر شاعری میں مہر و محبت و دوستی کے ساتھ اپنے سرزمین کے خوبصورت ترین تصویر کو بہترین انداز وسلیقے سے اظہار کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ سنگلاخ پہاڑوں، گنگناتے چشموں اور سر بفلک چٹانوں کی نمایاں مصوری کر کے بلوچ ادب میں ایک نئی جہت پیدا کی۔ وہ اپنی سیاست و قلم اور شاعری سے بیسویں صدی کے نصف حصے میں بلوچی ادب میں انقلابی تبدیلی کے موجب اور تاریخی شخصیت ہیں۔

وہ کئی زبانوں پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے تھے۔ وہ اس عہد کے بلوچی، اردو اور فارسی کے مایہ ناز و بڑے قد آور منفرد مقام کے شاعر و ادیب تھے۔ یوں اس طرح ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں۔ تاہم ان کی تمام شاعری، تحقیق، تنقید اور جستجو کی طرف مائل کرنے کے پیغامات، دلچسپیاں اور کیفیات، حساسیاتی تخلیق کی جانب مائل رہتی ہے۔

محمد حسین عنقا اپنی شاعری میں بلوچی زبان کی لوک داستانوں کے مختلف کرداروں حانی شہ مرید، شہداد و مہناز کا اظہار و بیان یقینی طور اردو زبان میں بلوچی کے ان لوک داستانوں کو متعارف کر کے علامات کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس بیسویں صدی کے سائنسی و جدید حساسیات کا شاعر قدیم روایتوں سے اپنے مضبوط تعلق ورشتے کو آشکار کرتا ہے۔

چو شہ مرید ءَ منی لکھ مرادیں ورنائی
ماں قوم ءِ حج ءِ تہا شت مودگانے بس

میر محمد حسین عنقا کی شاعری فکر وسوچ کی گہرائی کے ساتھ ساتھ ایک جمالیاتی ادراک و

احساس ہے۔ وہ اپنے شاعری کے اندر شہ مرید وحانی کی عظیم داستان محبت کا حوالہ دے کر شہ مرید کی اپنی محبوبہ کی خاطر عظیم ولازوال قربانی کا ذکر کرتے ہیں اور اسی حوالے سے اپنے آپ کو جوڑ کر اپنے سوچ وفکر کو چند لفظوں میں محفوظ کرتے ہیں کہ شہ مرید کی طرح میری پررونق و حسین جوانی قوم کے عظیم مقصد کی نظر ہو جاتی ہے پھر بھی اسے اپنے قوم وسرزمین کی خاطر کوئی کسی طرح مداوہ اور پشیمانی نہیں۔

انکی شاعری جو تحقیقی و تخلیقی جستجو میں زندگی کے تمام معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے اور ایک وسیع پیرائے و پیمانے میں وسعت و گہرائی پر منتج و مرکوز دکھائی دیتی ہے جو کہ خوبصورتی اور صوتی انفرادیت سے بھرپور اظہار کے ساتھ ابھر جاتی ہے۔

عنقا کی شاعری کا سب سے بڑا اہم قابل فہم پہلو یہ بھی ہے کہ خوابوں میں بسیرا کرنے کے بجائے اسطرح کے کیفیات کو چکا چوند کر کے حقیقت اور سچائی کی جانب موڑ دے کر اپنے جذبات وانقلابی سوچ وفکر کو عیاں کر کے آگ برساتے شعور اور وجدان میں ڈھل جاتا ہے۔

مشکل سے مشکل کٹھن حالات ومصائب میں انکی شاعری کہیں مضمحل یا افسردہ اور تھکاوٹ سے چکنا چور نہیں۔ انکی شاعری میں اضطراب کی لہریں منزل شوق کو اور بھی قریب کر دیتی ہے۔ اعصاب زدگی اور انتشار کی کیفیت میں بھی جذبات وشدت سے توانا ومست ہیں۔

میر محمد حسین عنقا کی شاعری کی نمایاں خاصیت بلوچی زبان سے اہم آگاہی مٹھاس، رچاؤ اور نغمگی جلکتی ہوئی بلوچستان کے پہاڑوں کی گونج، طوفان کی لہریں تن تناہٹ، چاندنی گھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ انکی شاعری جہالت کی تاریکی، تعصب، ضد وبغض سے کافی کوسوں دور ایک آزاد حصار کے ارد گرد گھومتی ہے جس میں ہر پل ولمحہ بلوچ و بلوچستان سانس لیتی ہے۔ وہ شاعری میں اپنی الگ ومنفرد پہچان وشناخت رکھتی ہے۔ اس نے اپنی شاعری کو اس قالب میں ڈالا جس میں درد، آلام، طلب، دردناک پکار کوز ور وشور میں بدلی جو کسی بھی دور وحالات میں تبدیلی کے سبب بننے کی بھرپور صداء سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

بلوچی زبان میں غزل و دستونک کی روایت ورواج کو مستحکم و بنیاد ورا وانی بخشنے والوں میں سے تھے۔ جنہوں نے اپنی شاعری میں غزل کی مستحکم روایات کی داغ بیل ڈالی۔

کاگدیں لنٹ پن ءُ مزواک انت
دل اِدا ھون ءُ چاک ءُ چاک انت
پرچے عنقا نزور ، آزورک انت
مئے اگاں ہردوکانی یک جاک انت

انکی شاعری کے غور طلب پہلو میں بلوچی کے عام و مستعمل سادہ الفاظ پن مزواک، نزور، زوراک کو اپنی شاعری کے غالب میں ڈھالنا یقیناً اعصاب زدہ زندگی اور انتشار زدہ دور میں بھی جوان پر جوش شاعری کی روح پرور زندہ مثال وعلامات ہیں۔

میر محمد حسین عنقا اپنی شاعری میں سادہ و آسان زبان استعمال کرتے ہیں جو ہر حوالے سے قابل فہم و آسان ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف وادیب ہیں۔

ان میں سے توار، (بلوچی شاعری) راحیل کوہ (فارسی، اردوشاعری)

ان کی کئی کتابیں اشاعت سے رہ گئی ہیں۔ ان کی تاریخ، سیاست و ادب پر تحریریں بلوچ سماج، سیاست اور بلوچی ادب کیلئے ایک قومی سرمایہ اور اثاثہ ہیں۔

میر محمد حسین عنقا بلاشبہ اپنی شاعری اور علمی ادبی اور سیاسی کارناموں کی بدولت بلوچی زبان وادب و بلوچ و بلوچستان کی خاص شناخت و پہچان ہیں۔

میر محمد حسین عنقا

کاگدیں لنٹ پن مزواک انت
دل ادا ھون ءُ چاک ءُ چاک انت

پشک ءَ دریت ءُ دو چکے لوٹیت
اِے گنوکی پہ وت ءَ دو چکے لوٹیت

نہ ردی محبت ءِ نہ اول لٹ ءِ
اے ردی دست ءِ دست بے واک انت

اچ تئی رنگ ءَ تامور شر نہ انت
البت ھون ءَ دست ئےِ یاک انت

نوروشبو دل ءُ دماغ ءَ نختگ
تئی محبت گلاب ئےِ تاک انت

کج اتگ تئی جتائی ءِ یات ءَ
سیاہ کہ چش گرم گرمءَ پیداک انت

پرچے عنقا نزور ، آزورک انت
مئے اگاں ہر دوکانی یک جاک انت

محمد حیات حیاتان بلوچ

محمد حیات بلوچ 2 مارچ 1937ء کو مولاداد کے ہاں پنجگور کے گاؤں چتکان میں پیدا ہوئے۔ اس وقت پنجگور ریاست مکران کی تحصیل تھی۔

ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کرنے کے بعد 1954ء گورنمنٹ ہائی سکول پنجگور (چتکان) سے میٹرک (پنجاب بورڈ سے) نمایاں پوزیشن اور امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کی۔ وہ پوری ریاست مکران میں اوّل اور بلوچستان سٹیٹس یونین میں دوئم آئے۔ وہ لاء گریجویٹ ہیں۔

سادہ ونرم گو اعلیٰ ذہین، نظم ونسق اور اصولوں وضوابط پر کاربند رہنے والے علم وعمل کے پرکشش شخصیت ہیں۔

وہ ابتداء ہی سے علم وادب میں نمایاں اور گہری تعلق و وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ حقیقی طور پر ایک جید مورخ ومحقق اور تخلیقی ذہنیت کے مالک ہیں۔

انہیں زندگی میں ان کی ذہنی وفطری جبلت ہی اس وقت کے بڑے و مایہ ناز سیاسی و سماجی علمی اور ادبی شخصیات کے قریب ونزدیک ترلاتی رہی ہے۔ وہ نظریاتی وسیاسی لحاظ سے زمانہ طالب علمی سے ایک ترقی پسند وقوم پرستانہ لبرل ذہنیت کے حامل شخصیت ہیں۔

ملک میں ون یونٹ ٹوٹنے اور بلوچستان بطور صوبہ معرض وجود آنے، 72-1971ء کے دوران نیپ (NAP) کی حکومت بننے پر وہ عظیم بلوچ مورّخ، ادیب شاعر وسیاستدان سنئیر صوبائی وزیر میر گل خان نصیر کے پرئیوٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ ان جیسے بڑے پایہ کے قوم پرست رہنماؤں کے ساتھ رہ کر ان سے بہت کچھ حاصل کرنا یقینی تھا۔

انہوں نے اپنے ملازم پیشہ ادوار کے زمانے میں بطور تحصلیدار (بورڈ آف ریونیو) بلوچستان کے دور آفتادہ مختلف علاقوں کے علاوہ کوئٹہ میں بھی فرائض سرانجام دیئے۔

وہ زندگی میں ایک بااصول باضمیر اور نظم وضبط کے قائل شخصیت گردانے جاتے ہیں۔ اور ہمیشہ آزادانہ سوچ وفکر کے ساتھ زندگی میں اصول وضوابط پر کاربند رہنے کو ترجیح دیتے

ہیں۔اسی بناء پر 1985ء اپنی سرکاری ملازمت سے پیشگی ریٹائرمنٹ لے کر بھرپور سیاسی و سماجی زندگی کا آغاز کیا۔

وہ سیاسی طور پر زمانہ طالب علمی ہی سے اس پورے خطے کے سیاسی رہنماؤں میں سے بلوچ قوم پرست رہنما میر غوث بخش بزنجو کی دور اندیشانہ سیاسی بصیرت وقوم پرستانہ افکار و نظریات سے کافی متاثر رہے۔اور اسی بناء پر ان کی سیاسی وفکری نشونما میں میر غوث بخش بزنجو کی سیاسی فکر وفلسفہ وتعلیمات کا اہم کردار ہے۔اور وہ عملی طور پر میر کاروان بن کر ان کی سیاسی فکر و فلسفہ کے پختہ پیروکاروں میں رہے۔ وہ جلد ہی اپنے اعلیٰ علمی ادبی اور سیاسی صلاحیتوں کے بدولت میر غوث بخش بزنجو اور پارٹی کے کلیدی و بااعتماد ساتھیوں میں شمار ہونے لگے۔وہ پارٹی میں ضلعی صدر کے علاوہ سنٹرل کمیٹی کے ممبر اور میر غوث بخش بزنجو کے قریبی و بااعتماد ساتھیوں میں سے تھے۔

انہوں نے 1988ء کا جنرل الیکشن پارٹی ٹکٹ پر اپنے حلقے پی بی 48 پنجگور ہی سے لڑا۔ان انتخابات کے نتائج کے قطع نظر یہ بلوچ قوم پرست قوتوں کے لئے سب سے بڑا لمحہ فکریہ رہا جس میں نوجوان قیادت اور میر غوث بخش بزنجو کی جماعت ایک دوسرے کے آمنے سامنے مدمقابل ہوئے تھے۔جس سے بلوچ قوم پرست سیاست میں خلفشار و بحرانی کیفیت کا جنم ہوا ۔

انہوں نے زندگی میں تھک ہارنے کے بجائے تواتر اور یکسوئی کے ساتھ علاقے کی سیاسی وسماجی سرگرمیوں میں بھرپور انداز میں فعال کردار ادا کی ہے۔

وہ ایک بڑے باعلم و مدبر اور دانشور و مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ کے ماہر قانون وعلم وادب کے میدان میں متحرک انسان ہیں۔

انہوں نے پنجگور میں بحیثیت ایڈووکیٹ مدتوں پریکٹیس کی اور اس شعبے میں اپنی اعلی تعلیم وذہانت کی بدولت ناقابل فراموش وانگنت نقوش رقم کی ہے۔ان ہی کی جدوجہد سے ضلعی بار ایسوسی ایشن عمل میں آئی اور اس ادارے کے بانی اور 1999-1988ء میں دومرتبہ متفقہ ضلعی صدر بھی رہے۔

انہوں نے زندگی میں ہمیشہ سے بلوچ قومی خوشحالی، تعمیر وترقی اور تعمیری معاشرے کو پروان چڑھانے کے لئے علم وعمل اور جدوجہد کے دامن کو تھامے رکھا۔

انہوں نے ہمیشہ سے علاقے میں اتحاد و یکجہتی و فلاح کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا بھر پور استعمال کیا۔اسی بناء پر زندگی کے ہر مکتبہ فکر و شعبے سے تعلق اور سیاسی و نظریاتی اختلافات کے باوجود قابل قبول و با اعتماد شخصیت ہیں۔ان کی سیاسی و سماجی و فلاحی اور معاشرتی سرگرمیوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔انہوں نے پنجگور کے دیگر اہم سیاسی وسماجی و مذہبی شخصیات سے مل کر امن وامان اور پرامن ماحول وخوشحال معاشرے کے قیام و بہتری کیلئے نمایاں کردار ادا کی ہے۔

وہ علاقے میں قبائلی وخونی جھگڑوں کی تصفیہ و دیگر علاقائی معاملات کو بلوچی روایات اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل کرانے میں سرگرم و متحرک رہے ہیں۔وہ علاقے میں تشکیل پانے والے متعدد کمیٹیوں ڈسٹرکٹ ایڈوائزری کمیٹی ، ہیلتھ فاؤنڈیشن ، ڈسٹرکٹ واٹر(کاریزات) کمیٹی، پبلک سیفٹی کمیشن کے اہم رکن رہے ہیں۔

وہ ہمیشہ سے علم وادب کے میدان میں بھی متحرک رہے۔انہوں نے بلوچی زبان و ادب کی ترقی وترویج کے لئے ہر سطح پر نمایاں کردار ادا کی ہے۔وہ عزت اکیڈمی کے مستقل ممبر اور دو مرتبہ صدر بھی رہے۔انہوں نے عزت اکیڈمی کو فعال و منظم اور علمی مکتبہ فکر اور علم دوست قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں کافی کردار ادا کی ہے۔وہ عزت اکیڈمی کو مستحکم بنیادیں فراہم کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔وہ بلوچی اور خاص کر اردو کے ایک جیّد و منفرد لکھاری ہے۔جو مکران کے اولین وابتدائی قلمکارں میں گنے جاتے ہیں۔

وہ مدتوں سے اپنے قلمی نام حیاتان بلوچ کے نام سے مختلف قومی رسالوں و ماہناموں میں بلوچستان ، بلوچ تاریخ ، سیاست ،تہذیب وتمدن و دیگر موضوعات پر یکسوئی کے ساتھ جامع انداز لکھتے رہے ہیں۔

وہ ایک مدلل و پرامن شخصیت کے مالک ہیں اسی بناء پر ملنے جلنے والوں اور احباب کا وسیع حلقہ رکھتے ہیں۔

وہ ہمیشہ تیز رفتار بدلتی دنیا کے تناظر میں بلوچ نوجوانوں کو علم و عمل کے زیور سے مسلح اور مثبت علمی وسائنسی بنیادوں پر راہیں متعین کرنے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔

باب یازدھم:

سیاست(Politics)

زمانہ قدیم سے بلوچستان اپنی جغرافیائی ، سیاسی وعسکری اہمیت کے بنا پر ملکی و بین الاقوامی قوتوں کیلئے پُرکشش اور بہت زیادہ اہمیت کا حامل خطہ رہا ہے۔اور یہ پہلی عالمی جنگ کے بعد ہی برطانیہ کی خاص توجہ کا مرکز ومحور بنا۔تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے بلوچستان سمیت پورے خطے پر برطانیہ کے گرفت وتسلط تک بلوچ وسطیٰ ایشیاء کی اس زمین پر آزاد وخودمختار قبائلی زندگی کے ساتھ اقتدار اعلیٰ کے مالک تھے۔جس کی سرحدیں جنوب میں بحیرہ بلوچ (عرب) مشرق میں دریاءسندھ،شمال میں کوہ تکتو سے دریاءہلمند اور مغرب میں دشت لوط تک پھیلی ہوئی تھیں۔

لیکن جدید سیاسی علوم کے مفہوم کی رو سے یہ مملکت نہ تھی شمال مشرق میں پنجاب تھا جس میں سکھوں کی آزادحکومت تھی جوڈیرہ جات کے بلوچوں سے مسلسل برسرپیکار تھے۔ شمال میں ایران وافغانستان کی حکومتیں تھیں۔اس بلوچ خطہ میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔سندھ میں بلوچی اقتدار کوبھی قومی اور بلوچی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہاں بھی کسی مضبوط مرکز کے بجائے اقتدار خیر پور، حیدرآباد اور میر پور خاص کے تین تالپور بلوچ حکمران خاندانوں میں بٹا ہوا تھا۔

شمال میں بلوچ قبائل علیحدہ علیحدہ خطوں میں منقسم تھے۔ ہرقبیلہ اپنے خطے میں خودمختار تھااوراسی حیثیت وشناخت کیلئے لڑتے رہے۔

مجموعی طور پر بلوچستان میں رواج پانے والےاور باقاعدہ منظم سیاسی عمل کے بارے میں ایک جامع ومستند رائے پر اتفاق کرنا خاصہ مشکل و دشوار عمل ہے۔لیکن اس پر کوئی دورائے نہیں کہ بلوچ سیاسی نشونما وقومی یکجہتی و تنظیم کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ قبائلی تقسیم، بار بار نقل مکانیوں، آپسی وقبائلی رنجشیں اور خلفشار ہی رہی ہیں۔ جو ہمیشہ قومی

یکجہتی وسیاسی نشونما کے عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی۔ تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بلوچ من حیثیت القوم اپنی قومی شناخت، پہچان و بقاء اور سرزمین کے دفاع کیلئے قبائلی و گروہی مفادات سے بالاتر ہوکر منقسم و منتشر گروپوں کی صورت میں بھی بڑی سے بڑی طاقت ور ترین دشمنوں سے ازل سے برسرپیکار رہتی آ رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں کوئی بھی بیرونی حکمران زیادہ دیر قدم جمانے اور اس خطے پر حکمرانی کرنے میں کامیاب نہ رہا اور بلوچ قوم نے اس خطے کی دفاع و آزادی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بارہا انگریزوں، یونانیوں اور پرتگیزیوں اور دیگر بیرونی قوتوں کے خلاف نبرد آزما رہ کر بلوچ تاریخ کو درخشندہ و تابناک بنائی ہے۔

جب پرتگیزوں نے ساحل مکران پر حملہ کیا تو میر حمل نے بہادری و جانفشانی کے ساتھ ایک بہادر ونڈر سپاہی کی طرح دشمن سے دوبدو اور بہادری کے ساتھ سخت مزاحمت کی۔

اس معرکے کے نتیجے میں پرتگیزی مسلح لشکر کے ہاتھوں سرنڈر ہونے کے بجائے گرفتاری کو ترجیح دی لیکن مفاہمت کی نہ اُن کے پاؤں میں کہیں پر کوئی لرزش آئی۔

آج تک وہ بلوچستان کے مزاحمتی سیاست و بلوچی ادب میں ایک علامت و تاریخ کے طور پر زندہ و کامران ہیں۔ وہ اپنے شاعری کے ذریعے اپنے سرزمین سے محبت و دوستی و دشمن قبضہ گیر کے خلاف نفرت کا اظہار زندان میں مقید ہوکر پر جوش جذبے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

ساوڑی نوداں حمل ءِ پیغاماں برات
پہ مکہیں مات ءُ لسھیں دوست ءَ سرکن اِت
من ءَ بے سیتیں پرنگاں دست گیر کتگ
حمل ءَ پہرے ماں پت ءِ باریگ ءَ کتگ
کہ منی ہمراہ بے دلیں جدگال بوتگ اَنت
لِلکے اومانش کت ءُ پہک ءَ ریت انت

پہ منی شام ءَ مہلبیں گندیماں مہ دُرش
پہ منی چاشت ءَ سیریکیں گٹور ءَ مہ کش
پہ منی پشت ءَ کیس ھپت رنگیں چادراں
پہ منی بور ءَ بارگیں او بنداں مہ ریس
اے منی ھاٹل پہ من زہیریگ مجن
ریشمی روبند ءَ منی بور ءَ پر مکن

میر حمل کلمتی اذیت خانے کی تاریکی میں مقید ہو کر تنہائی میں بلوچی اشعار کے ذریعے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

زھم جنے بیت ءُ حمل ءِ نام ءَ نوک بکنت
گور کشے بیت ءُ حمل ءِ نام ءَ نوک بکنت

بہادر بلوچ ہمیشہ اپنے کردار عمل وصفات ہی سے سرزمین، وطن وقوم سے والہانہ اور عاشقانہ حد تک مہر ودوستی رکھتا ہے۔ قید بند مصائب ومشکلات و کھٹن حالات میں رہ کر بھی ان کے جذبات اور سوچ وفکر سے وطن دوستی وقوم دوستی کی شدت چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مکران کے جیالے کسی ادوار وزمانے میں مادر وطن کی دفاع و بقاء اور قومی شناخت کی جدوجہد میں کسی بھی محاذ پر سرخم تسلیم کرنے کے روایات کے امین نہ رہے۔ بلوچ قوم نے عسکری وفوجی لحاظ سے کمزور و بے سروسامانی کے عالم میں فقط قومی جذبہ کے ساتھ دشمن کے ساتھ شدید لڑائی میں اپنے سرزمین کی دفاع وقومی بقاء کے لئے لڑکر ثابت کی ہے کہ ''اگر لڑنہیں سکتے تو مر سکتے ہیں'' کی رویات کو زندہ وتابندہ کر کے کبھی بھی اِس قومی روایات کو ہاتھ سے جانے نہ دی۔

1839ء میں میر محراب خان نے بلوچ سلطنت کی قومی آزادی کیلئے جس طرح بیرونی مضبوط لشکر کے سامنے آخری دم تک لڑکر سرزمین کے باسیوں کیلئے یہ تاریخ رقم کی کہ ''اگر بلوچ لڑنہیں سکتا مر تو سکتا ہے''۔ یہ شہید محراب خان کا مشہور مقولہ بلوچ قومی جدوجہد

برائے آزادی وقومی دفاع کیلئے ایک مستحکم روایات کے طور پر آج تک معرکوں، لشکر کشیوں اور مضبوط و طاقت ترین دشمنوں کے سامنے ایک مضبوط اقدار و روایات بن گئی ہے۔ جو واضح طور پر اس خطے میں اس طرح کے تمام لشکر کشیوں، چڑھائیوں اور معرکوں کے دوران نظر بھی آتی ہے۔ یہ تاریخی طور پر ایک تلخ حقیقت ہے کہ بلوچ تمام ادوار و زمانے میں کبھی بھی سیاسی قوت و طاقت حاصل تو نہ کر سکی مگر قومی شعور کی بنیاد پر سرزمین کی بقاء و دفاع میں طاقت ور ترین قوتوں سے برسرِ پیکار تو ضرور رہی ہے۔

کوہنگ ءِ کوہیں قلات

کسی پت ءِ میراث نہ انت

ما گوں سگاراں گپتگ اَنت

''کوہنگ کا یہ پہاڑی قلعہ کسی کے باپ کی میراث نہیں، اسے ہم نے تلواروں کے زور پر حاصل کی ہے۔''

ابتدائی طور پر بلوچستان کے سیاسی تاریخ و سیاسی عمل کی نشو نما و ابتداء پہلی بار میر چاکر خان کے زمانے میں جنہوں نے پہلے پہل حکمت عملی و مضبوط پالیسی کے تحت بلوچ قوم کے مختلف قبائل کو ملا کر ایک مضبوط و مستحکم حکومت تشکیل دی اور اپنے جرّار بلوچ لشکر کے ساتھ بہت سے فتوحات اپنے نام کر گئے اور اس سے بلوچ سرزمین کو کافی وسعت ملی اور حتیٰ کہ دہلی تک بلوچ لشکر نے فتوحات کے جھنڈے گھاڑ دیئے تھے۔

اگر ان کو حکومت کرنے کا بخوبی سلیقہ آتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر قبائلی فرقہ واریت و فرسودہ نظام سے باہر نکلتے اور رند و لاشار کی تیس سالہ خود اختیار کردہ جنگ بلوچ قوم پر مسلط نہ کرتے تو یقیناً آج بلوچستان اس خطے کے اندر ایک عظیم مملکت ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی و عسکری اعتبار سے ناقابل شکست قوت کے طور پر ابھرتا۔ جس طرح افغانوں نے احمد شاہ ابدالی اور پنجابیوں نے رنجیت سنگھ کی قیادت میں مطلوبہ نتائج حاصل کیں۔

رند و لاشار کی تیس سالہ خونریز لڑائی و جنگ نے بلوچ قوم کی سیاسی قوت و طاقت کو

نیست و نابود کر کے منطقی نتیجے کے طور پر پوری قوم کو دانوں کی طرح بکھیر دیا۔ جس سے سیاسی قوت و یکجہتی منتشر و تقسیم ہوئی۔ لیکن ان تمام تباہی و بربادی وانتشار اور سیاسی تقسیم کے باوجود بلوچ قوم میر نصیر خان نوری کی قیادت میں دوبارہ 1666ء اپنی ریاست تشکیل دینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اگر چہ میر چاکر خان رند کے زمانے میں بلوچ ریاست قبائلی انتشار و تقسیم کی نذر نہ ہوتی تو آج اس خطے کے اندر ایک اور سیاسی نقشہ ہوتی۔ میر نصیر خان کے بعد بھی ریاست پر بلوچ حکمرانوں کی گرفت اور طرز حکومت پستی و زوال پذیر ہوتی گئی اور اسباب اور وجوہات پہلے سے کہیں مختلف نہیں تھے۔

مجموعی طور پر دوسری بار بلوچستان بھر میں سیاسی شعور و آگاہی سیاسی یکجہتی و تنظیم کا آغاز بلوچستان پر برطانوی تسلط و قبضہ گیری ہی سے ہوئی اور اس سیاسی تحریک کی بدولت ایک نئی سیاسی قیادت بلوچستان کی خودمختار حیثیت اور بلوچ قوم کے سیاسی، معاشی و سماجی حقوق کیلئے قوم پرست قیادت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ اس سے پہلے بھی بلوچ عوام میں سیاسی اتحاد و یکجہتی و تنظیم اپنے طور پر موجود تو تھی لیکن منظم و متحرک شکل و صورت میں نہ تھی جو کہ کسی بھی طرح اس ادوار و زمانے کو منظم سیاسی عمل میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

برصغیر کی نسبت بلوچستان میں سیاسی عمل کافی دیر بعد قریبا بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوئی۔ 1920ء میں میر یوسف عزیز مگسی، میر عبدالعزیز کرد و دیگر کی رہنمائی میں ' ینگ بلوچ،، کے نام پر سیاسی تنظیم تشکیل دی گئی۔ لیکن یہ تنظیم سیاسی پابندی اور ذرائع ابلاغ پر سخت ترین قدغن ہونے کی بنا پر زیر زمین اور کافی خفیہ تنظیم تھی۔ چونکہ بلوچ قائدین نے بلوچستان کی سیاسی صورت حال میں قدرے تبدیلی کے بعد اسے باقاعدہ ''انجمن اتحاد بلوچاں'' کا نام دے کر بلوچ قوم میں سیاسی تنظیم سازی، قومی اتحاد و یکجہتی اور سیاسی شعور و آگاہی کے لئے بھرپور جدوجہد شروع کی۔ اس سیاسی عمل کے نتیجے میں ایک متحرک سیاسی قیادت میر عبدالعزیز کرد، میر یوسف عزیز مگسی، محمد حسین عنقاء و دیگر رہنماؤں کی شکل میں بلوچ قوم کو ایک فعال قیادت دینے میں کامیاب رہی۔ انگریزوں کی آمد تک بلوچ قوم میں

سیاسی عمل ایک حد تک اپنی ابتدائی آفرینش کے مراحل طے کر چکا تھا اور ان مراحل تک سیاسی عمل نے بلوچ قومی تحریک میں سیاسی پختگی و شعوری راہ اپنا چکی تھی۔ اس کے علاوہ اُستمان گل جیسی پلیٹ فارم کے علاوہ صحافی، ادیب و دانشور طبقہ نے بھی سیاسی عمل کو کافی وسعت اور گہرائی دی۔

1932ء میں نواب یوسف عزیز مگسی کی طویل جدوجہد کے نتیجے میں آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جو مستقبل قریب میں بلوچ قوم کے سیاسی اور قومی حقوق کے ساتھ ساتھ سیاسی یکجہتی کے عمل میں کلیدی کردار کے حامل رہی۔ میر یوسف عزیز مگسی جو کہ ایک عظیم پائے کے ایک قوم پرست و دور اندیش سیاسی رہنما تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی 1935ء کے تباہ کن زلزلے کے نتیجے کی بے وقت ہلاکت اور المناک موت بلوچ قوم اور خاص کر سیاسی عمل کے لئے کسی بھی المیہ سے ہرگز کم نہ تھی۔ کیونکہ ان کے سیاسی سوچ و فکر اور اعلیٰ وژن کے بدولت بلوچ قوم میں سیاسی شعور اور قوم پرستانہ سوچ و فکر نظریاتی طور پر تیزی سے جڑ پکڑ رہی تھی۔ دوسری جانب برطانوی تسلط و قبضہ گیری کے سخت ترین فضاء نے بلوچستان کی آزاد و خود مختار اور قومی بقاء و دفاع کیلئے ہونے والے سیاسی تحریک اور قوم پرستانہ سوچ و فکر کو کافی تقویت دی۔ چونکہ یہ سیاسی تحریک اپنے عمل، ہئیت و ساخت کے لحاظ سے برصغیر کے اندر ہونے والے تحریکوں سے کافی اثر پذیر تھا اور بلوچستان کا برصغیر میں سیاسی، سماجی و مذہبی تعلقات و یکسانیت کے باوجود انگریزی استعمار کی قبضہ گیریت سے بیشتر ایک آزاد و خود مختار ریاست کے طور پر دنیا کے نقشہ پر قائم تھی۔ لیکن بلوچستان کی فوری آزادی سلب کرنے کے عمل نے بلوچ تعلیم یافتہ نوجوانوں، ادیبوں، دانشوروں، سیاسی کارکنوں اور خاص کر بلوچستان کے طول عرض میں قومی اتحاد و یکجہتی کے لئے ایک طویل جدوجہد و سیاسی تحریک کو جنم دی۔

انگریزی استعمار کے اس خطے میں قبضہ گیری و تسلط کے واضح عزائم میں سے ایک وسائل کی لوٹ مار کے ساتھ عسکری و تجارتی لحاظ سے تسلط اور اس ایجنڈے کی تکمیل اور اضح

حکمت عملی و پالیسی کے تحت اس سے بیشتر مختلف طریقوں اور حوالوں سے بلوچستان سمیت دیگر علاقوں کا سیاسی وسماجی طرز زندگی کا بغور جائزہ بھی لے چکے تھے۔انہوں نے بلوچستان میں ہمیشہ قوت وطاقت کے بل بوتے پر حکومت کرنے کے بجائے عیاری ومکاری اور میانہ روی کی پالیسی کے تحت سب سے پہلے زوال پذیر قبائلی ڈھانچے کو کافی مضبوط ومتحرک کر کے سرداروں ،نوابوں اور اپنے گماشتوں کے ذریعے حکومت کی اور بلوچ قوم کے سیاسی ،سماجی اور معاشی حقوق غصب کرر کھے تا کہ بلوچستان میں سیاسی عمل، اتحاد و یکجہتی و تنظیم سازی کا عمل جمود کا شکار رہے۔

ان تمام تر حالات ومصائب کے باوجود یہ سیاسی عمل مختلف مراحل سے گزر کر آخر کار 1937ء کو قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کی صورت میں وجود میں آئی اور یوں خطے کے اندر سیاسی آگاہی ،قومی یکجہتی اور بلوچ قوم کی آزد وخود مختار حیثیت ، سیاسی اور سماجی حقوق کیلئے منظم تحریک کی ابتداء ہوئی۔ یہ منظم ومتحرک سیاسی عمل انگریزی استعمار وقبضہ گیریت سے چھٹکارا دلانے کے ساتھ ساتھ فرسودہ قبائلی نظام پر کاری ضرب کا سبب بن سکتا تھا اور انگریزوں نے ان تمام حالات واقعات اور تیزی سے ہونے والے تبدیلیوں کو اچھی طرح سے بھانپ لیا تھا۔اس لئے اس تحریک کے اثرات کو روکنے کیلئے بلوچستان میں برطانوی حکمرانوں نے سخت پالیسی اپناتے ہوئے ابتداء میں ذرائع ابلاغ ،سیاسی اور سماجی حقوق پر پابندیاں لگائی۔جس کے نتیجے میں سیاسی قیادت منظر عام سے غائب ہوئیں یا زیادہ تر قید و بند رہے۔ان تمام تر سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں مکران میں بھی ایک سیاسی قیادت حاجی عبدالسلام بلوچ ، میر عیسیٰ قومی ودیگر سیاسی رہنماؤں کی صورت میں ابھر کر سامنے آئی۔اور اب اس تحریک کے اثرات محدود پیمانے میں مکران بھر کے طول وعرض میں بھی شدت سے محسوس ہونے لگے۔

درحقیقت اس خطے میں قلات نیشنل پارٹی اور برصغیر کے اندر دیگر انقلابی تحریکوں کے نتیجے میں حکومتی گرفت روز بروز کافی کمزور اور آخر کار نہ ہونے کے برابر محض علامتی طور پر قائم

رہی۔ ایک الگ رائے کے مطابق تاج برطانیہ اپنی مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے بعد برصغیر کی تقسیم و بلوچستان کے مستقبل کے متعلق ایک واضح پالیسی اپناتے ہوئے مستقبل کے سیاسی وعسکری مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے بلوچسان کو آزاد وخود مختار مملکت کے بجائے پاکستان کے ساتھ الحاق کیلیئے دباوَ ڈالنے کی پالیسی پر گامزن رہی۔ تاہم بلوچستان میں سیاسی عمل سے ایک حد تک بلوچ قوم میں پہلے ہی سیاسی وقومی آگاہی اور قومی شناخت کی سوچ وشعور پیدا ہوچکی تھی۔ چونکہ بلوچستان بھر کے سیاسی عمل میں مکران بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اگرچہ کوئی خاص سیاسی قیادت کے نہ ہونے کے باوجود مکران کے عوام بلوچستان کی آزاد حیثیت وخود مختاری کیلیئے ہونے والے جدوجہد میں محدود انداز میں حصہ دار وشریک تھے۔ تاہم یہ علاقہ بلوچستان کے کافی مغربی سرحد پر واقع ہونے، تعلیمی اداروں کی عدم موجودگی اور مضبوط قبائلی ڈھانچہ مکران سے سیاسی قیادت کے ابھارنے میں اہم رکاوٹ تھی۔ اگرچہ عاقلانہ جائزہ لیا جائے تو بلوچستان پر قبضہ گیری واستعماری قوتوں کی پامالی اور مضبوط قبائلی ڈھانچے کی ظلم وزیادتیوں نے فطری طور پر اس خطے کے اندر ایک قوم پرستانہ سیاسی سوچ وفکر کو جنم دیا تھا۔ جسے بلوچستان بھر میں کہیں زیادہ موثر یا غیر موثر صورتوں میں بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اور یوں بلوچ قیادت نے بلوچستان کی آزاد وخود مختار قومی شناخت کی تحریک میں شدت پیدا کی ۔البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے واضح طور پر آزاد وخود مختار بلوچستان کا تصور بھی پیش کیا تھا۔ بلوچ قوم پرست قیادت کی قوم پرستانہ نظریہ وسوشلسٹ خیالات میں ریاستی اور برٹش بلوچستان کے ساتھ ساتھ ان علاقوں کی حصول تھی جو تاج برطانیہ نے اپنے مفادات کے پیش نظر ہمسایہ مما لک میں تقسیم کئے تھے۔ اور بلوچ قوم پرست قیادت برطانوی تسلط سے قبل بھی بلوچستان کی سیاسی اصلاحات کے ساتھ آزادوخود مختار پوزیشن کے خواہاں رہے تھے۔

1947ء کے وسط میں میر احمد یار خان بلوچ کی سیاسی اصلاحات کے تحت تاریخ میں

پہلی بار بلوچستان میں انتخابات منعقد کرائے گئے۔جس میں قلات نیشنل پارٹی نے واضح اکثریت حاصل کی اور قلات نیشنل پارٹی بلوچ قوم کی موثر ترین نمائندہ جماعت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔اس خطے کے اندر بلوچستان کے مستقبل کے بارے میں خصوصی طور بلوچستان پارلیمنٹ کے ایوان زیریں (دارالعوام) کا اجلاس 14 دسمبر کو بمقام ڈھاڈر طلب کیا گیا۔بلوچستان اسمبلی کے پہلے اجلاس میں میر غوث بخش بزنجو کا یہ یادگاری اور تاریخی تقریر جو بلوچستان کے مستقبل کے خدوخال کی غمازی کرتی تھی اور قوم پرستانہ سیاست کے حوالے سے نہایت تاریخی اہمیت کا حامل رہا۔

بالآخر نوزائیدہ پاکستانی مقتدرہ نے بلوچستان کے الحاق کے معاملے میں ناکامی کے بعد قوت و طاقت استعمال کرنے کی پالیسی اپنائی اور خان آف قلات کو ان کے شاہی قلعے سے گرفتار کیا گیا۔نیشنل پارٹی کے قائدین بھی گرفتار ہوئے اور جبکہ دوسری جانب انگریزوں کی سابقہ پالیسیوں کو اپناتے ہوئے بلوچستان کے قبائلی سرداروں ،نوابوں کی سرپرستی اور انہیں غیر ضروری قوت و طاقت بخشنے کے ساتھ ساتھ الحاق کی صورت میں انہیں ان کی ریاستوں میں بااختیار بنانے کے معاہدے کئے۔سب سے پہلے سردار کیچ نواب بائیان گچکی کو اپنا حامی وگماشتہ بنا کر پورے ریاست مکران کا باقاعدہ نواب بنایا۔دراصل اس فیصلے کے درپردہ حکومتی سازش اور مکروہ پالیسی کارفرما تھی۔اس متنازعہ فیصلے کو نہ صرف سردارانان تمپ و پنجگور بلکہ خان آف قلات نے ماننے سے انکار کیا اور اس دوران خان آف قلات کے بھائی شہزادہ آغا عبدالکریم احمدزئی بطور نائب مکران کے امور کی نگرانی کے امور پر فائز تھے۔ انہیں بے اختیار کر کے فارغ کرنے کی سازشوں کی باقاعدہ ابتداء ہونے لگی۔

اس ضمن میں مکران کے سرداروں اور معتبروں نے میر بائیان کی بطور نواب تعنیاتی کو بلوچ قوم کی صدیوں سے قائم قبائلی روایات کے برخلاف قرار دیکر مسترد کی۔اسی اثناء میں سردار سر بلند خان گچکی سردار پنجگور نے خان آف قلات کو باقاعدہ تحریری طور پر لکھا کہ ہم بائیان گچکی کے اس غیر آئینی و غیر اخلاقی قبائلی روایات کے برخلاف فیصلے سے اتفاق نہیں

رکھتے اور بلوچستان کے مستقبل کے حوالے سے (الحاق) ہمارے رائے کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور بائیان کو یہ حق نہیں کہ وہ مکران کے سردار ہونے کا دعویٰ کرے لہذا بائیان گچکی کے پسند کی بنیاد پر ہم پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں نہیں۔ اس خط کے متن سے سردار پنجگور کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں نظریہ وسوچ واضح ہو جاتی ہے اور واضح طور پر پنجگور کے عوام کی مجموعی سوچ وفکر کی ترجمانی رہی ہوگی۔ بلوچستان کے متعلق نوازئیدہ مملکت کے متعلق سیاسی منظر نامہ واضح ہونے کے بعد بلوچستان کے ریاستوں کے نوابوں وسرداروں کے ذریعے الحاق کیلئے حکمت عملی ترتیب دی گئی۔ اور مزاحمت کی صورت میں طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہ کی گئی۔ اسکی ابتداء متنازعہ نواب آف مکران بائیان گچکی سے کی گئی اور باقاعدہ پہلے نواب آف مکران (متنازعہ) جنہوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق نامے پر دستخط کئے بعد میں دیگر ریاستوں کو بھی الحاق کروا کر 1666ء میں وجود آنے والی بلوچ ریاست 27 مارچ 1948ء کو دنیا کے نقشے سے غائب ہوگئی۔ مزاحمت کے پیش نظر خان آف قلات کو گرفتار کر کے شاہی قلعہ میں قید رکھا گیا اور اسی دوران سخت مزاحمت مکران ہی میں دیکھنے میں آئی کہ خان آف قلات کے بھائی شہزادہ عبدالکریم احمد زئی نائب وحاکم اعلیٰ نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کا اعلان کر کے اپنے لشکر کے ساتھ سرلٹھ سے باقاعدہ مسلح مزاحمتی تحریک کی رہنمائی کی۔

بلوچ قوم کی برصغیر کے ساتھ مختلف تہذیب وتمدن، وتشخص کے ادغام وقدغن جیسی پالیسی نے ابتداء ہی سے بلوچستان کی سیاسی وسماجی معاشرے میں کشمکش سی کیفیت پیدا کی تھی۔ بعد میں اوّل روز سے ہی بلوچستان واضح طور پر دو گروپوں کے درمیان تقسیم ہوئی ایک وہ گروہ جنہیں ہمیشہ ہی سے ملک کی مقتدرہ کی آشیر باد وہمدردی رہی جنہیں عرف عام میں اسٹیبلشمنٹ کے حامی وہمنواء کہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری جانب وہ قوتیں جو ابتدائی ادوار سے بلوچ سیاسی عمل کے تسلسل کے نتیجے میں قوم پرستانہ اور ترقی پسندانہ سوچ وفکر کے حامل تھے جو ہمیشہ سے مقتدر قوتوں کی زیر عتاب رہ کر بھی سیاسی عمل میں موثر کردار ادا کرتے رہے

ہیں ۔جنہیں ہمہ وقت ادیبوں، دانشوروں، روشن خیالوں اور خاص کر سوشلسٹ قوتوں کی حمایت و ہمدردی حاصل ہوتی رہی ہے۔ چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بلوچ سیاسی قوتوں کے درمیان الحاق سے پیدا ہونے والی تلخیوں کو بھلانے کی مصالحتانہ ومفاہمتانہ کوششیں بھی ہوتی رہی ۔ اگرچہ بلوچستان میں قومی حقوق ،بلوچ قوم کی قومی شناخت، زبان و ثقافت اورتہذیب وتمدن کے فروغ اوراس طرح کے مساویانہ حقوق دیگر بہت حدتک بلوچستان کی پسماندگی ومحرومیوں اور ناراضیوں کا ازالہ کیا جاسکتا تھا۔لیکن کبھی بھی کسی دور میں مقتدرہ کی جانب سے ایسی پالیسی اپنائی گئی اور نہ مخلصانہ کوششیں ہوئی ہیں۔ پھر بھی بلوچستان کی موثر ترین سیاسی قیادت نے جمہوری طریقوں سے سرگرم سیاسی تحریکیں بھی چلائی ہے۔

1955ء یعنی آٹھ سال بعد جب ملک میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور بلوچستان سے دستور ساز اسمبلی کیلئے دوممبروں میں سے مقتدرہ اور اسٹیبلشمنٹ کی مرضی و منشاء سے ڈاکٹر خان (برادر بزرگ خان عبدالغفار) کوصوبہ خیبر پختونخواہ (سرحد) سے برآمد کر کے برٹش بلوچستان اور کوئٹہ کے شاہی جرگہ ممبروں اور بلدیاتی ممبروں کے ذریعے ڈرامائی انداز سے منتخب کرادیا۔

جبکہ بلوچستان ریاستی یونین سے نواب آف مکران میر بائیان گچکی کوصرف اورصرف چاروالیان ریاست کی رائے ومنظوری سے دستور ساز اسمبلی کا ممبر چن لیا گیا۔ان فیصلوں اوروفاقی رویئے اورسوچ نے بلوچستان کےعوام کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وفاق کی جانب سے مسلط کردہ رائے اور فیصلے جوکہ بلوچ قوم کی منشاءاورعوامی رائے کے بالکل برخلاف اور ماضی کے پالیسیوں کی مکمل کاپی اور تسلسل ہیں،قبول نہیں کیا گیا۔اس فیصلے کے خلاف کے زبردست احتجاج اور مذمت ہوئی۔جس کے نتیجے میں بلوچستان کے اخبارات ''ساربان اورنوائے وطن'' پر پابندی لگائی گئی۔میر غلام محمد شاہوانی ودیگر سیاسی کارکنوں کوگرفتار کر کے جیلوں میں بند کیا گیا۔

اس کے چند ماہ بعد وحدت مغربی پاکستان کے صوبائی انتخابات فروری 1956ء

میں عمل میں آئے۔ ان انتخابات میں دو سیاسی شخصیتوں کی بلوچستان کے سیاست میں منظرِعام پر آنا بہت اہم تھا۔ اِن انتخابات میں سردار عطاء اللہ مینگل اور میر غوث بخش بزنجو کے درمیان مقابلہ ہوا۔ واضح رہے کہ میر غوث بخش بزنجو قیام پاکستان سے پہلے بلوچستان اسمبلی کے دارالعوام ہی سے ایک قوم پرست، مدبر و دانشمند اور دُوراندیش سیاسی رہنما کے طور پر اپنی الگ پہچان بنا چکے تھے۔ اور بعد میں ان انتخابات میں بحیثیت عوامی قائد اپنی قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت ایک مقبول عوامی لیڈر رہنے۔ انہوں نے بلوچستان اور خاص کر مکران کے سیاسی عمل کے پرورش میں کلیدی رول ادا کی ہے۔ اور وہ حقیقی معنوں میں اس سیاسی عمل کے روح رواں بھی تھے۔ اسلیئے ان کا مکران کے سیاسی و معاشرتی زندگی کے ساتھ گہری اور نفسیاتی و روحانی تعلق آخری لمحوں تک قائم و دائم رہی اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان کی سیاسی شخصیت مکران ہی سے ابھرا تھا۔

علاوہ ازیں بلوچستان کی قومی وشعوری جدوجہد اور قوم پرستانہ سوچ وفکر کے اثرات بلوچستان کے کچھ علاقوں میں کہیں زیادہ اور کہیں کم ہیں۔ مگر مکران بلوچستان کا وہ علاقہ تھا جہاں پر قوم پرستانہ سیاسی اثرات بلوچستان کے دیگر علاقوں کی نسبت سب سے پہلے زیادہ نمودار ہوئے تھے۔ یہاں پہلے پہل فرسودہ قبائلی نظام میں بلوچ سیاسی کارکنوں کی منظم و متحرک جدوجہد کے نتیجے میں اولین شگاف پڑا۔

چھ سال بعد 1962ء کے انتخابات میں بلوچستان اور خاص کر مکران ہی اہم ترین توجہ کا مرکز رہا۔ مکران کے محنت کش عوام کی حمایت و ہمدردی سے مکران کے قوم پرست رہنماؤں نے بلوچستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ میر دوست محمد بلوچ جو کہ ایک ادنیٰ متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے شخص تھے مکران کی طاقت ورترین قبائلی شخصیت اور نواب آف مکران نواب بائیان گچکی کے ولی عہد نوابزادہ حمید اللہ گچکی کے مقابلے میں بطور امیدوار نامزد کیا۔ یہ عمل مکران کے سیاست کا عملی طور پر ایک واضح تبدیلی وقبائلی نظام سے بغاوت کے مترادف تھا۔ اس سے یقیناً سرداریت کے بلند بالا اور سربفلک مضبوط قلعہ میں پہلی گہری شگاف کا پڑنا یقینی امر تھا۔ نوجوان قوم پرست وترقی پسند سیاسی کارکنوں کے نامزد امیدوار میر

دوست محمد بلوچ سخت مقابلے کے بعد چند ووٹوں سے شکست اس خطے کے سیاسی و جمہوری قوتوں کیلئے ایک عظیم فتح سے ہرگز کم نہ تھی۔ اور اس کے بعد بلوچ قوم پرست قوتوں کیلئے سیاسی عمل میں شراکت داری اور عام کارکن کا سیاسی عمل میں شرکت یقینی رہی۔

دوسری بار 1962ء کے انتخابات میں بلوچستان کے قومی رہنماؤں وقوم پرست قوتوں کو طویل قومی جدوجہد کے پاداش میں قید بند کی سزائیں ہوئیں اور نااہل قرار پانے پر ان انتخابات سے باہر رہیں۔ ان تمام ترحربوں کے باوجود مکران میں صحیح و درست قیادت کا انتخاب ہو چکا تھا۔ ان انتخابات تک مکران میں سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں قدیم روایتی نوابوں اور سرداروں کی قوت و طاقت آخری ہچکیاں لے کر زمین بوس ہوئی۔ ان انتخابات کے نتائج کے برعکس مقتدرہ کے حمایتی و نواب آف مکران کے والی ایک تعلیم یافتہ سیاسی کارکن میر عبدالباقی بلوچ کے سامنے بری طرح شکست نے مکران کی سیاست عملی طور پر مکمل ان قوتوں کے سایوں سے بھی کوسوں دور کر کے عوام کے ہاتھوں منتقل کی۔ جس پر ان کی گرفت کئی دہائیوں تک مظبوط و مستحکم تھی۔

میر عبدالباقی بلوچ جو کہ ایک متوسط عام گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لاہور کالج سے فارغ شدہ ایک ذہین و بلیغ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ منجھے ہوئے سیاسی رہنماء تھے۔ وہ سیاسی سوج بوجھ کے ساتھ ایک شعلہ بیان مقرر کی بے پناہ صلاحیتوں کے بدولت عام آدمی کو اپنی جانب راغب ومتوجہ کرنے کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے بلوچستان کی پسماندگی و احساس محرومی و بلوچ قوم کے قومی حقوق کا مقدمہ بھر پور و موثر اور مدبرانہ انداز میں لڑا۔ وہ جرائت و استقلال کے ساتھ بلوچستان میں فوجی آپریشن اور ظلم و زیادتیوں پر مغربی اسمبلی کے پلیٹ فارم پر چیختے چلاتے رہے۔ جلسہ جلوسوں اور سیمیناروں سے بلوچستان کی اصل و حقیقی صورت حال سے ملک اور دنیا کو آگاہ کرتے رہے۔

مقتدرہ و ملک کی مضبوط اسٹیبلشمنٹ باقی بلوچ سے خائف ہو کر ان کی سیاسی جدوجہد سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہیں ناپسندیدہ شخصیت قرار دیکر ان پر تادیبی کاروائی کرنے

لگی حتیٰ کہ انہیں مارنے کی شرم ناک پالیسی پر گامزن رہ کر ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ جس سے وہ شدید زخمی ہونے کے باوجود موجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ ان تمام تر مشکلات کے باوجود وہ ایک مستقل مزاج وَنڈر اور باہمت سیاسی رہنما کی طرح ثابت قدم رہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ میر باقی بلوچ کی الیکشن جیتنے کے بعد سیاسی کیئریر پر بہت سے سوالیہ نشان لگائے گئے تھے۔ شاید کسی کو ان کے نظریات وسوچ وفکر سے اختلافات تو ہوسکتا ہے لیکن ان کی قابلیت وصلاحیت وطن دوستی پر کسی طرح انکار نہیں۔ وہ اپنے اندر ایک جادوئی شخصیت کے مالک تھے۔ جو مکران سے ابھر کر ملک بھر کے سیاسی ماحول کو متاثر کیئے رکھا تھا۔

تیسری بار 1964ء کے بی ڈی ممبروں کے ذریعے انتخابات میں مکران کے عوام نے باقی بلوچ کے بعد ایک اعلیٰ ودانا، مدبر اور دور اندیش قوم پرست رہنماء میر غوث بخش بزنجو کا انتخاب کیا۔ مکران کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ بلوچستان کے قد آور سیاسی رہنماؤں کو اپنی ووٹوں سے ملک بھر کے سیاسی عمل میں نام پیدا کرانے کے مواقع دیتے رہے ہیں۔ میر غوث بخش بزنجو حقیقی معنوں میں ایک ترقی پسند وقوم پرست خیالات کے حامل شخصیت تھے۔

میر غوث بخش بزنجو و دیگر رہنماؤں نواب خیر بخش مری اور سردار عطاء اللہ مینگل نے بلوچ قوم کے سیاسی وسماجی حقوق و بلوچستان کی ترقی وخوشحالی کیلئے بھرپور جدوجہد کی یہ ملکی سطح پر اپنی ترقی پسندانہ سوچ وفکر کے بناء پر نامور بھی ہو چکے تھے۔

میر غوث بخش بزنجو نے اپنے فکر وفلسفہ اور سرزمین بلوچستان سے عاشقانہ حد تک محبت دوستی کی اور تکلیف دہ سیاسی جدوجہد کی۔ وہ تاریخی کردار کے ناقابل فراموش سیاسی کردار ہیں۔ انہوں نے بلوچستان میں سیاسی اتحاد ویکجہتی اور قبائلی نظام کے خلاف اور مکران کو فرسودہ قبائلی روایات سے نکال کر سیاسی ونظریاتی راہ پر گامزن کرنے میں کلیدی کردار ادا کی تھی۔

اور بعد میں 1966ء کو بلوچ طلباء نے کراچی یونیورسٹی میں بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشن آرگنائزیشن BSEO، ورناء وانندہ گل کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ جسے بعد

میں بلوچ طلباء کی موثر و متحرک نمائندہ تنظیم ہونے کے بناء پر بی ایس او (بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن) میں تبدیل کیا گیا۔ طلباء تنظیم بی ایس او (BSO) تنظیمی حوالے سے منظم نظم ونسق کے ساتھ سیاسی ونظریاتی لحاظ سے واضح طور پر ترقی پسند وقوم پرست سوچ وفکر وخیالات پر استوار ٹھوس موقف رکھتا تھا۔ بی ایس او کا بنیادی اغراض ومقاصد میں بلوچ طلباء کے تعلیمی مسائل وحقوق اور انہیں نظریاتی اور شعوری لحاظ سے منظم کرنا تھا۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ تنظیم بلوچستان کی سیاسی بنیادوں میں گہری تعلق و بنیاد رکھتی تھی۔ اور یہ تنظیم قلات نیشنل پارٹی کے بعد بلوچ سیاسی ماحول کے تبدیلی کا ایک بنیادی موجب وابتداء وبنیاد بنا۔ یہ بلوچ قوم پرستانہ وترقی پسندانہ جدوجہد کا وہی تسلسل تھا جو ماضی میں مختلف تنظیموں اور جماعتوں کے پلیٹ فارموں سے رہا تھا۔ بی ایس او (BSO) جوکہ بلوچستان کے قبائلی وروایتی نظام کے متبادل ترقی یافتہ، قومی یکجہتی اور جدید سیاسی نظام کے خواہاں تنظیم تھی۔ اس تنظیم نے بلوچستان اور خاص کر مکران میں وقت کے ساتھ ساتھ کافی مضبوط سیاسی قوت وطاقت حاصل کی۔

اور یوں بی ایس او کے سیاسی عمل میں متحرک کردار کی وجہ سے بتدریج بلوچستان کی سیاست عملی طور نوجوان تعلیم یافتہ قیادت کے ہاتھوں تیزی سے منتقل ہو رہی تھی اور اگر اس وقت پورے بلوچستان پر مضبوط قبائلی گرفت سب بڑی رکاوٹ نہ ہوتی تو یقیناً آج بلوچ سیاست اپنی سیاسی راہیں متعین کرنے میں کامیاب ہوتا۔ البتہ یہی سے بلوچستان کی سیاست کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بلوچستان کی قوم پرست سیاست کو جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ مشرقی بلوچستان میں واضح طور پر بلوچ عوام میں سیاسی سوج بوجھ اور سیاسی شعور کی نمایاں کمی اور اب تک قبائلی نظام روبہ تنزلی کی جانب گامزن ہونے کے باوجود ایک حد تک پھر بھی قوی اور مستحکم انداز میں قائم ہونے کی وجہ سے نمائندگی اور قیادت میں عام سیاسی کارکنوں کی رسائی ممکن نہیں۔ حالانکہ مشرقی بلوچستان میں قدآور اور نامور قوم پرست شخصیات نے سیاسی عمل میں بڑا نام بھی پیدا کیا ہے۔

جبکہ دوسری جانب مغربی بلوچستان میں مکران سیاسی عمل کے ابتداء ہی سے قوم پرستانہ سیاسی رجحانات کے زیر اثر رہا ہے۔ انجمن بلوچاں، اُستمان گل، قلات نیشنل پارٹی کے سیاسی تحریکوں کا ہمیشہ منبع و مرکز رہا اور مکران کی نسبت قلات و نصیر آباد اور سبی کے علاقے سیاسی سوجھ بوجھ و آگاہی کے لحاظ سے کافی پست تصور ہوتے ہیں۔ مگر ان تمام صورت حال کے باوجود بلوچستان کے تمام علاقے کسی نہ کسی طرح بلواسطہ یا بلاواسطہ قوم پرست سیاسی رجحانات کے زیر اثر دکھائی دیتے ہیں۔

1970ء میں بلوچستان کو صوبائی حیثیت ملنے تک بلوچ سیاست میں بی ایس او نے بھرپور سیاسی جدوجہد اور محنت کش و مظلوم عوام کی نمائندگی کے باعث اس علاقے کا سیاسی ماحول نوجوانوں کے سیاسی نظریات کے زیر اثر لانے میں کلیدی کردار ادا کی۔

ملکی تاریخ میں فی کس فی ووٹ کے بنیاد پر 1970ء کے انتخابات میں یہ علاقہ سیاسی اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ بی ایس او کے نوجوان قیادت کے سیاسی سپورٹ و حمایت نے نیپ (NAP) کو بلوچستان کی مضبوط و متحرک اور منظم سیاسی قوت کے طور پر ابھارنے میں مدد دی۔ جس کے آثار 1970ء کے ہونے والے انتخابات میں مکمل طور پر واضح اور صاف نظر آیا کہ قوم پرست قوتیں بلوچستان میں نیپ کے پلیٹ فارم سے کلین سویپ کرنے میں کامیاب ہوئیں اور نیپ (NAP) بلوچستان کی اکثریتی و نمائندہ جماعت کے طور پر ابھری۔

مکران سے نیپ (NAP) کے امیدوار سردار عبدالرحمٰن بلوچ اور میر دوست محمد بلوچ کی بھاری اکثریت سے کامیابی نے مکران کے سیاست پر قوم پرستوں کی قوت پر تصدیقی مہر ضبط کی۔

1970ء کے انتخابات میں بلوچ قوم پرست قوتوں کی نیپ کے پلیٹ فارم سے مکران سمیت پورے بلوچستان میں شاندار کامیابی کے بعد صوبائی مخلوط حکومت تشکیل دینے میں بھی کامیاب ہوئے۔ جس کے نتیجے میں سردار عطاء اللہ مینگل وزیر اعلیٰ اور میر غوث بخش بزنجو بلوچستان کے گورنر منتخب ہوئے۔

بلوچستان میں قوم پرست حکومت کے قیام کے ساتھ ہی وفاق اور صوبائی حکومت کے درمیان صوبائی معاملات پر کشمکش سے بحرانی کیفیت پیدا ہوئی۔ بلوچ قیادت بلوچستان کے وسائل پر زیادہ اختیار و طاقت چاہتے تھے۔ جبکہ اسٹیبلشمنٹ و مقتدرہ ماضی کی طرح بلوچستان میں ابھرتی ہوئی قوم پرستانہ اثرات سے خطرہ محسوس کرنے لگی۔ حالانکہ یہ وفاق اور بلوچستان کے درمیان اعتماد سازی و ماضی کے بداعتمادیوں کے ازالے کا ایک بہترین و نادر موقع تھا۔ لیکن مقتدرہ و اسٹیبلشمنٹ ماضی کی ناعاقبت اندیش پالیسیوں پر گامزن رہتے ہوئے بلوچستان کے منتخب حکومت کو غیر آئینی طریقے سے اٹھارہ ماہ بعد نہ صرف برخاست کی بلکہ نیپ (NAP) پر پابندی اور کالعدم قرار دے کر بلوچ رہنماؤں کو جھوٹے و بوگس مقدمات کے ذریعے جیلوں میں ڈالا گیا۔ اور ان رہنماؤں پر حیدرآباد سازش ٹریبونل کے نام پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان اقدامات کے خلاف بلوچستان اور ملک بھر کے دائیں اور بائیں بازو کے ترقی پسند اور اپوزیشن جماعتوں نے بھرپور تحریک چلائی۔ اور یوں ماضی کے روش و استحصالی پالیسیوں کے سبب بلوچ قوم اور وفاق کے درمیاں وسیع خلیج و بداعتمادی اور کافی نفرتیں پیدا ہوئیں۔

یقینی طور پر اس صورت حال نے بلوچستان اور وفاق کے درمیان بڑی خلیج پیدا کی اور ہونے والے بداعتمادی کی فضاء کو وقت کے ساتھ کافی وسعت ملی۔ اور مقتدرہ نے قوت و فورس استعمال کر کے بلوچستان پر فوجی آپریشن کی جس کے نتیجے ایک دفعہ پھر بلوچ سیاست جمہوری و پارلیمانی سیاسی عمل سے کنارہ کش ہو کر مسلح مزاحمت کی جانب کوچ کر گیا اور یوں چھاپہ مار تحریکیں بلوچستان بھر کے طول و عرض میں پھیلتی گئی۔ چونکہ اس کے اثرات مکران میں اتنی شدت سے نہ تھے پھر بھی اس کے مکمل اثرات سے باہر بھی نہ رہ سکی۔

اِس دوران سردار اسلم جان گچکی نے مکران میں گوریلا وار کی قیادت کی۔ نیپ کو کالعدم قرار دینے اور بلوچ سیاسی قیادت جیلوں میں مقید ہونے سے فطری طور پر ایک سیاسی خلاء کا جنم ہوا۔ جسے بی ایس او کے سیاسی کارکنوں نے زبردست تنظیمی ڈھانچے کے ساتھ قومی

تحریک میں فعال ومنظم طریقے سے پرکی۔ بلوچستان میں مزاحمت وسیاسی عمل دونوں ساتھ ساتھ کافی وقتوں تک برقرار رہی اور یوں مکران وجھلاوان میں بی ایس او نے منظم ومضبوط سیاسی عمل کے ذریعے ایک قومی تنظیم کے طور پر سیاسی جدجہد میں کلیدی کردار ادا کی۔

1977ء کو ملک بھر کے اپوزیشن سیاسی جماعتوں کے زبردست تحریکوں کے نتیجے میں عام انتخابات کا اعلان کیا گیا اوران انتخابات کو نہ صرف بلوچ سیاسی قیادت نے یکسر مسترد کی بلکہ ملک بھر کے اپوزیشن اتحاد نے بھی بائیکاٹ کی۔ ویسی ہی نیپ پر پابندی اور بلوچ سیاسی رہنماؤں پر حیدرآباد ٹربیونل (حیدرآباد ٹربیونل سازش کیس) کے نام پر مقدمات چل رہے تھے۔ اور 1977ء کے انتخابات میں زبردست دھاندلی اور بوگس ووٹوں سے جو اسمبلی معرض وجود میں آئی۔ ان میں مکران سے قومی اسمبلی کی نشست پر پی پی پی (پاکستان پیپلز پارٹی) کے میر امان اللہ گچکی بلا مقابلہ چن لئے گئے۔ اور پنجگور کے صوبائی اسمبلی کی نشست پر بھی پی پی پی کے صابر علی بلوچ کا انتخاب ہوا۔

نگران انتخابات کے اعلان کے ساتھ ہی اپوزیشن اتحاد نے پہلے ہی تحفظات کا اظہار کیا تھا اورانتخابات کے بعد اپوزیشن تحریک کی شدت سے خوفزدہ ہوکر ملک میں مارشلاء نافذ کیا گیا اوراقدام کے طور پر بلوچستان میں فوجی آپریشن بنداور بلوچ قیادت کو رہا کر کے حیدر آباد سازش کیس بھی ختم کر دی گئی۔

بلوچ قائدین کو رہائی تو ملی لیکن بدقسمتی سے بلوچ قوم پرست قوتوں نے بلوچستان کے عوام کو بحرانی کیفیات سے نکال کر سیاسی طور پر منظم نہیں کی جس کی وجہ سے بلوچستان کی سیاست مزید انتشار وتقسیم ہوئی۔ اور بلوچ قوم پرست رہنماؤں میں نواب خیر بخش مری، سردار عطاء اللہ مینگل اور میر غوث بخش بزنجو کے درمیان نظریاتی اختلافات نے ان کی سیاسی راہیں اور سمتیں جدا کرنے کے ساتھ بلوچ قومی یکجہتی اور سیاسی اتحاد وتنظیم کاری کے عمل پر کاری ضرب لگائی۔ جس سے بی ایس او (BSO) کے نظریاتی وفکری سیاست متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ اور یوں تنظیم کے مضبوط تنظیمی ڈھانچے میں شگاف پڑ گیا۔ لیکن ان

مرحلے میں بلوچ طلباء، ادیبوں، دانشوروں اور ترقی پسند قوتوں نے بلوچ سیاست کو مکمل مایوسی اور جمود کا شکار نہ ہونے دیا۔

نواب خیر بخش مری اُسی دن سے جمہوری و پارلیمانی سیاست سے کنارہ کش ہو کر اپنے سینکڑوں مری قبائل کے ساتھ افغانستان چلے گئے اور اسی طرح سردار عطاء اللہ مینگل خاموشی کے ساتھ لندن میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر کے سیاسی عمل سے بھی مکمل کنارہ کش ہوئے اور میر غوث بخش بزنجو نے پاکستان نیشنل پارٹی (PNP) کے نام سے اپنی الگ جماعت قائم کی اور اس پلیٹ فارم سے بلوچستان کے حقوق قومی وسائل اور زیادہ سے زیادہ صوبائی اختیار کیلئے پر امن سیاسی و جمہوری جدوجہد پر گامزن رہا۔ اس دوران میر غوث بخش بزنجو سیاسی عمل کا حصہ بنا اور بلوچ عوام کے درمیان موجود رہ کر سیاسی کردار ادا کرنے کو ترجیح دی۔ لیکن عملاً بلوچ قوم پرستانہ سیاست میں نظریاتی بنیادوں پر دراڑیں پیدا ہو کر سیاسی قیادت مایوس و منتشر ہوئیں۔ تاہم بلوچ سیاسی کارکنوں اور علمی ادبی شخصیات بی ایس او کے پلیٹ فارم سے سیاسی کارکنوں کو منظم و فعال رکھنے کی جدوجہد میں مصروف عمل رہے۔ جب کہ بی ایس او کی قیادت کسی بھی طرح میر غوث بخش بزنجو کے تعین کردہ نظریات و سوچ کے قائل نہ ہوئے۔ چونکہ بی ایس او (BSO) بلوچستان پر ظلم و زیادتیوں پر سخت گیر موقف کے ساتھ مکمل قومی حق خود ارادیت کی جدوجہد کو اپنا محور گردانتا رہا۔ جبکہ ان نظریاتی و سیاسی تضادات نے بلوچ سیاست میں انتشار و خلیج کو وسیع سے وسیع تر کر دیا

بعد میں بی ایس او (BSO) نے محدود دائرے میں سیاست کرنے کے بجائے عوامی سیاست میں قدم رکھی تو اس کے سبب سیاسی تصادم اور شدت اختیار کرتی گئی۔

1985ء کو صدر جنرل ضیاء الحق کے مارشلا کے ادوار میں ملک میں غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات ہوئے ان انتخابات میں عوام اور سیاسی شخصیتوں اور خاص کر بلوچ قوم پرست قائدین جو ملک سے باہر تھے اِس سیاسی عمل سے باہر رہے۔ اور ان غیر جماعتی انتخابات میں بلوچستان کے تمام حصوں سے قبائلی اور غیر سیاسی شخصیات نے حصہ لی اور

مکران سے قومی اسمبلی این اے 207 تربت پنجگور کی نشست پر پہلی مرتبہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی مذہبی قوت جماعت اسلامی (JI) کے امیدوار مولانا عبدالحق بلوچ آزاد امیدوار کے طور پر کامیاب رہا۔ جبکہ پی بی 48 پنجگور سے ناصر علی بلوچ سیاسی شخصیت واجہ محمد حسین بلوچ کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔

درحقیقت ان ادوار وزمانے میں بلوچ قوم سیاسی عمل وقیادت سے یکسر محروم رہی۔ کوئی اور سیاسی جماعت یا قوت کوئی فعال ومنظّم کردار بھی ادا نہ کرسکا۔ اِن حالات کی روشنی میں نیپ کے بعد بلوچ قوم میں ایک متحرک ومنظّم سیاسی پلیٹ فارم کیلئے شدت سے ضرورت محسوس ہوئی جو قوم پرستانہ سوچ وافقار کے بناء پر بلوچستان کی درست ترجمانی کرسکیں اور قلات نیشنل پارٹی اور نیپ جیسی انقلابی پارٹی کے طور پر ابھر کر بلوچ قوم کو انتشار اور مایوسی سے باہر نکال کر ایک پلیٹ فارم پر متحد ومنظّم کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھیں۔

1987ء میں بی ایس او سے فارغ شدہ سیاسی رہنماؤں کے علاوہ دانشوروں اور اہل قلم نے گذشتہ حالات و واقعات کی روشنی میں فدا احمد بلوچ، ڈاکٹر عبدالحیٔ بلوچ، سردار اختر جان مینگل اور ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کی ولولہ انگیز قیادت میں بلوچستان نیشنل یوتھ موومنٹ (BNYM) تشکیل دی۔ اس تنظیم کو بیرون ملک میں مقیم ممتاز قبائلی اور سیاسی رہنماء سردار عطاءاللہ خان مینگل کی حمایت وہمدردی بھی حاصل رہی۔

یہ نوتشکیل شدہ جماعت بی ایس او کے نظریات وافکار سے مکمل طور پر اثر پذیر تھا۔

دراصل یہ جماعت بی ایس او کے سیاسی سوچ وفکر وجدوجہد کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی اس میں تنظیمی ڈھانچہ اور نظریاتی وسیاسی لحاظ سے ایک قومی جماعت کے اوصاف و خصوصیات تھیں۔ جسے بی ایس او نے ایک جماعت کے طور پر ابھرنے میں سیاسی گراؤنڈ فراہم کی۔

چونکہ مکران کا سیاسی ماحول پہلے ہی سے بی ایس او کے زیر اثر وکنٹرول میں تھی اور یہ جماعت جلد وقلیل مدت میں بلوچستان میں کافی مضبوط وگہری جڑیں پیوسط کرنے میں

کامیاب رہی۔لیکن بدقسمتی سے جلد ہی بلوچ طلباء کی موثر ترین سیاسی قوت میں اختلافات پیدا ہونے سے دو واضح حصوں بی ایس او اور بی ایس او (سہب) کے نام سے نظریاتی طور پر تقسیم ہوئی۔ بی ایس او (سہب) فکری و نظریاتی لحاظ سے بابائے بلوچستان میر غوث بخش بزنجو سے سیاسی وابستگی رکھتی تھی۔ جبکہ بی ایس او (بی این وائی ایم) کے طلباء ونگ کے طور مصروف جدوجہد رہی۔مگر اس تقسیم نے بلوچ معاشرے و ماحول کو کافی متاثر کیا۔اس طرح تعلیمی اداروں میں پرتشدد سیاسی رجحانات نے بھی بلوچ طلباء کے تعلیمی و علمی عمل کو بری طرح متاثر کی۔

اِس پرتشدد سیاسی عمل میں بلوچ رہنماء فدا احمد بلوچ ، ڈاکٹر سلیم بلوچ و دیگر کئی ر ہنمائیں شہید ہوئیں اور مکران کا علاقہ جو کہ ایک علمی ذہنی اور شعوری عمل سے گذر رہا تھا اس سیاسی تقسیم کے نتیجے میں مکمل طور پر پرتشدد سیاسی کلچر کے لپیٹ میں رہا۔لیکن پھر بھی بی ایس او اور بی این وائی ایم مکران کی موثر ترین سیاسی قوت کے طور پر اپنا ہولڈ برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔

1988ء میں جنرل ضیاء الحق کی حادثاتی موت کے بعد ملک میں انتخابات کیلئے راہ ہموار ہوئی۔ بی این وائی ایم اور بی ایس او نے ممتاز بلوچ قوم پرست رہنما نواب اکبر خان بگٹی کے ساتھ ملکر بی این اے بلوچستان نیشنل الائنس (BNA) تشکیل دی۔اس انتخابات میں بی ایس او کے رہنماؤں کی پارلیمانی سیاست میں براہ راست شرکت کا پہلا تجربہ اور اسے عموماً ایک سیاسی تبدیلی اور یوٹرن کے طور پر جانا گیا۔اس انتخابات میں بلوچ قوم پرست قوتیں واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم رہیں۔ میر غوث بخش بزنجو کی پاکستان نیشنل پارٹی (PNP) اور بلوچستان نیشنل الائنس (BNA) سیاسی و نظریاتی اختلافات کے بناء پر ایک دوسرے کے خلاف مدمقابل ہوئیں۔اور اس انتخابات کے نتیجے میں میر غوث بخش بزنجو کو نوجوان قیادت کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی۔وہ این اے 207: پنجگور تربت کی نشست پر بی این اے کے غیر معروف امیدوار منظور گچکی کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئے۔اور میر غوث بخش بزنجو کی جماعت پی این پی مکران بھر سے محظ ایک صوبائی نشست کے علاوہ کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کرسکی۔اور پنجگور کے صوبائی اسمبلی کی

نشست پی بی 48 پر پی پی پی کے امیدوار صابر علی بلوچ بی این اے کے امیدوار اسد اللہ بلوچ کو محظ چندسو ووٹوں کی فرق سے شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ اور مکران کی دیگر تمام نشستوں پر بی این اے کے امیدواروں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

اس انتخابات سے پہلے ہی واضح تھا کہ یہ علاقہ سیاسی ونظریاتی وفکری لحاظ سے قوم پرستانہ سیاست کی زیر اثر رہی ہے۔ تاہم بہت سے ناقدین ودانشوروں نے پی این پی اور میر غوث بخش بزنجو کی شکست کو وفاقی و پرامن جمہوری طرز سیاست کے افقار قرار دی جو کہ کبھی بھی بلوچ سیاسی حلقوں میں ابتداء ہی سے ناقابل قبول وغیر مقبول رہی ہے۔

بلوچستان کی نظریاتی کشمکش و بحرانی کیفیت و اختلافات سے قطع نظر میر غوث بخش بزنجو بلوچ سیاست کے بنیادی ستون ومحور کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ ایک ناقابل فراموش شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ بلوچستان و بلوچ قوم کیلئے ان کی قربانیاں وسیاسی جدوجہد ایک سنہری وتابندہ باب ہیں۔ جو ہمیشہ ایک سمبل وعلامت کی غمازی کرتے رہینگے۔ وہ اپنے عہد کے ایک بااصول، باکردار اور دوراندیش سیاسی رہنما تھے جو مرتے دم تک ثابت قدم رہے۔ مگر کہیں پر بھی اپنے اصولوں اور موقف سے دستبردار نہ رہے۔ انہوں نے مکران کے مستحکم فرسودہ قبائلی نظام کے خاتمے اور جدید سیاسی نظام کے فروغ میں بھی اہم کلیدی کردار ادا کی ہے۔ وہ بلوچ سیاست کے دوسرے ادوار کے خالقوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بلوچ سیاست کے تیسرے ادوار میں میر غوث بخش بزنجو ونوجوان قیادت کے درمیان سیاسی کشمکش وچپقلش اور غیر منطقی تضادات کو بلوچ قوم نے ایک سنگین غلطی اور خاص کر سیاسی کارکنوں نے بلوچ تاریخ میں قومی یکجہتی وقوم پرست سیاست پر ایک کاری ضرب سے تعبیر کی۔ جو یقیناً بلوچ سیاسی تاریخ میں ایک المیہ سے کم نہ تھی۔

1990ء کے دہائی تک بلوچ قوم پرستانہ سیاست، ذاتی عناد اور مفاد پرستی کے دائرے میں آنے سے کافی منتشر و کمزور رہی۔ اور بلوچ طلباء تنظیم بی ایس او کی مختلف گروپوں میں تقسیم کے اور اسی طرح انتخابات کے قریب آنے تک بی این اے بھی اپنی پوزیشن واتحاد کو برقرار اور وسعت دینے میں کامیاب نہ رہ سکا اور موثر ترین بلوچ قوم

پرست جماعت بی این ایم (جو بی این وائی ایم سے بی این ایم میں تبدیل ہوئی تھی) بھی اندرونی اختلافات کا شکار بن کر دو واضح گروپوں میں تقسیم ہوئی۔ اس تقسیم کے نتیجے میں بی ایس او کے صفوں میں بحران و تقسیم ہونا ایک فطری عمل تھا۔ اس سے بلوچ سیاست جغرافیائی وسیاسی اعتبار سے یوں منقسم رہی کہ جھلاوان وسراوان کا علاقہ بی این ایم (مینگل) کے زیر اثر رہی اور چونکہ ان علاقوں میں ماضی کی طرح سیاسی سوج بوجھ وسیاسی شعور کی کمی اور قبائلی نظام مضبوط قوی و مستحکم حالت میں برقرار اور نمائندگی اور سیاسی قیادت میں عام سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کی رسائی بھی ممکن نہ تھی۔

جبکہ دوسری جانب مکران کا علاقہ کئی دہائی پہلے قبائلی نظام سے چھٹکارہ پانے کے بعد ایک مضبوط سیاسی نظام رائج کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ اور اس علاقے سے ماضی میں ممتاز نامور قوم پرست رہنماؤں میر غوث بخش بزنجو، سردار عبدالرحمٰن بلوچ، میر دوست محمد بلوچ اور باقی بلوچ جیسے قائدین کو نمائندگی ملی ہے۔ جو اس علاقے کی سیاسی ونظریاتی سوچ وفکر کی عکاس ہے۔

1990ء کے ابتداء ہی میں بلوچستان میں قوم پرستانہ سیاسی عمل انتشار و بحرانی کیفیت ہی میں رہی۔ نو جوانوں کی سیاسی قیادت بلوچ قوم کو کوئی ٹھوس وموثر پروگرام نہ دے سکی۔ جس کے سبب بلوچستان کی سیاسی ماحول میں اضطراب اور مایوسی پھیلی۔ بلوچ سیاسی قیادت آپسی انتشار و چپقلشوں کو روک کر کسی بھی طرح سیاسی تنظیم سازی کے عمل کو آگے لانے میں کامیاب نہ ہو سکی اور بی این ایم (حیٔ) کی سیاسی اثر ورسوخ مکران ہی تک محدود ہونے کے باوجود 1990ء کے انتخابات میں عوامی ووٹوں اور سیاسی قوت سے محروم رہی۔ این اے 207 تربت پنجگور سے میر غوث بخش بزنجو کے فرزند وپی این پی کے نامزد امیدوار میر بیزن بزنجو بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے جبکہ بی این ایم کے امیدوار ڈاکٹر یسٰین بلوچ پارٹی کے مضبوط ترین حلقے میں الیکشن ہار گئے۔

پی پی 48 پنجگور کی نشست پر پہلی مرتبہ بی این ایم کے امیدوار کچکول علی بلوچ ایڈووکیٹ جے یو آئی کے امیدوار مولوی رحمت اللہ پنجگوری کو محظ چند سو ووٹوں کی برتری

سے شکست دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔اور ان انتخابات میں پنجگور کی تاریخ میں پہلی دفعہ مذہبی قوتیں عوامی حمایت اور اتنی تعداد میں ووٹ لینے کے عمل نے مذہبی سیاسی اثر و رسوخ کو بھی کافی مظبوط و مستحکم کی۔لیکن اس کی اہم وجہ بی این ایم (مینگل) کے الیکشن بائیکاٹ تھی جس کی وجہ سے زیادہ تر ووٹ جے یو آئی کے امیدوار کے حق میں آئے۔اس الیکشن کے بعد بی این ایم (BNM) پنجگور میں اپنی سیاسی اثر و سوخ و گرفت مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ روایتی سیاست کو قلع قمع اور سیاسی کلچر کو فروغ دینے میں کامیاب رہا۔

1993ء کے انتخابات تک پی این پی مکران پر اپنی سابقہ سیاسی کنٹرول کو برقرار نہ رکھ سکی اور اسی طرح بی این ایم (مینگل) کو بھی موثر عوامی طاقت و حمایت حاصل نہ ہوئی۔ مکران کی سیاست بدستور تنزلی اور بحرانی کیفیت سے دوچار رہی۔جبکہ وقت کے ساتھ بی این ایم پنجگور پر اپنی سیاسی حکمت عملیوں و موثر عوامی پالیسیوں کے سبب ایک عوامی قوت بنی۔اور یوں پنجگور میں بی این ایم کے مضبوط ووٹ بینک سے این اے 207 پر بی این ایم کے امیدوار کی کامیابی یقینی بنتی گئی۔

1993ء کے انتخابات میں این اے 207 تربت پنجگور سے بی این ایم کے امیدوار ڈاکٹر یاسین بلوچ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔اس حلقے میں ایک دفعہ پھر بی این ایم اپنی موروثی سیاسی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

پی بی 48 پنجگور کی صوبائی نشست پر بی این ایم کے امیدوار کچکول علی بلوچ ایڈووکیٹ دوبارہ کامیاب ہوئے۔لیکن ان انتخابات میں بی این ایم (مینگل) کے امیدوار اسداللہ بلوچ نے بی این ایم کے امیدوار کو کافی ٹف ٹائم دی اور کسی حد تک اپنی سیاسی اور عوامی پوزیشن برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔

1997ء کو بلوچ سیاست کو انتشار و بحرانی حالات سے نکالنے کیلئے سیاسی کارکنوں، دانشوروں اور خاص کر ترقی پسند قوتوں کی انتھک جدوجہد کے نتیجے میں پی این پی اور بی این ایم (مینگل) کے انضمام کے نتیجے میں بلوچستان نیشنل پارٹی (BNP) کے نام سے ایک نئی جماعت تشکیل ہوئی۔

کافی غور وخوض اورطویل مدت بعد بلوچ قوم پرست قوتیں ایک پلیٹ فارم تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اوراسے بلوچ عوام کی بھرپورحمایت و ہمدردی رہی جوجلد ہی ایک موثر سیاسی جماعت کےطور پرسیاسی ماحول کی تبدیلی کا موجب رہا۔

جبکہ بی این ایم نے الیکشن میں کسی اتحاد وانضمام کے بجائے نوتشکیل شدہ جماعت بی این پی کےسامنے مقابلےکوترجیح دی۔ چونکہ بی این پی کافی مضبوط ومتحرک سیاسی وعوامی طاقت ہونے کےساتھ جنہیں قبائلی قوت وطاقت اورسیاسی بنیادوں پرمضبوط ومتحرک کیا گیا تھا۔ ناقابل شکست ثابت ہوئی۔ بی این ایم کا سیاسی قلعہ جومکران تک محدود تھا اس سیاسی قوت کے سامنے پورے مکران سے اپنی ایک نشست کے علاوہ بری طرح شکست سے دورچار رہی۔

این اے 207 تربت پنجگور سے بی این پی کے امیدوار شکیل بلوچ ایڈووکیٹ نے بی این ایم کے امیدوار ڈاکٹر یسئین بلوچ کے مقابلے میں بڑی مارجن سے کامیابی حاصل کی۔

پی پی 48 پنجگور سے بی این پی کے امیدوار اسداللہ بلوچ بی این ایم کے امیدوار کچکول علی بلوچ ایڈووکیٹ کے مقابلے میں کامیاب ہوئے انہیں یہ کامیابی کافی جدوجہدو مشترکہ پلیٹ فارم ہی کی بدولت ملتی ہے۔

اگراس علاقے کی سیاسی ماحول کا بغور جائزہ لیا جائے توبہ آسانی یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ مکران کی مجموعی سیاست ہمیشہ قوم پرستانہ سوچ وفکر کے گرد ہی رہی ہے۔اس خطے کے عوام نے ہرمحاذوں پر بننے والی قوم پرست جماعتوں اوراتحادوں کا بھرپورساتھ دیا ہے۔ قلات نیشنل پارٹی، نیپ، بلوچستان نیشنل الائنس، بی این ایم اور بلوچستان نیشنل پارٹی جیسی قوتوں اور پلیٹ فارموں سے سیاسی طور پروابستہ رہے ہیں۔

ان انتخابات میں بی این پی کونیپ اور بی این اے کے بعد پہلی مرتبہ حکومت کرنے کا موقع ملا جونواب اکبرخان بگٹی کی جماعت جمہوری وطن پارٹی (JWP) ودیگر کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے میں کامیاب رہے۔

اور جس کے نتیجے میں بی این پی کے صدر سردار اختر جان مینگل بلوچستان کے وزیر اعلیٰ تو منتخب ہوئے مگر ماضی کی طرح یہ جماعت بھی نا عاقبت اندیش قیادت کی رسہ کشیوں اور غلط پالیسیوں کے نتیجے میں زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد بی این پی کے تقسیم و انتشار نہ صرف مکران بلکہ بلوچستان بھر کے قوم پرست و ترقی پسند قوتوں کیلئے ایک دفعہ پھر سیاسی طور پر مایوسیوں کا سبب بنا۔ یہ سیاسی تقسیم و انتشار مکران کے سیاست پر کاری ضرب کے برابر رہی۔ اس بار اس قوم پرستانہ تقسیم و انتشار کے بڑے منفی اثرات نمودار ہوئے اور نظریاتی و قوم پرستانہ سیاسی افکار کی جگہ آہستہ آہستہ روایتی سیاست جگہ کرتی گئی۔

اکتوبر 1999ء کو جمہوری حکومت کو ختم کر کے ملک میں مارشلاء نافذ کی گئی۔ مارشلاء ایڈمنسٹریٹر جنرل پرویز مشرف نے ابتداء ہی سے بلوچستان کے متعلق ایسی پالیسی اور روش اپنائی جو کسی بھی طرح بلوچ عوام کی مرضی و منشاء کے مطابق نہ تھی۔ بلوچستان جو کہ قدرتی وسائل سے مالا مال خطّہ ہونے کے باوجود پسماندگی غربت وسائل پر عدم کنٹرول و استحصال کے خلاف بلوچ قیادت طویل زمانے سے وقت و حالات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور جمہوری عمل کے ساتھ مسلح مزاحمتی جدوجہد کو آزماتا رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں ملک کی طاقت ور ترین سول و ملٹری اسٹیبلشمنٹ نے بلوچستان پر کئی بار فوجی آپریشن و بھرپور قوت و طاقت بھی استعمال کی ہے۔ ہر بار کے فوجی آپریشن میں بلوچستان کے مظلوم و محکوم عوام کی کافی تباہی و بربادی اور بلوچ عوام کی سیاسی اور سماجی زندگی بھی ملیامیٹ رہی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جنرل پرویز مشرف کی فوجی آمرانہ پالیسیوں اور ماضی کے تسلسل و ملٹری سوچ فکر نے ایک دفعہ پھر بلوچستان کے پرامن جمہوری سیاسی عمل کو مسلح مزاحمت کی جانب موڑنے اور قومی دھارے سے نکالنے کے بنیادی راہیں استوار کرنے میں اہم رہے۔

2002ء تک مکران میں سیاست و سیاسی عمل بی این ایم، بی این پی (م) اور بی این پی (عوامی) کے درمیان منقسم رہی۔ جنرل پرویز مشرف کی زیرنگرانی میں نیا بلدیاتی سیٹ اپ و انتخابات جن میں تمام قوم پرست جماعتوں نے بھرپور انداز میں حصہ لی اور بی این ایم نے مکران سے بلدیاتی انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل کی۔

2002ء کو جنرل پرویز مشرف کی زیرنگرانی میں ملک بھر کے انتخابی نظام میں تبدیلی و

نئے سرے سے حلقہ بندیوں کے نتیجے میں انتخابات ہوئے۔نئی حلقہ بندیوں کے نتیجے میں تاریخ میں پہلی مرتبہ پنجگور کو تربت سے الگ کرکے ضلع خاران کے ساتھ شامل کرکے این اے 271 پنجگور خاران واشک کے وسیع رقبے پر مشتمل حلقے میں شامل کیا گیا۔لیکن پنجگور کا سیاسی وسماجی اعتبار سے اس حلقے میں کوئی تعلق بھی نہیں بنتا تھا۔یہ ایک غیر فطری تعلق تھا۔ اس سے نیشنلسٹ قوتوں کے لئے ایک روایتی و نیم قبائلی حلقے میں سیاسی طور پر انٹری کرنا کافی مشکل رہا۔اور خاص کر پنجگور کے قوم پرست قوتوں کیلئے ایک بڑا سیاسی دھچکہ ثابت ہوا۔

اِس کا اندازہ بہ آسانی آنے والے الیکشنوں کے نتائج سے اخذ ہوئیں۔

2002ء کے انتخابات میں یہ نمایاں رہی کہ این اے 271 پنجگور خاران واشک سے مذہبی اتحاد متحدہ مجلس عمل (MMA) کے اُمیدوار مولوی رحمت اللہ پنجگوری نے جن کا تعلق پنجگور سے تھا بی این ایم کے امیدوار عبدالخالق بلوچ کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ اِس حلقے میں 1985ء کے بعد کسی مذہبی امیدوار کی یہ پہلی کامیابی تھی۔ایک تو نئے حلقہ بندیوں کے سبب خاران واشک کے ضلعوں میں مذہبی رجحانات اور ووٹ بنک رہی دوئم مولوی رحمت اللہ جو کہ اس حلقے میں ایک معروف و قابل قدر و مذہبی شخصیت کا ہونا تھا۔نئی حلقہ بندیوں کے نتیجے میں پنجگور دو صوبائی اسمبلی کی نشستوں پی بی 43 ii اور پی بی 42 i پر مشتمل ہوئی۔

پنجگور کے صوبائی حلقے پی بی 43 ii سے بی این ایم کے امیدوار کچکول علی بلوچ ایڈووکیٹ نے بی این پی (مینگل) کے امیدوار جہانزیب بلوچ کو بہ آسانی سے شکست دی۔جبکہ بی این پی (عوامی) کے امیدوار اسداللہ بلوچ اپنی سابقہ سیاسی گرفت و ووٹ بینک کو برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہوئے۔

پنجگور کے دوسرے صوبائی حلقے پی بی 42 i سے بھی بی این ایم کے امیدوار رحمت علی بلوچ نے بھی کامیابی حاصل کی۔جبکہ اس حلقے میں بھی بی این پی (مینگل) کے امیدوار نذیر احمد بلوچ حریف کے طور پر دوسرے نمبر پر رہے۔جس کے نتیجے میں بلوچستان کے سیاسی

باب: دوازدھم

معیشت (Economy)

معاشی اور تجارتی لین دین کے حوالے سے یہ علاقہ عہد قدیم سے عہد جدید تک یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ پنجگور کا علاقہ اپنے محل وقوع اور جغرافیائی لحاظ سے ایک ایسے خطہ زمین پر واقع ہے جو قدیم عہد سے پورے خطے کی تجارتی لین دین اور اقتصادی و معاشی سرگرمیوں کا منبع و مرکز رہا ہے۔ اس بات کا اشارہ قدیم دور کے جامع و مستند اور نامی گرامی سیاحوں اور مورخین کی تاریخی کتابوں اور سفر ناموں میں بھی ملتے ہیں۔ ابن حوقل اس علاقے کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ اس کی زرخیز زمینوں سے اعلیٰ قسم کی انگور، انار اور میوے جو سرد علاقوں کیلئے مخصوص ہیں پیدا ہوتے تھے۔ مقدسی اس علاقے کی معاشی اہمیت کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ یہ شہر دریاء کے دونوں کناروں دو حصوں پر آباد تھا۔ دوسرے حصہ میں جو بودین کہلاتا تھا اس میں تاجر رہتے تھے۔ ان میں تاجروں کی دکانوں سے جو بازارین تھیں خراسان کے لوگ بہت لین دین رکھتے تھے۔ (دریاء کا اشارہ یقینی طور پر دریاء رخشان کیلئے استعمال کیا گیا ہے)

اور اسی طرح اصطغری (340ھ بمطابق 951) اس علاقے کے ان چھوٹے چھوٹے پیداواری ذرائع کے حوالے سے بھی کافی ذکر کرتے ہیں کہ اس علاقے میں کھجور کے بہت درخت ہیں اور یہ مکران میں تجارت کی ایک منڈی اور بندرگاہ ہے اور اس کے بعد مکران کے شہروں میں بڑا شہر فزبور (پنجگور) ہے۔ ان تاریخی اور مستند حوالوں سے عیاں ہوجاتا ہے کہ پنجگور زمانہ قدیم سے اپنے جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے معاشی و تجارتی سرگرمیوں کیلئے کتنا اہم رہا ہوگا۔ اگر اس علاقے کا ماضی قریب سے جائزہ لیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ ابتداء ہی سے اس علاقے کی معیشت کا انحصار زیادہ تر زراعت سے ہی سے وابستہ رہی ہے۔ لوگ زراعت کے پیشے سے منسلک ہونے کے بناء پر زرعی اجناس کا تبادلہ

کلانچی (کراچی) تک کے علاقوں میں کاروان (قافلوں) کی صورت میں کرتے تھے۔ اس زمانے میں سڑکیں ومواصلات کے دیگر ذرائع نہ ہونے سے کاروان تجارتی لین دین کے اہم ذرائع تھے۔ پرانے زمانے کے لوگ آج تک اکثر اپنے قصہ کہانیوں اور داستانوں میں کاروانی (قافلوں) کے زمانے کے واقعات وسفروں کا ذکر کیا کرتے ہیں اور اس زمانے میں جہاں مواصلات جس میں سڑکین نہ ہونے کے برابر تھے، تو لوگ گدھوں اور اونٹوں کے ذریعے روایتی طور پر اقتصادی تجارت کو فروغ دیا کرتے تھے۔ اور اس علاقے کی سیاسی وجغرافیائی محل وقوع ہی اسے معاشی اور اقتصادی سرگرمیوں کا مرکز اور حب بناتا رہا ہے۔ اور یوں اس علاقے کی معاشی واقتصادی لحاظ سے دیگر ذرائع بھی زیر غور لائیں گے۔

زراعت:(Agriculture):

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ پنجگور کے آبادی کا زیادہ تر دارومدار وانحصار بلواسطہ یا بلا واسطہ زراعت سے وابستہ ہے۔ تاہم یہاں قدیم زمانے سے زمینداری کا عمل فرسودہ طریقوں سے رائج ہے پنجگور کی زمینیں زرخیز اور کچھ حصہ ناقابل کاشت بھی ہیں۔ یہ علاقہ اعلیٰ قسم کے معیاری پیداوار کے طور پر ملک بھر میں مشہور ہے۔ یہ بلوچستان کا واحد علاقہ ہے جہاں پر ہر قسم کی مشہور پیداواروں میں سے کدو، ٹماٹر، بھینڈی، بینگن کے علاوہ دیگر اعلیٰ و معیاری انگور، انار، سیب وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

زمینوں کو بارانی اور کاریزوں یا مشینوں کے ذریعے سیراب کیا جاتا ہے جو کہ اس علاقے کی زمینوں کا 70% فیصد حصہ قابل کاشت ہیں۔ جس میں زیادہ تر زمینیں قابل کاشت جو کہ دیہی علاقوں رخشان، گچک، گوارگو، کیلکور، سوراپ وغیرہ میں واقع ہیں۔ جس سے اعلیٰ قسم کی پیاز، گندم، جو، وغیرہ پنجگور سے باہر مارکیٹوں میں فروخت کی جاتی ہیں۔ لیکن بہتر مواصلات سڑکیں اور مارکیٹ نہ ہونے سے زیادہ تر پیداوار ضائع اور خراب ہوجاتے ہیں۔ جس سے مجبوراً زمیندار اپنی پیداوار اونے پونے داموں میں فروخت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ سرکاری سرپرستی اور موثر ادارے نہ ہونے سے بعض اوقات بارانی سیلابوں اور آفات کے سبب فصلیں تباہ وبرباد یا گل سڑ کر خراب ہوجاتی ہیں۔

آج دور حاضر میں ایران سے ہونے والی تجارت پنجگور کی معیشت، اقتصادیات و کاروبار کا اہم اور بنیادی جز ہے۔ پنجگور کا کراچی سے رابطہ کافی دشوار، سڑکیں و دیگر ذرائع مواصلات کی عدم فراہمی اور دوسرا بڑا شہر کوئٹہ کا رابطہ اسی مشکل صورت حال کی عکاس ہے۔ اسی بناء پر لوگ ایرانی سرحد سے کاروبار کو ترجیح دیتے ہیں۔ پنجگور ایک سرحدی علاقہ ہے اور عوام کی تجارتی سرگرمیوں کا زیادہ تر انحصار حتیٰ کہ خوردونوش کی اشیا تیل آئل و دیگر اجناس رسد ایران کی سرحدوں سے وابستہ ہیں۔ علاقے کی سرحدیں مغرب میں واقع عظیم اسلامی مملکت جو کہ معاشی اور عسکری لحاظ سے کافی مضبوط ترین GDP کے ساتھ امیر ترین ملک ایران سے ملتی ہیں۔ جس پر اختصار سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ایران:(Iran):

ایران دنیا کی معاشی، عسکری اور جغرافیائی لحاظ سے ایک ابھرتی ہوئی طاقت ہے جو کہ دنیا کے اندر روز بروز عالمی منڈی میں کافی گہرا اثر رکھتا جا رہا ہے۔ گیس، توانائی، معدنیات اور (Reserve) وسائل رکھنا والا اہم ترین ملک ہے۔ سب سے زیادہ تیل پیداوار کے ساتھ دنیا کی دوسری بڑی مملکت ہے۔ 1,904,344 کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اور ملک کی آبادی 37,400,000 ہے۔ اکثریت فارسی اور اقلیت میں بلوچ اور کرد آبادی جو کہ سنی مسلک سے وابستہ ہیں۔

سیستان و بلوچستان:(Sestan o Balochistan)

وجہ تسمیہ:

سیستان کی وجہ تسمیہ کو یونانی اور بالخصوص قدیم یونانی مورخین نے جو اس سرزمین (ہلمند) سے گزرے انگیانا کے لفظ سے مطابقت دی ہے۔ یہ لفظ (Drangiana) ایک اور لفظی مصدر (Drangay) سے لیا گیا ہے۔ اس کا تلفظ (Zarangay) از نگائی یا سر نگائی بھی لیا گیا ہے۔ اس زمین اور علاقے کا نام قدیم میں (Zaranka) رہا ہے۔ بظاہر

یہ نام ''ساکا'' قوم کے اس خطے میں 128 ق م حملہ کے نتیجے میں سکستانہ (Sakastana) یعنی ساکا قوم کی سرزمین کے نام پر پڑا۔ ساکا جسے سکاہ لکھا گیا ہے۔ ایک اور ایرانی تاریخی حوالہ کے مطابق حضرت مسیحؑ سے آٹھ سو سال پہلے گزری ہے اس کے موسس اور جداعلیٰ ایش یا کائی نے اس کے مملکت کی بنیاد رکھی اور آزربائیجان پایہ تخت رہا۔

یہ لفظ یعنی (Sakastana) سکستان، سگستان (Segestan) کے روپ سے بدلتا ہوا عربوں کے زمانے میں (Sejestan) بنا۔ انتظامی لحاظ سے کئی صوبوں اور انتظامی یونٹوں کے درمیان تقسیم ہیں اور بلوچ ایران کے صوبہ سیستان و بلوچستان کی سرحدیں پنجگور سے لگتی ہیں جو دونوں بلوچ آبادیاں واضح طور پر سرحد کے درمیان مضبوط لکیر ہونے کے باوجود روحانی ونفسیاتی وابستگی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ داریاں و دیگر زبان وثقافت کے بناء پر بلوچ قوم کے طور پر ایک ہی لڑی میں بندے ہوئے ہیں۔

سیستان و بلوچستان کے شمال میں صوبہ خراسان، جنوب میں دریائے عمان الجیرہ عرب، مشرق میں پاکستان وافغانستان کے ممالک، مغرب میں صوبہ کرمان وبنادر جزائر خلیج فارس واقع ہیں۔ صوبہ کی 1180 کلومیٹر سرحد پاکستان وافغانستان سے ملتی ہے اور آبادی سال ۱۳۵۵ء شمسی مطابق 1976ء کی مردم شماری کے مطابق سیستان و بلوچستان کی بالغ آبادی 659297 پر مشتمل تھی۔ صوبے میں آبادی کے منتشر ہونے کی شکل یکساں نہیں۔ ساحلی اور مرکزی علاقوں کے بہت سے ایسے مقامات ہیں جو مجموعی اعتبار سے اس صوبے کی 42% آبادی اقتصادی اعتبار سے فعال اور باقی ماندہ غیر فعال ہے۔ صوبے کی ہوا جو صحرائی نوعیت کی ہے نہایت گرم وخشک ہے اکثر زابل کی درجہ حرارت 53 ڈگری سنٹی گریڈ تک جا پہنچا ہے۔ ہنری فلیڈ لکھتے ہیں۔

سیستان کی آب وہوا بہت متغیر ومتنوع ہے صرف دو موسم ہوتے ہیں اس لئے کہ بہار وخزاں نہیں ہوتے۔ خرداد اور تیر ماہ (مئی، جون) نہایت گرم اور صبر آزما ہوتے ہیں۔

سیستان و بلوچستان کی ندیوں میں چند ہی ہوں گی جن میں سارا سال پانی جاری رہتا ہو۔ سیستان کی ندیاں سیلابی ندیوں سے عبارت ہیں مقامی اصطلاح میں (خاش ندی) فراندی یا رود بار ہیر مند (ہیلمند) سیستان و بلوچستان کی اکثر ندیوں کے نام علاقوں سے منسوب ہیں جیسے کہ بمپور، سرباز، کاجہ، گزوک، ہودیان، اوتک، شکید (ماشکیل) ریچ، نیک شہر گشت، میر جاوا وغیرہ ہیں۔

خلیجی ممالک:(Gulf States)

پنجگور کے نوجوانوں کی ایک اہم تعداد خلیجی ممالک میں روزگار اور کاروبار سے وابستہ ہے۔ ان ممالک میں متحدہ عرب امارات (U.A.E) بحرین، قطر اور خاص کر عمان اہم طور پر قابل ذکر ہیں جہاں سے اس علاقے کے عوام سالانہ لاکھوں کا زرمبادلہ کما کر ملک بھیجتے ہیں۔ وہاں پر محنت مزدوری کے علاوہ دیگر سرکاری و نیم سرکاری اداروں سے وابستہ ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پنجگور کی 20% معیشت کا دارومدار ان خلیجی ممالک سے ہے۔

ان ممالک میں سے عمان بہت اہم ہے کہ بلوچ کثیر تعداد میں اس کے آرمی میں کانسٹیبل سے لیکر میجر و دیگر پیشہ ورانہ عہدوں پر کئی دہائیوں سے خدمات انجام دیتے آرہے ہیں۔ ابتداء میں عمان آرمی کا 80% بلوچوں پر مشتمل تھا۔ بعض حالات کی وجہ سے بتدریج کم ہوتی گئی اور 1985 کے بعد مزید بھرتیوں کا سلسلہ تاہنوز بند ہے۔ ابتدائی زمانے سے خلیجی ممالک اپنی افرادی قوت کی ضروریات مکران ہی سے پوری کرتی رہی ہیں۔

2002ء کو حکومت عمان نے مزید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنی افواج میں شامل کرنے کیلئے مکران سے بھرتیوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کی۔ لیکن حکومتی اور سفارتی سطح پر اختلافات کی وجہ سے مزید بھرتیوں پر دوبارہ پابندی لگائی گئی۔ جس کے سبب تاہنوز بھرتی کا سلسلہ بند ہے۔ حکومت عمان مکران کے تینوں اضلاع پنجگور، کیچ اور گوادر سے بھرتی کرنے کا خواہاں رہا ہے جبکہ حکومت پاکستان ملک بھر سے بھرتی کرنے پر زور دیتی رہی تو حکومت عمان کے انکار پر یہ سلسلہ 2002ء کے بعد باقاعدہ طور پر معطل ہو چکی ہے۔

یاد رہے کہ ماضی قریب میں مکران کے معاشی وسماجی حالات میں تبدیلی کی ایک اہم وجہ نوجوانوں کی عمان آرمی سے وابستگی سے مظبوط ہوا۔لیکن بعد میں عمان ودیگر خلیجی مما لک میں روزگار کے ذرائع ناپید ہونے سے عوام کی معاشی حالات بتدریج غیر مستحکم وکمزور ہوتی رہی۔

مکران کے بلوچوں کا عرب دنیا سے کافی قدیم تہذیبی، ثقافتی وسماجی رشتہ صدیوں پر محیط ہے اور خاص کر عمان کے ساتھ دیرینہ ومضبوط رشتوں میں بندے ہوئے ہیں۔جس پر ایک مختصر سا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

عمان: (Oman)

عمان ریاست 1600 کلومیٹر کی وسیع ساحل کے ساتھ تیل پیدا کرنے والے خلیجی مما لک میں سے ایک اہم تجارتی مرکز ہے۔عمان کے ساتھ بلوچوں کا نہ صرف تجارت و روزگار کا رشتہ ہے بلکہ ایک قدیم وتاریخی پس منظر کا مظبوط ترین رشتہ موجود ہے۔جس پر جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔یہ 309500 رقبے پر مشتمل ایک سرسبز وشاداب خوبصورت علاقہ ہے جس کی آبادی 273462 نفوص پر مشتمل ہے۔آبادی کا %25 بلوچوں پر مشتمل ہے۔قومی زبان عربی اور سیکنڈ قومی زبان بلوچی ہے۔

تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب سولہویں صدی 1507ء میں پرتگیز تجارت و کاروبار کے غرض سے ہندوستان جانے کیلئے عمان کے ساحلی علاقے میں پہنچے تو آہستہ آہستہ ساحلی علاقے کو عیاری ومکاری سے اپنے قبضے وتسلط میں لے آئے۔عمان کی سب سے بڑی شہروں قریت، مسقط اور سحار پر مشتمل علاقوں پر اپنا قبضہ مضبوط ومستحکم کرنے میں کامیاب ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا عمان پرتگیزوں کے زیر عتاب آیا۔ان حالات میں عمان کے سلطان سخت دباؤ کے نتیجے میں اپنے چند سپاہیوں کے ہمراہ مکران روانہ ہوئیں۔ چاہبار (ایرانی بلوچستان کا ساحلی علاقہ) میں بلوچوں نے عمانی سلطان کا والہانہ استقبال اور بلوچی رسم وروایت کے مطابق خوب عزت واحترام دی اور شاہی مہمان کے طور پر رکھا۔

پرتگیزوں نے اپنے تسلط و قبضے کو مستحکم و مضبوط رکھنے کے لئے جنوبی افریقہ کے طرز پر وہاں بڑے بڑے (کلات) چبوترے تعمیر کی اور اب تک یہ کلات (قلعے) عمان کے مشہور علاقے مسقط اور مطرح میں موجود ہیں۔ جو بعد میں انکے نام بھی بلوچوں کے مشہور کمانڈر میرانی اور جلالی کے ناموں پر رکھے گئے اور تاریخی اعتبار سے یہ قلعے (کلات) تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ عمان کے سلطان امام سلطان بن سیف الیعربی بلوچوں کی مہمان نوازی و خاطرداری اور مہر دوستی سے کافی متاثر ہوئے اور خاص کر انکی جانبازی و بہادری کو بھی اچھی طرح سے بھانپ چکے تھے۔

وہ چند سال قیام کے بعد اپنی سلطنت کو پرتگیزوں سے آزاد کرانے کیلئے بلوچوں سے مدد طلب کرتی ہے۔ اسے غیور بلوچ بغیر چوں چراء کے لبیک کہہ کر قبضہ گیروں کے خلاف لڑنے کو اپنے لئے ایک بڑا اعزاز و فخر تصور کرتے ہیں۔ بلوچوں نے جنگی ساز و سامانوں سے لیس کشتیاں اور ایک جنگجوؤں کا بڑا قومی لشکر مکران کے ساحل کے ساتھ مسقط کیلئے روانہ کی۔ بلوچی لشکر امام سلطان بن سیف الیعربی کی سربراہی میں مسقط پر حملہ آور ہوئی۔ اس معرکے میں کامیابی کے بعد بلوچ لشکر نے پورے عمان کو پرتگیزوں کے قبضے سے آزاد کرایا اور پرتگیز 1650ء کو جنوبی افریقہ کی جانب بھاگنے پر مجبور ہوئے اس طرح ڈیڑھ سو سال تک پرتگیزی حاکمیت بلوچ جنگجوؤں کے جذبہ ولولے کے سامنے ملیامیٹ ہوا۔ امام سلطان بن سیف الیعربی دوبارہ شان و شوکت کے ساتھ حکمرانی پر براجمان ہوئے۔ امام نے پرتگیزی لشکر کو شکست فاش دینے پر بلوچوں کا شکریہ ادا کر کے اور انہیں ملک میں کافی عزت و احترام سے نوازا۔

پرتگیزوں کی تعمیر کردہ قلعوں پر بلوچوں کے کمانڈر جلال خان اور میران نے قبضہ کیا۔ اسی بناء پر اس تاریخی اہمیت کے حامل قلعوں کو میرانی اور جلالی کے ناموں سے منسوب کیا گیا ہے۔ بلوچ قوم نے ہمیشہ عمان سرزمین اور وطن کیلئے بیش بہا قربانیاں دی ہیں اور اسی طرح سترہویں صدی میں میر شہداد ایک بلوچی لشکر کے ساتھ جس میں چند مغروعی عرب بھی شامل

تھے جنوبی افریقہ کیلئے روانہ ہوا۔ جب وہ جنوبی افریقہ کے ساحلی علاقے ملنڈی اور ممباسا کو ایک بڑے معرکے کے بعد فتح تو کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اس جنگ میں ان کا بھائی میر احمد شہید ہو جاتے ہیں۔ یہ فتح کی خبر عمان میں جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔ تو امام سیف بن سلطان خود میر شہداد اور اسکے لشکر کو مبارکباد دینے کیلئے جنوبی افریقہ گئے۔ وہ اس فتح پر کافی خوش ہو جاتے ہیں اور انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہیں اور انہیں انگریزوں کی ظلم وستم و قبضہ گیریت سے ہمیشہ نجات دلانے پر عمان پہنچنے پر بلوچی لشکر کا پرتپاک استقبال کرتے ہیں۔ امام سیف بن سلطان میر شہداد سے اسقدر خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بہن کی شادی میر شہداد سے کرواتی ہیں۔ اس کے علاوہ جب جنوبی افریقہ میں مغروی عرب بغاوت پر اتر آئے تو بلوچوں نے سلطان کی جنوبی افریقہ میں گرفت وحکمرانی کو برقرار و مظبوط رکھنے کیلئے مشہور جنگ لڑی۔

اس کے علاوہ صلالہ کے جنگ میں کافی تعداد میں بلوچ مارے گئے اور آج تک وہاں ایک قبرستان (بلوچانی قبرستان) کے نام سے منسوب ہے۔

بلوچوں نے ابتداء سے لیکر آج تک عمان سرزمین کی حاکمیت خوشحالی و بقاء کے معرکوں میں کافی کلیدی رول ادا کی ہے۔ اگر بلوچ عمان کے حکمرانوں کے ساتھ نہ ہوتے تو آج عمان ایک الگ نقشہ پیش کرر ہا ہوتا۔

بلوچ عمان آرمی میں تکنیکی اور غیر تکنیکی اور دیگر اہم عہدوں کے ساتھ سلطان کے اہم باڈی گارڈ اور اسکوارڈ تک کے اہم اور کلیدی عہدوں پر ہیں۔ بعد میں بلوچ اس سوسائٹی میں اس قدر مرج ہوئے کہ ان کی شادیاں وہاں کے مقامی عربوں سے بھی ہوئیں۔ ایک اندازے کے مطابق وہاں کی آبادی 50% تک بلوچوں پر مشتمل ہے لیکن کئی صدیاں گزرنے کے بعد بعض اپنی رسم ورواج زبان وثقافت سے محروم ہو کر مرج ہوئے اور اب باقی 25% آبادی اپنی زبان، ثقافت ورسم ورواج برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ صلالہ د مطرہ بلوچوں کے اہم ومشہور علاقوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ایک زمانے میں جب عمان کے حکمران ایک بغاوت کے نتیجے مکران آئے تو انہیں گوادر کا علاقہ بطور مہمان دیا گیا اور بعد میں بلوچستان کا یہ ساحلی علاقہ 1950ء تک عمان حکومت کے پاس رہی اسی وجہ گوادر کے بہت سے لوگ عمانی نیشنلٹی رکھتے ہیں۔قدیم بلوچی شاعری میں بھی عمان کے خوبصورت وادیوں کا ذکر موجود ہے۔

مطرہ جاگاہ انت ھتلیانی ھلحل ءُ زریں مہلبیانی

نی چدءَ دیم ءَ انت کوٹ سیاہانی مشکت ءِ وشیں زید ستاہانی

ملا فاضل

اس تاریخی پس منظر میں بلوچ اور عمان کے حکمرانوں کے تاریخی رشتوں کا ذکر کرنے کا بنیادی مقصد مکران کے بلوچوں کا عمان کے ساتھ قدیم و مستحکم تاریخی ہم آہنگی کو اُجاگر کرنا ہے۔پنجگور کے آبادی کا ایک اہم زریعہ آمدن عمان سمیت تمام خلیجی مما لک میں محنت مزدوری و دیگر سرکاری و نیم سرکاری عہدوں پر ملازمت سے ہیں اور اب بھی 20% ذریعہ معاش خلیجی مما لک سے وابستہ ہے۔

کجھور،ناء،ہرماگ:(Hurmag):

اس علاقے کی اہم و مشہور جانی پہچانی پیداوار ہرماگ (کجھور) ہے۔ پیداوار کے ساتھ کجھور کے باغات کا حسین و خوبصورت و دلکش مناظر دل کولبھاتی ہیں۔پنجگور کے زرخیز زمینوں سے اعلیٰ قسم کے معیاری و مختلف قسم کے کھجور کی پیداوار ہوتی ہیں۔اس وقت دنیا میں پاکستان کھجور کے پیداوار کے لحاظ پانچویں نمبر پر ہے۔پاکستان کے علاوہ ایران،عراق،مصر اور سعودی عرب میں اعلیٰ اور مختلف اقسام کی کھجوریں کینڈا،آسٹریلیا اور برطانیہ کے علاوہ دیگر مما لک میں برآمد کیجاتی ہیں ۔ Export Promotion Buru کے مطابق پاکستان میں ہر سال 550000 ٹن کی مختلف اقسام کے کھجور پیدا ہوتے ہیں۔لیکن بد قسمتی سے کولڈ تیج اور پیکنگ کی سہولیات نہ ہونے سے زیادہ تر کھجور کی پیداور خراب و ضائع ہو جاتی ہیں ۔ان میں بلوچستان چار لاکھ اسی ہزار 480000 ٹن کھجوروں کی پیداوار میں

سرفہرست ہے۔کھجور کی پیداور کا 80% مکران کے مختلف علاقوں سے ہوتی ہے۔مکران اور خاص کر پنجگور کے علاقے میں کھجوروں کی اہمیت اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک یہ پیداوار درختوں پر ہیں۔انکی سب سے بڑی وجہ پیکنگ اور پروسسنگ کا نہ ہونا ہے۔

اس علاقے میں کھجور کی پیداوار جون سے شروع ہوکر جولائی کے مہینے تک پک کر تیار ہوجاتی ہے۔پنجگور کا آب وہوا اور موسم مکران کے دیگر علاقوں سے کافی مختلف ہے یہاں درمیانہ گرمی اور موسم سرما میں سخت سردی پڑتی ہے۔

دنیا بھر میں کھجور کی پیداوار محظ عرب اور بلوچ علاقوں میں ہوتی ہے۔اسی بناء پر کھجور کو بلوچوں اور عربوں کا پسندیدہ دوست تصور کیا جاتا ہے۔پنجگور میں اعلیٰ قسم کی کھجوریں پیدا ہوتی ہیں۔جن میں مزواتی، ہلینی، کہربا، ہارکی، زرد، سبزو، کلوت، ہشکینچ، جان سہر، شکری، ڈنڈاری، ربی، ریش کلونٹ وغیرہ۔

کھجور بلوچستان اور سندھ کے علاوہ ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی ایک خاص قسم کی کھجور بیکی کے نام سے پیدا ہوتی ہے۔دراصل ابتدائی طور پر کہ مکران میں کھجور کب اور کہاں سے آئی ہے۔۔۔۔؟اس حوالے سے تاریخی اور حتمی طور پر کچھ کہاں نہیں جاسکتا۔

لیکن یہ واضح ہے کہ بلوچ جہاں جس خطے میں ہجرت کرتے گئے وہاں کے آب وہوا کے مناسبت سے ممکن رہا تو کھجور کے درخت لگاتے گئے۔ڈیرہ اسماعیل خان کا علاقہ بھی کافی وقتوں تک بلوچوں کے زیرِحکمرانی میں رہی ہے اور آج تک کھجور کے باغات بلوچوں کے تاریخی علامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

زمیندار کھجور کے درخت کو زرخیز زمین کے اندر دس یا بارہ فٹ تک ایک دائرے میں رکھتا ہے۔عموماً یہ درخت تیسرے سال میں پیداوار شروع کردیتی ہے۔ایک اندازے کے مطابق یہ درخت لمبائی میں سو سے ایک سو پچاس فٹ تک لمبا ہوسکتا ہے۔ہمارے علاقے میں جان سہر نامی کھجور سب سے پہلے پیداوار شروع کرکے ہامین کے آمد کی علامات ونشانی دیتی ہے۔یہ مارچ اور ستمبر میں اگایا جاتا ہے۔تقریباً پچاس کے قریب مختلف ذائقہ دار

کھوروں کی اقسام مکران ڈویژن سے پیدا ہوتی ہیں۔لیکن پنجگور اپنی جوس بھری مزواتی کی وجہ سے کافی مشہور ہے۔

دراصل کھجور کا درخت ایک چھوٹے بیج سے ہوتا ہے جو ایک تنا ور لمبی درخت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ درخت دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک خود بخود معرض وجود میں والا اور دوسرا ایک نہال (گونگ) جسے دو سے تین فٹ تک زمین کے اندر گاڑھا جاتا ہے۔

کھجور کے باغات ہمارے علاقے کی خوبصورت وزیب زینت و پہچان تصور ہوتے ہیں۔ انہیں باقاعدہ ترتیب سے اگایا جاتا ہے جو بعد میں ایک خوبصورت و دلکش نما مناظر کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ یہ دلکش نظارے کو مغربی بلوچستان کے علاقے سرباز میں ایک دریاء کے آر پار دیکھا جاسکتا ہے۔اور اسی طرح مکران میں زعمران کے علاقے میں یہ نمونہ دل کو لبھاتی ہیں۔ کھجور کے درخت اس وقت خوبصورتی وزیبائی کا منظر پیش کرتا ہے جب اس پر رنگ برنگیں سرخ وزرد فصل نمودار ہو جاتی ہیں۔

گرم علاقوں میں درمیانی آب و ہوا میں فروری یا مارچ میں یا اسی مہینے کے آخری ہفتوں تک (پون) ناپختگی سے اور جولائی کے مہینے میں مختلف قسم کی رنگیں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں جب کہ واضح رہے کہ سرد علاقوں میں کھجور کے درخت نہیں ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات

یارجان بادینی: عمان ءِ بلوچانی تاریخ ءُ دود ءُ ربیدگ : بلوچی لبزانک حب صفحہ نمبر14-13 شمارہ جولائی2003

باب: سیزدہم

مذہب:Religion

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ اِس خطے میں ظہور اسلام سے کافی پہلے، بغور مشاہدات و تحقیق اور تاریخی مطالعے اور آثار اور کھنڈرات کی کھدائیوں وغیرہ و دیگر ایسے آثار کی نشاندہی و علامات سے اس علاقے کے لوگوں کی ہندومت اور زرتشتی مذاہب سے تعلق مکمل طور پور عیاں ہوجاتی ہیں۔ یہ خطہ جوکہ مذہبی حوالے سے بہت اہم تاریخ رکھتا ہےاور تاریخی طور پر محمد بن قاسم کے زمانے 712ء میں مکمل طور پر اسلام کے دائرے میں آیا۔ جس طرح یہ ذکر قدیم تاریخی کتابوں میں ملتا ہے کہ مکران کا دارالحکومت بنجور (پنجگور) تھا جس میں ایک بڑی مسجد تعمیر ہے۔ یہ اس تاریخی حقیقت کو بھی مکمل طور پر نمایاں کرتی ہے کہ یہ خطہ کس دور میں دائرہ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قدیم زمانے ہی میں مکران کا دارالحکومت پنجگور ہی تھا اور اس دور میں یہ خطہ مکمل طور پر دائرہ اسلام میں آیا تھا۔

چونکہ تمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ خطہ بلوچستان کے دیگر علاقوں کی نسبت سخت مذہبی رجحانات رکھتی ہے جبکہ 99% لوگ سنی مسلک سے تعلق کے باوجود ترقی پسندانہ سوچ رکھتے ہیں۔ اسی طرح ماضی سے حال تک پنجگور میں دینی خدمات و تبلیغ کی اشاعت میں بہت سے علماء مشائخ نے کلیدی کردار ادا کی ہے۔ مولوی رحمت اللہ پنجگوری اس علاقے کی اولین شخصیت تھے جو دیو بند سے وسیع دینی علوم کے زیور سے آراستہ ہوئے۔

انہوں نے اپنے دور میں اس علاقے کو جہالت و تاریکی سے نکالنے میں زبردست کردار ادا کی۔ انہوں نے دینی و مذہبی تعلیمات کے فروغ کے ساتھ ساتھ علاقے کے سیاسی و سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لی۔ وہ علاقے میں سنگین معاملات وخونی جھگڑوں اور قتل غارت گری و دیگر علاقائی معاملات کو شرعی و مذہبی نقطہ نگاہ سے حل کرانے کی بھرپور صلاحیت رکھنے والے مذہبی شخصیت تھے۔ وہ ایک غیر متنازعہ شخصیت و مدلل انسان تھے جو زندگی کے ہر شعبہ فکر کے لوگوں کیلئے قابل قبول و قابل احترام رہے۔

انہوں نے دیو بند (ہندوستان) سے فراغت کے بعد اپنے آبائی علاقے سے دینی درس وتدریس کے عمل میں مصروف ہوئے۔ان کی تعلیمات سے نہ صرف پنجگور بلکہ اردگرد کے تمام علاقے دینی علوم کے چراغ سے فیض یاب ہوتے گئے ہیں۔انہوں نے ابتدائی طور پر پنجگور کے علاقے سوردو کے مقام پر ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی۔اور چند ہی سالوں ان کی انتھک محنتوں کے نتیجے میں پنجگور کے تمام دیہی وشہری علاقوں میں دینی ادارے قائم ہوتے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پنجگور بلوچستان بھر میں علمی اور مذہبی سرگرمیوں کا مرکز ومنبع بنا۔انہوں نے مذہبی تعلیمات کے فروغ،عبادت گاہوں کی تعمیر وتزیین اور دیکھ بھال کے متعلق تمام امور کی موثر انداز میں نگرانی کی۔مولوی رحمت اللہ پنجگوری بنیادی طور پر سیاسی، مذہبی اور ایک باعلم اوصاف کے حامل شخصیت تھے۔انہوں نے اپنے مذہبی جماعت کو منظم و متحرک بنانے میں کافی جدوجہد کی۔وہ متعدد بار اپنی جماعت کے پلیٹ فارم سے پنجگور کے حلقے سے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیتے رہے۔لیکن انہیں کامیابی قومی اسمبلی ہی کے نشست سے حاصل ہوئی جب پنجگور خاران واشک پر مشتمل نیا حلقہ تشکیل ہوا تو اسی نشست پر شاندار کامیابی حاصل کی۔

وہ 2002ء کے جنرل الیکشن میں این اے 271 خاران واشک پنجگور کے رقبہ کے اعتبار سے وسیع حلقے میں ضعیف العمری میں کامیاب ہوئے۔لیکن زندگی تادیر وفا نہ کرسکی۔ وہ بحیثیت ایم این اے 2005 کو مختصر علالت کے بعد وفات ہوجاتے ہیں۔وہ حقیقی طور پر نہ صرف اس علاقے کیلئے بلکہ بلوچستان بھر میں ایک مسلمہ قوی جید اثاثے جانے جاتے ہیں۔وہ بلند پایہ کے عالم دین ومدبر و مذہبی رہنماء اور استاد تھے۔

چونکہ پنجگور کے لوگ مذہبی اعتبار سے بہت خداترس و دین دوست مانے جاتے ہیں۔پنجگور میں ہر سال تبلیغی اجتماعات ہوتے ہیں۔جس میں ملک بھر کے علاوہ ایران سے سنی مسلک سے تعلق رکھنے والے بلوچ بھرپور انداز میں شرکت کرتے ہیں۔اس مذہبی اجتماع کے دوران دونوں سرحدوں میں منقسم بلوچوں کو مذہبی رسومات کی ادائیگی اور اپنے

عزیز واقاربوں سے ملاقاتوں اور ملنے جلنے کے مواقع بھی ملتے ہیں اور اِس کے علاوہ اس دوران علاقے میں کافی حد تک تجارتی سرگرمیوں کو بھی فروغ ملتا ہے۔اب باقاعدہ طور پر دریاءرخشان سے منسلک علاقے میں ایک مستقل وجدیداجتماع گاہ تعمیر کیا گیا ہے۔

دوسری جانب علاقے کی ایک چھوٹی آبادی ذکری فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ پنجگور کے دورافتادہ علاقے یونین کونسل کیلکور سے گچک کے علاقے تک منتشر آبادی کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں پر گنجان آبادی میں بھی رہتے ہیں۔اس فرقے کا خاص مرکز ومنبع گچک اور کیلکور کے علاقے ہیں۔

تاریخی حوالے سے اخذ ہے کہ 1740ء میں نادرشاہ کے ساتھ جنگ کے زمانے تک لوگ ذکری فرقے سے ناواقف تھے۔ چونکہ ذکری نماز کے بجائے ذکر کرتے ہیں ان کی دواہم کتابیں،''سفرنامہ مہدی''اور''تردید مہدویت''ہیں۔اگران کتب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقے کی بنیاد ایک''محمد''لقب کے حامل بزگ نے رکھی تھی۔ان کا تعلق موضع داناپور ضلع جونپور،اترپردیش (بھارت) سے تھا۔وہ افغان یا سید تھا۔ جب انہوں نے فرقے کی بنیاد ڈالی تو اپنے آپ کو مہدی علیہ السلام سے تعبیر کیا۔ لوگوں کو یہ عمل پسند نہ آئی مجبوراً انہیں ملک چھوڑنا پڑا اپنے رفقاء کے ساتھ وہ گجرات بیکانیر جیسلمر ہوتے ہوئے سندھ پہنچے۔سندھ میں بھی زیادہ دیر رک نہ سکے تو قندھار کا سفراختیار کیا۔قندھار میں شاہ بیگ ارغون نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی وہاں بھی حالات تھوڑے دن میں بگڑ گئے تو پھر وادی ہلمند کا رخ کیا اور''فراخ''میں سکونت اختیار کی۔

تردید مہدویت کے مطابق انہوں نے دنیا فانی کو خیرباد کہا مگر مقامی ذکری روایتوں کے مطابق مکہ اور مدینہ شریف سے ہوتے ہوئے بغداد پہنچے پھر ایران سے''لار'' (لاراستان) ہوتے ہوئے بالآخر تربت آئے اور''کوہ مراد''پر قیام پذیر رہے۔اسی مقام پر دس سال تک اپنی تعلیمات کا پرچار کیا ان کے مطابق تمام مکران کو اپنا پیروکار بنایا۔لیکن اس بات کا تصدیق کہیں سے نہیں ہوسکی اور مشاہدات ومطالعے کی روشنی میں ثابت نہیں ہوسکتی۔

شہنشاہ اکبر کے نو(9) رتنوں میں سے ایک اہم رتن اور آئین اکبری کے مصنف ابوالفضل کے والد شیخ مبارک بھی ''مہدوی'' فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔مہدوی فرقے اور ان کے بانی کا ذکر ایک انگریز مصنف بلوک مین (Bluchman) نے اپنی کتاب ''ابوالفضل کی سوانح عمری'' میں کیا ہے۔

مصنف کے مطابق سید محمد جونپوری، سید محمد بدھا اویسی کے صاحبزادے تھے۔سید محمد کی تعلیم و تدریس اس زمانہ کے جید علماء کے زیر نگرانی ہوئی۔اپنے زمانے کے مشہور فقہا اور صوفیائے کرام سے رجوع کیا۔ بالآخر اپنے آپ کو مہدی سے تعبیر کیا اور قلیل عرصے میں ان کے گرد بہت پیروکار اکھٹے ہونے شروع ہو گئے جو ان سے کرامات اور معجزات منسوب کرتے تھے۔ بالآخر انہوں نے مہدوی فرقے کی بنیاد ڈالی۔ جونپور سے گجرات کا رخ کیا اور سلطان محمود کے منظور نظر ہو گئے۔ جب یہ ملک بھی ان پر تنگ ہو گیا تو انہوں نے ایران کی راہ لی اور ان کا سن پیدائش 1442ء بیان کیا جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع میں یہ مذہب کی بجائے ایک تحریک تھا جسے ہندوستان میں ''مہدوی'' تحریک کا نام دیا گیا اور پندرہویں صدی میں یہ اپنے عروج پر رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا زور کم ہوتا گیا۔

1628ء میں اس تحریک کا آخری دفعہ نام سنا گیا۔مکران میں یہی تحریک ایک فرقے کی شکل اختیار کر گئی جو ابھی تک قائم ہے۔ یہ کہنا کہ سید محمد یہاں آئے اور فرقے کی بنیاد رکھی در تحقیق طلب بات ہے۔ ممکن ہے ہم غلطی پر ہوں۔ ممکن ہے کہ سید محمد کے بجائے ان کے شاگردوں میں سے کسی نے اس فرقے کی بنیاد ڈالی ہو۔اور ان کے شاگرد کافی مشہور رہے ہیں۔ مثلاً عبداللہ نیازی، انکی وغیرہ البتہ یہ واضح ہے کہ مکران میں بلیدی حکومت کے زمانے سے یہ فرقہ یہاں رائج ہوا کیونکہ تاریخی حوالے سے کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ یہ فرقہ اس دور سے پہلے یہاں موجود تھا۔ ممکن ہے بوسعید جو سب سے پہلے بلیدی تھے۔ وہ وادی ہلمند میں فراح کے قریبی مقام گرمسل سے آئے ہوں اور یہ فرقہ انہیں کے ساتھ آیا ہو۔ تاریخی لحاظ سے یہ تقریباً وہی زمانہ ہے جب سید محمد ہندوستان کی خاک چھان کر فراح پہنچ چکے تھے۔ بلیدی دور حکومت میں یہ فرقہ مکران میں کافی پھولا پھلا۔ جب اٹھارویں صدی کے آغاز میں ملا مراد گچکی نے بلیدی دور اقتدار کا خاتمہ کر کے حکومت سنبھالی تو اس فرقے کو

مزید تقویت پہنچی۔ ملاّ مراد گچکی نے اس فرقے کو نئے خطوط پر استوار کیا۔ ذکری کیلنڈر کا آغاز کیا۔ زمینیں پیروکاروں میں تقسیم کی گئیں اور ان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ ملاّ مراد گچکی کی حتمی کوشش یہ رہی کہ یہ فرقہ مذہب کی شکل اختیار کر لے تاکہ حکومت کو مستحکم کرنے میں آسانی ہو۔ نصیر خان اوّل کے زمانے میں مکران پر چڑائی کی گئی جس سے ان کا زور کافی کم رہی۔ ذکری فرقے کے اہم عقائد کیا ہیں۔ انہیں بیان کئے دیتے ہیں۔

ذکر دو طرح کے ہیں۔ ''ذکر جلی'' یعنی ذکر جو زور سے کیا جائے اور ذکر ''خفی'' جو خاموشی سے کیا جائے، ذکر مختلف کلمات پر مبنی ہے اور رات دن میں پانچ دفعہ ان کا ورد فرض ہے، ذکر کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1۔ ہر ایک ذکر لا اِلہ اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ بذات خود یہ کلمہ خفی ہے گھر میں فجر کے وقت پندرہ، نو، تیرہ دفعہ کا ورد کرنا ضروری ہے۔

2۔ ''گور بام'' علی الصبح کے ذکر کو کہتے ہیں یہ ذکر سبحان اللہ لا یرجع پر مشتمل ہیں۔ یہ ذکر جلی ہے اور زور زور سے پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد سجدہ لازم ہے اور اس کے بعد ذکر خفی کیا جاتا ہے۔ یعنی ''لا اِلہ حسبی، ربی جل اللہ'' یہ ورد سجدہ میں کیا جاتا ہے۔

3۔ نیم روچ یعنی دوپہر کا ذکر جلی ہے اس میں عام ورد شامل ہوتے ہیں۔ ماسوائے ''سبحان اللہ، لا یرجع'' کے

4۔ روچ زرد یعنی دن میں پچھلے وقت کا ذکر جو تقریباً عصر کا وقت ہوتا ہے یہ ذکر جلی ہے اور حسبی ربی کے کلمات شامل ہوتے ہیں۔ اس میں سجدہ لازم نہیں ہے سجدہ سورج غروب ہونے کے وقت کیا جاتا ہے۔

5۔ سر شپ یعنی رات شروع ہونے کا ذکر ''جلی'' ہے جو تقریباً رات کے دس بجے کیا جاتا ہے۔ یہ با آواز کیا جاتا ہے۔ اس میں سارے ورد شامل ہوتے ہیں۔ سوائے ''سبحان اللہ، لا یرجع'' کے

6۔ ''نیم ھنگم'' آدھی رات کا ذکر یہ ذکر خفی ہے اور اسے انفرادی طور پر پڑھا جاتا ہے اس ذکر میں ''لا الہ'' ہزار دفعہ پڑھنا ضروری ہے۔ ذکر کی دوسری عبادت کشتی (چوگان) ہے جو کہ اجتماعی صورت میں کئے جاتے ہیں۔ اس میں مرد اور عورتیں سب ہی

شامل ہوتے ہیں۔ یہ عبادت خاص موقعوں کے علاوہ منت کے طور پر بھی اب اس روایت میں کافی کمی ہوئی ہے۔ خاص مواقع مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ کسی بھی اسلامی مہینے کی چودہ تاریخ کو اگر جمعہ پڑتا ہو تو رات کو چوگان (کشتی) کی عبادت کی جاتی ہے۔

2۔ ذالحجہ کی ابتدائی دس تاریخوں میں اور عیدالضحٰی کے دوسرے دن بھی کشتی ادا کی جاسکتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ اہم دن 9 ذالحجہ سمجھا جاتا ہے۔

3۔ شادی اور ختنہ کے مواقع پر بھی کشتی ادا کی جاسکتی ہے کشتی ادا کرنے کا طریقہ اس طرح ہے کہ مرد ایک دائرے میں عام بلوچی رقص کا آغاز کرتے ہیں۔ ایک یا کچھ خوش الحان عورتیں بیچ میں کھڑی ہو کر خدا ''مہدی'' کی تعریف میں گانا شروع کرتی ہیں۔ مرد چکر کاٹتے ہوئے اس گانے کو کورس کی شکل میں دہراتے جاتے ہیں۔ اس طرح مذید قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ ایک گانے کے بیچ میں وقفے وقفے سے کہا جاتا ہے۔ ''ہادیہ'' مرد جواب دیتے ہیں ''گل مہدیا'' ہادیہ کا مطلب قائد ہے اور ''گل مہدیا'' کا مطلب ''مہدی پھول'' کشتی اس وقت ختم ہوتی ہے۔ جب سب تھک کر چور ہو جاتے ہیں۔ اکثر گاؤں اور شہروں میں ذکر اور کشتی مرد اور عورتیں جداگانہ کرتے ہیں۔ مگر دیہات میں یہ عبادت ایک ساتھ کی جاتی ہے جو کہ اس جگہ کو ذکرانہ کہتے ہیں۔ عام طور پر ذکرانے کا رخ قبلہ کی سمت میں ہوتا۔ اس میں محراب نہیں ہوتی کسی بھی کمرے یا جگھی کو عبادت کیلئے مخصوص کردیا جاتا ہے یا میدان میں پتھر رکھ کر اس کی حد بندی کردی جاتی ہے۔ جنازے کی رسومات میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ جنازے کی نماز کی جگہ ذکر پڑھائی جاتی ہے۔ ذکری ملاؤں کا عام ذکریوں پر بڑا اثر ہے جو پرانے رسم و رواج قائم رکھنے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

حوالہ جات

- بلوچستان اضلاع اور تاریخ: ایم عثمان

باب: چہاردہم

دریاء (RIVER)

تاریخی طور پر پنجگور کا تذکرہ مستند تاریخی کتابوں اور حوالوں میں اپنی چھوٹی بڑی ندی نالوں اور نہروں سے بھی ہوا ہے۔ یہ چاروں طرف سے ندی نالوں، دریاؤں اور نہروں میں گِرا ایک خوبصورت وادی ہے۔ پنجگور کی وجہ تسمیات میں سے ایک پنج کور سے نمایاں ہوکر اس رائے کو تقویت دیتا ہے کہ یہ دریاؤں، ندی نالوں اور خاص کر پانچ نہروں کے حوالے سے تاریخی طور پر کتنا اہم رہا ہے۔ یاد رہے کہ پنجگور کے پانچ قدیم کاریزات میں چنداب بھی اپنے قدیم ناموں سے جانے جاتے ہیں۔

اس علاقے کی دریاؤں کا دارومدار بارانی پانیوں پر منحصر ہے۔ لیکن یہاں ایسا کوئی دریا نہیں جو سال بھر بہتا ہو۔ اسکی وجہ یہاں بارشوں کا کم ہونا ہی ہے۔ پنجگور کی سب سے بڑی اور لمبی دریاء دریائے رخشان ہے جس کی لمبائی 400 میل اور گہرائی 2 سے 8 فٹ، چوڑائی 263 میٹر سے 487 میٹر تک ہے۔

یہاں پر بڑی معاون دریاؤں اور ندی نالوں کے علاوہ دریاء رخشان کے بعد دریاء گوارگو اور گچک اس علاقے کی اہم ترین دریاؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ پنجگور میدانی اور پہاڑی سلسلوں میں گرا ایک وسیع علاقہ ہے جہاں کہیں پر بھی سطح زمین میں یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے۔ یہ علاقہ اپنی زرخیز زمینوں اور معتدل آب و ہوا کی مناسبت سے اہم زرعی پیداوار کے طور پر بھی بہت مشہور ہے۔ دریاء رخشان اور گوارگو کے کنارے کم اونچائی سے واقع ہیں جس سے بہ آسانی بندھ باندھ کر کاشتکاری کے عمل کو فروغ دیا جاتا ہے۔ ان اہم ترین دریاؤں میں سے دریاء رخشان اور گوارگو مشرق سے سے مغربی سمت میں اور دریاء گچک مغرب سے مشرقی سمت کی جانب بہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس علاقے کی ندی نالے، نہریں اور دریائیں آب و ہوا کی تغیر و تبدیلی کیلئے بہت اہم ہیں۔

دریائے رخشان: (Rakshan River):

پنجگور دو تہذیبوں کے سنگم پر واقع ہے اسی بناء پر پنجگور کا دوسرا عمومی اسم رخشان بھی ہے جسے قدیم زمانے سے وادی رخشان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نام بلوچستان کے وسیع وعریض طویل دریائے رخشان کے نام پر منسوب ہے۔ جو کہ مختلف پہاڑی اور میدانی علاقوں کے چھوٹے بڑے دریاؤں کے سنگم پر واقع ہے۔ پنجگور میں دریائے رخشان زراعت کا سب سے بڑا منبع اور ذریعہ بھی ہے۔

یہ دریاء سلسلہ کوہ سیاہان سے نکل کر پنجگور کے زرخیز زمینوں کو آباد کرتی ہے۔ اس دریاء کی لمبائی تقریباً چار سو کلومیٹر طویل ہے۔ یہ ضلع واشک کے علاقے ناگ سرچشمہ کے مقام سے مختلف چھوٹی بڑی معاون دریاؤں کو مختلف مقامات پر ساتھ ملا کر پنجگور کے دیہی اور شہری علاقوں کو آباد کرتی ہیں۔

چپی لوپ سرچشمہ (ناگ) دریاء رخشان میں شامل ہونا والا پہلا معاون دریاء ہے۔ مزید دریاؤں میں سورانی، زہرگاں اور میانی جو بہت اہم ہیں۔ دریاء نگنداپ اور کاسگ یہ دونوں دریائیں کرکی کے مقام پر دریاء رخشان میں شامل ہوتے ہیں۔ ڈبگ اور پتکن ضلع واشک کی آخری دہانے کی دریائیں ہیں جو کہ رخشان میں آ کر شامل ہوتے ہیں۔

دریاء رخشان مختلف مقامات پر تین حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ شمال میں یونین کونسل کلگ کے مقام گراوگ و مغرب میں سردارِ آشتگ، جنوب میں یونین کونسل بونستان کے علاقے نیام آشتگ کے مقام پر تقسیم ہو کر بعد میں یہ منقسم شاخیں سہر چیل سور آپ کے علاقے بن جاہی کے مقام پر آ کر ملتے ہیں۔ دریاء رخشان کا آخری سرا ایران کے ساتھ واقع مشہور دریاء ماشکیل میں آ کر شامل ہوتا ہے۔

پنجگور کے مشرق میں سبز آپ پہلا علاقہ ہے کہ جن کی دریاء سبز آپ دریاء رخشان میں شامل ہونے والا پہلا معاون دریا ہے۔

دریاء رخشان ایک طویل اور لمبی دریاؤں میں سے ہیں جو بلوچستان کے دیگر دریاؤں کی طرح سال بھر نہیں بہتی بلکہ یہ دریاء بھی بارشوں کی مرہون منت ہے۔ اس دریاء کا پہلا

سراناگ واشک سے ہوتا ہوا مختلف دریاؤں کو ساتھ ملا کر آخر میں ایران کے سرحد کے ساتھ واقع دریاء ماشکیل میں آ کر شامل ہو جاتی ہے۔

دریاء گچک:(Gichk River):

وادی گچک کے نام سے منسوب یہ دریاء پنجگور کے دیگر دریاؤں کی نسبت کافی مختلف ہے۔اس طویل دریاء میں سال میں کم بیش دیگر دریاؤں کی نسبت زیادہ پانی ہوتی ہے۔جس کی جہ سے دریاء کے اردگرد کافی گھنے سرسبز وشاداب جنگلات ہوتے ہیں۔اس دریاء میں نایاب واعلیٰ قسم کے مختلف انواع کے مچھلیاں وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔اس دریاء کی چوڑائی تقریباً 54 میٹر اور گہرائی 15 سے 20 فٹ تک ہے۔یہ مشہور دریاء گچک کے علاقہ سرگوز سے چھوٹی بڑی ندی نالوں اور دریاؤں کو مختلف مقامات سے ملا کر تنک کے مقام پر دریائے مشکے کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔یہ دریاء زرعی مقاصد کیلئے کم ہی کارآمد ہوتی ہے جبکہ اس دریا کے اوپر گچک (کلری) کے مقام پر ایک ڈیم تعمیر کی گئی ہے۔جو ایک وسیع و پختہ نالے سے حسین جو کے مقام پر زرعی آبادی کرتی ہے۔

دریاء گوارگو:(Gwargo River):

دریاء گوارگو وادی پنجگور کی اہم ترین اور طویل دریاؤں میں شمار ہوتی ہے۔دریاء گر، سیدان اور کاٹاگری سمیت گوارگو کے پہاڑی سلسلوں سے آنے والے تمام چھوٹی بڑی ندی نالوں اور دریائیں دریاء گوارگو میں شامل ہوتے ہیں۔آخر میں یہ دریاء سہرچیل کے مقام پہ دریاء رخشان میں شامل ہوتی ہے۔

باب: پازدہم

جنگلات(FORESTS)

یہ خطہ قدیم عہد سے ایک ایسا خطہ زمین ہے جس کے وسیع دامن میں وافر مقدار میں مختلف انواع کے درخت، حیوانات ،جنگلی جانوروں کے علاوہ قیمتی اور نایاب جڑی بوٹیاں میدانی اور پہاڑی دامنوں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ جب کہ بلوچستان میں کہیں پر بھی مجموعی طور پر گھنے اور پھیلے ہوئے جنگلات نہیں۔اور یوں یہاں کے جنگلات بھی میدانی اور پہاڑی علاقوں میں پھیلے ہوئے مختلف اقسام کے جنگلات پر مبنی ہیں۔ یہاں پر بارشوں کی کمی سے یہ علاقہ ایسے جنگلات پر مشتمل ہے جو کم پانی والے جنگلات اور خود رو افزائش والی مختلف انواع کے ہیں۔ یہاں سارا سال بعض ریجن میں دلکش جنگلات علاقے کے خوبصورتی کے باعث بھی ہوتے ہیں اور ساتھ ہی انسانی ضروریات زندگی کیلئے بھی کارآمد تے ہیں۔ یہاں کے جنگلات کا ستر فیصد حصہ خودرو پیش (مزری) پر مشتمل ہے۔ مزری خوبصورتی کے علاوہ اس سے بننے والے دستکاری مثلاً چٹائی، گور پات، چلّی وغیرہ جو بلوچی ثقافت کے اہم حصے بھی جانے جاتے ہیں تیار ہوتے ہیں۔

بلوچستان رقبے کے اعتبار سے ملک کا نصف حصّہ ہے۔ چونکہ اس علاقے کے پہاڑی اور میدانی علاقوں میں نایاب وقیمتی پرندے بھی پائے جاتے ہیں۔ پنجگور کا علاقہ اپنے وسیع جنگلات کے اعتبار سے ایک بڑا علاقہ تصور ہوتا ہے۔جس میں مختلف قسم کے جنگلی حیات پائے جاتے ہیں۔جبکہ ان میں سے بعض ناپید اور نایاب ہو چکے ہیں۔

سیاہان رینج:۔ یہ سلسلہ کوہ 260 میٹر لمبا ہے۔ جو کہ ضلع خاران اور پنجگور میں واقع ہے۔ اس کے دامن میں ایک وسیع جنگلات خودرو حیات پر مشتمل ہے۔

سنٹرل مکران:۔ یہ سلسلہ کوہستان پنجگور اور تربت کے علاقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ جو ایک وسیع علاقے پر پھیلا ہوا مختلف جنگلات پر مشتمل ہے۔

کچک سکن:۔ یہ سلسلہ مشکے کے علاقے سکن اور پشتکو سے گوارگو اور کیلکو رتک پھیلا ہوا

ہے۔ یہ ایک خوبصورت پہاڑی سلسلوں، میدانوں اور دلکش چشموں پر مشتمل ہے۔ اور دُراسکی کے پہاڑی سلسلہ میں دریاء کی چھوٹی بڑی دریائیں گچک دریا اور راغے کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ عام طور پر اس مقام کو اوار (Awar) کہا جاتا ہے۔ جس کے بلوچی میں معنی ہے ملنا۔

ان علاقوں کے دریاؤں میں کافی مقدار میں مختلف انواع کے مچھلیاں اور آبی پرندے پائے جاتے ہیں۔ موسم سرما میں آزربائیجان روس سے آنے والے پرندے چرز (تلور) و دیگر قسم کے پرندے بھی آتے ہیں۔ علاقے میں عرب شہنشاہ شیوخ ہر سال شکار کیلئے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ سمسو، آبی مرگ دراج گردن اور کئی قسم کے پرندے اس علاقے کو حسین اور خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ گچک کے علاقے کی ایک جنگلات میں سے کہور (برگد) خاص طور پر پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ جنگلات بھی پرندوں اور حیوانات کے ساتھ تیزی سے ختم ہوتی جارہی ہے۔ ان گھنے اور سرسبز جنگلات بڑی مقدار میں دُرچک (غلہّ وار) کپوت، سلیمان و دیگر پرندے بھی پائے جاتے ہیں۔

بالگتری کپ:

یہ علاقہ بھی اسی دریاء کے نام سے منسوب ہے جسے بالگتر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دریاء لشکراں سمیت دیگر دریاؤں کو ساتھ مل کر کیچ کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ علاقہ پنجگور کو ضلع تربت سے ملانے والا ایک خوبصورت وادی ہے۔ اس پورے میدانی علاقے میں کہیں پر بھی کسی قسم کی جنگلات نہیں یہ ایک خشک و بے آب و گیاہان میدانی علاقہ ہے۔

یہ میدانی علاقہ پنجگور سے تقریباً 150 کلومیٹر دور یونین کونسل کیلکور میں واقع ہے۔ 5 مربع کلومیٹر پر محیط ضلع پنجگور کو تربت سے ملانے والا وسیع میدانی پٹی ہے۔ چونکہ بلوچی زبان میں کپ کے معنی میدان کے ہیں۔

پرومی کپ:

پرومی کپ ایک وسیع میدانی علاقے پر محیط ہے۔ تقریباً یہ پنجگور سے 80 کلومیٹر دور یونین کونسل پروم میں واقع ہے۔ لیکن ان میدانی علاقوں میں پانی ناپید اور جنگلات اور جنگلی حیات موجود نہیں۔ اکثر بارشوں کے دوران ناقابل سفر رہتی ہے۔

نباتات:(Nabatat)

یہ خطہ زمین جڑی بوٹیوں کے حوالے سے کافی منفرد مقام رکھتا ہے۔اس علاقے میں پائے جانے والے جڑی بوٹیوں کو ماضی قریب میں مختلف بیماریوں کے علاج ومعالجے کیلئے اہم ادوایات کے طور استعمال کیا جاتا رہا ہے۔اوراب تک بہت سی ایسی بیماریاں سائنسی اور میڈیکل کی جانب سے لاعلاج یا پیچیدہ قرار پانے پر یہ جڑی بوٹیوں والے ادویات کومفید قرار دیا جاتا ہے۔ایشرک، کلمپر ،ازگنداور بوئے مادران وغیرہ اہم اور پیچیدہ بیماریوں کے علاج کیلئے کافی مشہور ہیں۔اِس کے علاوہ لاتعداد جڑی بوٹیاں ملتی ہیں جو دوا سازی میں مستعمل ہیں جن سے قدیم زمانے سے لوگ علاج کے لئے اہم جانتے ہیں۔

پنیر باد، گواتک، ھچک اور دانچک وغیرہ کچھ جھاڑیاں اور جڑی بوٹیاں مخصوص امراض کیلئے دوا کے طور پر استعمال ہوتی ہیں ایسے عوارض کوان جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں۔

پترونک:(Putrunk)

پترونک موسمی بارشوں کی مرہون منت پہاڑی اور میدانی علاقوں میں پائے جانے والا ایک اہم ذائقہ دار اور پھول دار پودا ہے۔ جسے مقامی زبان میں پترونک کہتے ہیں۔اور یہ پودا صرف اور صرف پنجگور کے حدود میں پایا جاتا ہے۔ یہ خودرو پودا جنوری اور فروری میں بارش ہونے کی صورت میں ایک ہفتے تک زمین سے نکل آتی ہے۔ جو بعد میں ایک مہینے کے اندر ختم ہو جاتا ہے اور اپنے اوپر خوبصورت پھول کی وجہ سے پنجگور کے وادیوں کو خوبصورت ودلکش بناتا ہے۔

پنجگور میں ہامین کے بعد پترنک دوسرا علاقائی سرگرمی ہے۔ جو لوگوں کو سیر وتفریح کیلئے پنجگور کے وادیوں کی جانب متوجہ کرتی ہے۔اس موسم میں پنجگور کے پہاڑی دامن سر سبز وشاداب اور خوبصورت ہوجاتے ہیں۔

پترونک پنجگور کے حدود سے تقریباً 20 کلومیٹر دور کے پہاڑیوں اور جنگلات میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر میدانوں اور خاص کر پہاڑی دامنوں میں اگتا ہے۔یہ زمین کی سطح سے تقریباً2 سے 5انچ تک اوپر آتی ہے۔ یہ زمین سے نکلنی والی ڈنڈی پر دو یا دو سے زیادہ سبز پتوں پر مشمل ہوتا ہے۔اور پختہ ہونے کے عمل کے بعد مزید ڈنڈی

لمبی ہوکر چپٹی ہوئی پتوں کے اوپری سطح پر خوبصورت ورنگین پھول نمودار ہو جاتی ہیں۔ پھول کے نمودار ہونے پر ذائقہ ولذت باقی نہیں رہتی اور جلد ہی خشک ہو جاتا ہے۔ یہ رنگت میں زمین کے ساتھ وہی رنگ اختیار کر دیتا ہے۔ اسکے بیج کو کھانے کے طور پر بھی کھایا جاتا ہے۔ یہ ذائقے میں صلاد جیسی ہوتی ہے۔ جس میں مختلف قسم کے سبزی نما خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ جو صحت کیلئے بھی کافی مفید ہے۔ یہ قدرتی طور پر پنجگور ہی کے وادیوں میں پایا جاتا ہے۔

پتر ونک کو عام استعمال کے علاوہ کھانے کے طور پر بھی پکھا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس موسم میں پتر ونک کے ساتھ عام کھانے کی سبزیاں پہاڑی وادیوں کو سرسبز وشاداب بناتی ہیں۔ ان موسم میں لمبیک، گر بُسک، چپشگ، ہالکو و دیگر خودرو پودے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

کہور:(Kahur):

یہ ایک کانٹے دار اور مرطوب آب وہوا میں بڑھنے والا درخت ہے۔ چھوٹے چھوٹے پتے، ٹیڑھا تنا اس کی لکڑی سخت اور لچکدار ہوتی ہے۔ اس کے ریشے سے دستی چھڑیاں اور دوسری دستکاریاں بنائی جاتی ہیں۔ یا ورچی خانوں میں مستعمل بہت سی چیزیں اس سے بناتے ہیں۔ اس کی بلندی بعض مقامات پر ۱۲ میٹر اور وزن پانی سے زیادہ ہوتا ہے اس کے پتے اونٹوں کے چارے کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ اونٹ اسے شوق سے کھاتے ہے۔

گز (لٹی)(Gaz):

گز بلوچستان کے کئی علاقوں میں اگتے ہیں۔ بلوچستان کے جنگلی درختوں میں اس کی مقدار سب سے زیادہ ہے۔ گز کے پتوں کو اگر چھ ماہ تک زمین میں دبا کر رکھا جائے تو اس سے زرعی کھاد کی ایک بہترین قسم تیار ہوگی۔ پنجگور میں اسے زیادہ زرعی مقاصد کے ساتھ ساتھ ایندھن کی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

داز (مزری)(Daaz):

یہ تزئین وآرائش میں مستعمل ایک کھجور نما خوبصورت درخت ہے۔ سارا سال

سرسبز رہتا ہے۔اس کی بلندی ۲/۳ سے تین میٹر تک ہوتی ہے۔اس کے پتوں سے دستکاری کے قابل دید چیزیں بنائی جاتی ہے۔

جوان تاک (Juwan Tak):

اس درخت کے پتے اونٹوں کے چارہ کے طور پر کام میں لائے جاتے ہیں اس کی لکڑی جلنے میں دھواں کم دیتی ہے اور حرارت زیادہ دوسرے درختوں کی مناسبت سے یہ کمیاب ہے۔

چش (Chish):

اس درخت کا مضبوط تنا ٹہنیوں اور پتوں سے بھرا ہوتا ہے۔یہ صرف پنجگور کے مخصوص ومحدود منطقے میں پیدا ہوتا ہے۔اس کے پتے بھی چارہ کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔

کرک (آک) (Kark):

اس کی جھاڑی کی بلندی بہت زیادہ نہیں ہوتی۔اس کے پتے آم کے پتوں سے مشابہہ ہوتے ہیں۔لکڑی لچکدار اور شیرے سے بھرا ہوتی ہے۔اس کے پتوں سے زرعی اراضیات کے آس پاس چھپر بناتے ہیں۔لیکن اب یہ روز بروز ناپید ہوتا جارہا ہے۔

ھت (Hath):

پہاڑوں میں اگتا ہے۔اس کا مظبوط تنا فرنیچر بنانے کے کام آتا ہے۔اس کی مقدار بہت ہی کم ہے اور اس پر پھل نہیں لگتے۔ساگ پات وغیرہ جو یہاں اگتے ہیں مقامی ناموں سے درج کئے جاتے ہیں۔زیرہ کوہی، پیملوک، مگیر، پتر ونک، کرگوشک یہ پکا کر کھانے کے کام آتے ہیں۔

حوالہ جات

سیستان وبلوچستان :ناصر حسین عسکری

بلوچستان میں جنگلی حیات: گل محمد ساتکزئی بلوچ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان صفحہ 33 شمارہ جون 2001

چند منتخب بلوچی اشعار

نوروز خان وگاجیان

جنگی شعر

من مدام الحمد اللہ الذی یات کنیں
سیہ الکونیں ءِ نام ءَ من مناجات کنیں

رست بودت بہ تھت ءِ خاران نوروزخان چو نادر ءَ
زند پیر ءِ دعاۓ گون انت تاکہ روز ءِ محشر ءَ

تو چلور سامان کن بیار سیاھکاریں گروھبر ءَ
سنج ئےِ پر کرتاں عراقی ڈال ءَ سھریں اندر ءَ

فوج ئےِ مچ کرتاں ھزاری دیم پہ پنجگور یکبر ءَ
یک شپے نشتگ بہ واشک سیل ئےِ کرتگ دفتر ءَ

کشتگ اش اللہ ملوک ءَ ھون پر انت منی آخر ءَ
رپتگ ئےِ دشت پروم ءَ آشپ ءَ اڑ کتہ

ھال ئےِ دیم دات گاجیان ءِ منی تئی ھلکہ جتہ
گشتگ ات اللہ ملوکیں بہ منی دیمءَ در ءَ

لشکر ءُ فوج ءِ سر ءَ بوت دیم بہ ھونیاں شتہ
اے شپ ءَ شبگیر جنان بوت ھونیاں وارتگ خطا

ھلکوان ءَ شتر گوازیں ایت دَستک اڑے کتہ
نوروزخان لشکر ءَ بست شگرے پٹ ءِ سر ءَ

گُشنگ نوروزخان سکی ءَ لشکر ءُ توپے ءَ درآھتہ
تچک کرتگ گوری آلکگ. باز شہ گور ءَ

ایجاڑی ءُ ھوتکاڑی است انت پیشی دفتر ءَ
شاباش انت رخشانیان ءَ جنگ اش کرت انت دفتری

جنگ نوروز ءِ پلٹن ءَ کت غازیان ءَ آفریں
بھت ءَ نوروز چو نادر ءَ بوت دُشمن یے جستاں آخری

گچکی ءَ گوں نوشیروانی ءَ نہ کرتہ انچیں کار
یاکن ات سوبے مروچی یا بیت نوں تار تار

گوں وت اش گشت ءُ صلاح کت بیا کناں توپ ءَ سوار
تیر اش مان نہ کرت انت صاجبی داروان کرتہ توار

پیش وارتان ماں ڈگار ءَ ھچ نہ کرت آواں شکار
پچک اش دور داتان ھمد ءَ دورنت مئے ساہ ءُ جان

کپتگ انت پیشی ھیالے جن بدئیت وتی گدان
ملک ءُ مال اش کرتاں دست ءَ ھچ مکند انت پچ ءُ نان

گشت غلام محمد گوں براساں کشتوں شیریں گاجیاں
لاشہ ءَ شیریں مُلوک ءِ شما بدئیت ازریں مناں

باھوٹ ءِ وڈالی

" شے سرا شست شا سرا پنجا
ڈُرس ھمے باکاڑ ءَ گُت اَنت یجّا "
ما ھما زِبریں بولک ءِ زاتن
کارپداں سسا بیار مرا پجّا
ندر کتگ سر پہ شائگاں زندے
بے نپیں بود پہ بوہری لجّا
ھون شہیدانی گار نہ بیت شالہ
سوب مڑایانی پہ کلہ وجّا
نُگریں سہت چست کنت گوناپ
آچش ءِ زِراب و موش زِر ءِ گجّا
وشّ نیاتکانی دوبہاں درشم
بزر نہ کنت ماد سانکل ءِ کجّا

یہ شعر پنجگور میں رونما ہونے والی اس تاریخی جنگ کے متعلق ہے جو باھوٹ پر لڑی گئی ہے۔

(عنبر پنجگوری......سنگر ءِ ساھگ)

ملاعزت پنجگوری

(1)

هر روچ منی سر گوں غماں
دل گوں مقیمی وسوساں
گوں قادر ءَ پریات کنت
نعت ء رسول آخر زمان
سد تحفہ ءُ سلوت کنت
بیا اِت منی بیل ءُ یلاں
منی زرد حدیثی یات کنت
من چانکہ دیستگ ہتلی
بے صبر ءُ بے آرام کنت
اندو ءُ ہوپاں دل منی
لال گوں غماں آزات کنت
چو تتسگگیں پروانگاں
دل بلبلی پریات کنت
بدر ءُ منیریں دلبربا
جان گوں گہاراں داب کنت
ہپتاد کمان میانیں جناں
مثل ء ڈیہے گلزار کنت

روت پہ تچوکیں چمگے
بیکاں پری زات پہک کنت
روچ چہ کبنداں اړے بیت
چینگو من ءُ چانگو پری
کبگی رواجاں کرام کنت
سیب ءُ صنوبر دلبر ءِ
گل گنچھاں بے وار کنت
مسک ءُ دن ءُ آتار کنت
زمزیل رچوکیں ماپراں
لال اِش کہیی تاب کنت
بروان امل ءِ پہ سپاہ
چو نوک سریں ماہان کنت
آسکی خماریں دیدگاں
عاشق کش ءُ ہونوار کنت
پونزئےِ گوں لاہوری کجاں
سبز ءِ پہ رنگے مان کنت
لال ءِ لباں مرواړداں
مثل ء ھقیقاں رنگ کنت
توتی شکر ہاریں زبان

دُرج ءُ تلاہاں گُوانک کنت
ماں نیم گوراں دُریں پری
بازار ءُ ہند ءُ لار کنت
دست گوں تلاہیں سنگہاں
لال ءُ جز ءُ انوار کنت
پاد گوں دو کبلیں بلبلاں
نودی کماں میان گُرند کنت
کس دلبر ءِ پیم ءَ نہ انت
بلّے منی جان ءَ کار کنت
فرہاد ءُ شہر گشت مناں
مئیر جان وت ءَ شیرین کنت
زردوں چو مجنون ءِ غماں
مئیر جان وت ءَ لیلےٰ کنت
عزت بہ نال چو بلبلی
گوں نالگاں گل رحم کنت
بے تاگتیں دردے منی
چو کودکاں پریات کنت
بے صبر ءُ بے آرامیں دلے
دلبر من ءَ را وار کنت

(2)

من نازیناں مہرک ءَ
من چنڈیناں مہرک ءَ
بُرز کلاتانی بانک ءَ
مہرجان گل ءِ برے
نشتہ ماں جو سرے
رندیت مھپراں
مسک ءُ گوں زاپراں
وئے وئے پہ مہرک ءَ
برز کلاتانی بانک ءَ
سر ءَ شودیت ساپ کنت
دل مارا آپ کنت
نازیناں مہرک ءَ
چنڈیناں مہرک ءَ
برز کلاتانی بانک ءَ
وتی کل ءَ در کپیت
چو آسی پُل ءَ سر بیت
نازیناں مہرک ءَ
چنڈیناں مہرک ءَ
برز کلاتانی بانک ءَ
شنکوں پہ مہرک ءَ
نہ کرزاں من مہرک ءَ
نازیناں مہرک ءَ
چنڈیناں مہرک ءَ
برز کلاتانی بانک ءَ

(3)

کل ءِ کسانکیں پری
شمس ءُ قمر ھتل گْوری
بام ئے ءُ زریں مشتری
مروارد ءِ دانگ زری
منی تلی تلانی تلملی
باگانی تریں آسمی
بوہ کیگد ءِ مِسک ءُ زری
برت ئےِ قرار ءَ دل منی
مہرنگ نہ کنت گوں ھمسری
منی بالاد گلام اِنت آسری
چینی گلء گلزار، تو
بوس از دپ ءُ رخسارء تو
یک گْرمچہ یے از باگء تو
ھمزان نشیں ھم داگء تو
کُشت ئے صنم ناحق من ءَ
پسند تریں زیباء من
ھنجر زدی بر جانء من
ھون ھم دلء افشانء من

اے دوستء من دوستدارء من
عرضے کنم اے نورء من
گویم چراگء پیشء من
بیا یک شپے مہمانء من
پر جان ءُ دل قربان کنم
جاہء تو در چمان کنم
دوشی کہ من وش واب اِتاں
واب ءَ گشئے آگاہ اِتاں
گوں مئیرک ءَ یکجاہ اِتاں
واب ءَ کہ دیستگ من ترا
گنداں تلاہیں دلبر ءَ
پاساں اِے پُل ءَ بوہ چناں
جھل از دل ءِ بند ءِ جناں
برز ءَ پہ ھر دو دیدگاں
واب ءَ کہ سار بیت من ءَ
من وَ ، کج ءُ لیلیٰ کجا ؟
من ھم جدائیں ھلکہ یے
دلبر دگہ ڈیہہ ءُ دہے
ھیہات ءُ لمحات ءُ عدو

گل چہ گلستان شر ترو
ستک انت منی جان ءُ جگر
دنیا بہ بیت زیر ءُ زبر
من کہ نزانت میئر جان مریت
عزت پہے روچاں زریت
بژن اِنت من ءَ دوست ءِ مرگ
جانی ءِ بے عیبیں روگ
ھر چند چاراں من دل ءَ
گُہت اِنت من ءَ داں محشر ءَ
زاناں کہ واست ات قادر ءَ

☆

محمد حسین عنقا

(1)

تئ دیدگ ءِ خمار ءَ کتگ دل دو کپ پدا
پٹینتہ چش کہ دیدگ ءَ ھون ءِ دو لپ پدا

پر تو تہ پُلے ات کہ جتے راستیں ماں مٹ
پر من تہ داگے اَت کہ کُتے نوک ٹپ پدا

ءُ ٹاھینتگ چہ جنت ءِ شہد ءُ شراب ءُ شیر
کٹیں قیامت ءَ ، ءُ بہ بی دپ ماں دپ پدا

تئ روچ آئی ءَ چہ ترساں تچان شپ
مئے روچ آکہ آئی ءِ گردیت شپ پدا

پیش ءَ مڑگ زمانہ ءِ زرے گوں چپیں چول
اَشکامی ءِ ماں بوجی ءَ گوں دوست گپ پدا

نزیک ھرچی بیت اگر تئ مراد ءِ پند
ھوش ءَ بکن گوں راہ کہ مروئے پہ چپ پدا

عنقا ءَ کیزالگ ءَ نام ءِ سسا کتگ
درمان ءُ برات پیشی ءُ جی جان ماں تپ پدا

(2)

مکن تو روک منی زرد ءِ کہنیں داگاناں
مدئے تو آس ھمے مُرتگیں چراگاناں

نہ چو جتائی ءِ آسیب ءِ سیاہ مار ءَ جتگ
بکنت ھُب دل ءِ بُلبل سیاھی راگاناں

گروک جنت ، درا بنت راہ تاموریں
امان چہ نپت کہ سوچیت سوزیں باگاناں

زکات کافر ءِ زر ءِ نہ بیت بیاچے بیت
مزان زھرگ ءِ مہرگ ھمے زُرا گاناں

کدی محبت ءِ آوشیں پاس کیت کیت پہ من
پریشتگ ءَ چہ پُلاں من نصیب ءِ واگاناں

چشیں زمانہ یے آیاں بلوچی دنیا ءَ
گشان کناں رواں ، ٹیڑیں پاگاناں

چرائی ءَ غزل ءِ داداں ءِ طلب عنقا
پہ پرکے نیست پرے کگو ءُ کلاگاناں

وش وقت نہ بیت هنئو وسر

عبدالحق حقانی

نام خالق ءَ یکتائیں — گپے گشتگوں دلواهیں
پنتے کامل ءُ زیبائیں — شخصاں کہ دل اِش آگاهیں
باطن طالع انت مردانی — قانود انت نیکو کردانی
وشرو ءُ گشاد بختانی — است انت حوصلہ سهتانی
مرداں گوش کن اِت سوج ءُ سر — پنتے دنت ترا پیغمبر
گپانی بکن شر باور — وش وقت نہ بیت هنئو سر
بد خلق اے جهان ءِ شوم اِنت — کلیں نیکیاں محروم انت
موزی ءِ مثالے زوم انت — گپے کہ دریئت گُنج توم انت
هنچو بدتبیں گوریچ ءَ — لگّیت هر کسی برریچ ءَ
گوریچ برکت انت گواتانی — صابون انت کشاراتانی
باغ ءُ نیوگ ءُ درهچان — هوش ءُ کوکر ءُ مچانی
درنگ ءُ بستگیں شیرانی — نیست ئےِ هچ وڑیں بیرانی
عیبے ظاهر انت طبیعات انت — تُرندی ءُ بدیں حالات اِنت
دوست ءُ دشمن ءِ شهمات انت — نامے بے دردیں خیرات انت
مردے گر بہ بیت شاهو کار — عالی همت ءُ نیک کردار

ھچ رنگ ءَ مہ بیت بد رفتار		روئے بد بہ بیت ءُ گفتار
ھر کس دوستی ءَ بیزار انت		کارئےِ مردم ءِ آزار انت
کوڑھیں طلابے کار انت		شخصے کیمت ئےِ عیبدار انت
نیست انت ھچ امیت یاریٔ ءِ		رازانی نگہداری ءِ
قولانی وفاداری ءِ		راجی دکواں کاری ءِ
گردی ماں جہان ءَ زھر انت		مات ئےِ مرتگ ءُ دل قہر انت
وشیں مجلساں بے بہر انت		جانی دشمن ئےِ ک شہر انت
حقانی گوشیت سوج ءُ سر		باور گر بکنت بختاور
شوم ءَ بدے تاج ئےِ سر		سرّ ایت چو خر ءَ نا سردر

☆☆☆

غزل

عنات اللہ قومی

مئے گلاباں مکش چو جوریگ ءَ
بام ءِ استالاں چو کہ پوریگ ءَ

اے منی مکہ ءِ بدل پنجگور
تو نہ بۓ چو قباد ءِ کوریگ ءَ

واہ ءُ زار انت ترا پہ ماھکان ءَ
ما دل اکیم چہ دستاں زوریگ ءَ

تنچتہ کرتہ مارا بے تاگت
مئے لگوری ءُ ترس ءَ جوریگ ءَ

اشکنگ ما ، تو غزنی بائیختگ
چنگلاں کپتگ ئے لگوریگ ءَ

محمد رفیق قادری

مروچی چم وت کیگد پہ نازے ننذگ ءَ دیستہ
چو ماہ ءَ چاردہ ءِ در آیگ ءُ گل ننذگ ءَ دیستہ

سیاھی جمبراں ، اَچ مھپر ءُ بیکاں تئ زرتگ
جڑک مُرواراں میل کت کہ لال اِش ھندگ ءَ دیستہ

سیاہ لنجیں شپاں پروانہ بے سُدی پہ شمع ءَ روت
کہ یک بر چو گریوک ءَ روت کل ءِ سر رندگ ءَ دیستہ

سر ءَ کشیت پہ مستاگ ءَ بام ءِ استال ھر سھب ءَ
جنک ریپ وش گل ءُ بال ایں مرید زندگ ءَ دیستہ

چگی چو وش توار جاک اِنت کہ وابیناناں کنت آگاہ
کروس ھم گٹ ءُ وش بانگ اِنت کہ لالے ننذگ ءَ دیستہ

یلانی تالہ ءُ آہان مروچی رنگ آورتگ
چہ مھریں کوٹواں ڈن ءُ در ءَ جم ننذگ ءَ دیستہ

پہ آئی گپ ءُ تراناں قادری منزل نہ بنت بُزّگ
اھوالاں چش ھدا بیاریت ، میان ءِ بندگ ءَ دیستہ

ترانگے

قابوس صدف

اِے چتوریں ترانگے کہ منی زرد ءَ مانداریت
برے ھار کنت چو کور ءَ دریں واھگاں پتاریت

کہ نہ روت دل ءِ تہاری پہ پنڈگ ءِ چراگاں
کسے گپتگیں چراگے وتی کڈک ءَ میاریت

وتی شار ءِ لمب ءَ پردےَ منی درد سر دراہاں
کہ گماں کسے مہ گندیت منی درداں کس مہ چاریت

تئی بھشت ترا مبارک منی دیدگاں منی کن
منی دلبر ءَ نہ بکشیت منی جنت ءَ لتاریت

اے دپا ءِ ملکموت اِنت کہ چہ زند ءِ سیاھیں ڈن ءَ
مئے تماہاں تراس دنت ءُ وتی پنجگاں شہاریت

لچہ

بانوریں زند

یوسف گمانی

زندگی بیا کہ ترا شات کناں
دھرءُ دنیا کہ تئی تب ءَ نہ کپنت
گواڑ گیس پل ترا مان نیاھاں
ساہءُ ساچان ءَ ترا راہ نہ دات
زندگی کس ءَ مئے گواہ نہ دات
کو چک ءُ کوہ ءُ تلاراں
ملپداں ھجگیں بہاراں
راہ سرءَ دوست ءِ ودارءَ
برے شپ ءُ برے سہارءَ
ترا نہ دیستگ دمے کرارءَ
تو چے نہ کرتگ تو چے نہ داتگ
ترا کجا چہ کجا نہ برتگ
اے زندگی تو انگت ءَ زنگ جن ئے
تو کجا سندءِ ساہ ءَ گارئے
دمے تاھیر نہ یتگ
تو منی زندئے چو من ءَ شات نہ بئے
بیا کہ ترا دیاں دگہ دنیایے
مرگ ءَ سالونک کناں
موتک جناں زار کناں
زندگی بیا کہ ترا بانور کناں
زندگی بیا کہ ترا شات کنان
زندگی بیا کہ ترا آزات کناں

چند بلوچی محاورے

بلوچی زبان میں محاورے(Proverb) کو بہت سلیس و آسان ہونے کی بنا پر خاص اہمیت حاصل ہے۔ جسکا استعمال عام وقتوں میں عالم و دانہ کثرت سے کرتے ہیں۔ جو کہ سماج و معاشرے کی فلاح و بہتری، سبق آموز ماضی اور مستقبل کے حوالے سے کافی بامعنی ہوتے ہیں۔

☆ چو کہ میر و ءِلڑ ءَ گنداں بالکتر گورانی چراگ جاہ اِنت

☆ پادینک ماہرءِ پادءَ دُر ماگر بگ ءِ گوش ءَ

☆

☆ مرد پہ نام ءَ مریت نامرد پہ نان ءَ

اچھا انسان اپنی عزت اور گھٹیا اپنے پیٹ کی فکر میں لگا رہتا ہے۔

☆ جو ہر بلوچ ءِ غیرت اِنت

غیرت و خودداری بلوچ کا جوہر ہے۔

☆ دروگ پہ مرداں عیب اِنت۔

جھوٹ مرد کیلئے باعث عیب اور عار ہے۔

☆ مرد ءِ سر بروت و قول مروت۔

مرد اپنا سر کٹا دیتا ہے مگر قول سے نہیں پھرتا۔

☆ مرد ءِ سر روت قول نہ روت۔

مرد اپنی جان دیتا ہے مگر عہد شکنی نہیں کرتی۔

☆ سوار پیادگ ءِ ھال ءَ چے زانت

سوار کو پیدل چلنے والے کی کیا خبر

☆ مہ مراِت میشاں کہ بھارُ دایت

کاش، ساون کے مہینے تک بھیڑ یں بچ جائیں

☆ گژن گوں مزارءَ میڑا ینیت

بھوکا آدمی شیر سے لڑتا ہے

☆ مزارانی جاہ تو لغاں گپتگ

شیروں کی جگہ اب گیدڑوں نے لے لی

جنگ اور امن کیلئے بلوچوں کے اپنے نظریات ہیں۔ وہ جنگ کو اپنی حفاظت اور خود مختاری کیلئے آخری کوشش سمجھتے ہیں۔ اور امن کو نہ صرف اپنے بلکہ عالم انسانیت کیلئے رحمت تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنگ صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ مخالف شرارت ورواداری کی کوئی بات سننے کیلئے تیار نہ ہو اور وہ اپنی طاقت کے نشے میں مست ہو اپنے حق کیلئے لڑنا جائز ہے۔

☆ وش نہ انت جنگانی بدیں بولی، کئے وتی دوستیں مرد ماں رولی

جنگ کی بری بات مت کرو، کون اپنے مال ومتاع اور اپنے آدمی برباد کرے

☆ جنگاں سادھے بیت ایں، سیوی برتحت رنداں

جنگ میں اگر بھلائی ہوتی، تو رندوں سے سیوی کا تخت نہ جاتا

پنجگور کے چند علاقے/مقامات/دریاء

بشام(Bisham): یونین کونسل وشبود کے علاقے زنڈیں داز کے مغربی جانب بشام ندی کے ساتھ واقع ہے اس کے حدود میں واقع تفریحی مقام نوک آپی میں کافی مقدار میں پانی دستیاب ہوتی ہے۔

بزبان(Bizban): دریائے رخشان کے جنوب میں ایک مشہور ندی ہے جس کے درمیان واقع وسطی مکران کی پہاڑیں، بندات اور گھنے جنگلات ہیں۔

پسکول(Piskole): یہ دریا خدابادان کو تسپ کے علاقے سے جدا کرتی ہے۔ کوہ سیاہان کے مختلف ندی نالوں کو ملا کر دریائے رخشان میں شامل ہوتی ہے۔

پاردان(Pardan): دریاء پاردان شمال میں دریائے رخشان میں آ کر شامل ہوتی ہے۔اس دریا پر پاردان ڈیم بھی تعمیر کی گئی ہے۔

پاردانی نل(Pardani Nall): پنجگور کے شمال میں واقع ایک تفریحی مقام ہے۔

پزیان(Puzziyan): یونین کونسل گوارگو میں واقع ایک ڈیم ومشہور مقام ہے۔

پرپکی(Perpuki): یونین کونسل گچک میں واقع ایک منتشر آبادی والا علاقہ ہے۔

پلکی(Pulkee): اسی دریا کے نام پر یونین کونسل گچک میں واقع علاقہ

پلوہی(Puluhi): شمال مشرق میں واقع ایک ندی ہے۔

پگنزک(Pugunzuk): یونین کونسل کلگ کے حدود میں واقع ایک غیر آباد علاقہ ہے۔

تنک شودی(Tank Shudi): تنک شودی کے نام پر مشہور علاقہ اور دریائے کچک کا معاون دریا ہے۔

تو لگی(Tolagi): یہ دریا تولگی کے نام پر مشہور ہے جو جنوب مشرق سے دریائے گوارگو میں شامل ہوتی ہے۔

تالاں کڈ(Tallan Kadh): گھنے جنگلات کے حوالے سے مشہور علاقہ ہے۔

جوری(Jorri): یہ مقام دریا جنوب مشرق سے دریائے رخشان جنوب سے دریائے کچک میں شامل ہوتی ہے۔

جوان تاک(Juhan Tak): کچک کا ایک مشہور دریا ہے وافر مقدار میں مچھلیاں اور اردگرد گھنے جنگلات ہوتے ہیں۔

جاڑو چاہی(Jado Chahee): یہ معاون دریا وسطیٰ مکران کے شمال سے جنوب میں دریائے کچک میں شامل ہوتی ہے۔

پگنز شاں(Pugunz Shan): گھنے جنگلات پر مبنی علاقہ ہے دریاء پگنز شاں شمال میں دریائے رخشان میں شامل ہوتی ہے۔

چاہی(Chahee): شمال مشرق کی جانب ایک معاون دریا ہے۔

چینڈی(Chendi): شمال کی جانب ایک معاون دریاء ہے جو کہ رخشان میں آکر شامل ہوتی ہے۔

ہیتک(Hetak): دریائے رخشان کا ایک چھوٹا معاون ندی ہے۔

ہیرئی کڈ(Harai Kadh): یہ پہاڑی دامنوں کے مختلف برساتی نالوں کو ملا کر دریائے رخشان میں آکر گرتی ہے۔

دیم دیدار(Demdidar): ایک چھوٹا معاون دریا ہے۔

دازکی شیپ (Dazki Shep): شمال میں واقع ایک ندی ہے۔

دراکوپ (Dara Kupe): دو اہم پہاڑوں کے دامن میں واقع گچک کا علاقہ ہے۔

ڈاک نگور (Dak Nigore): یونین کونسل گوارگو کا زرعی علاقہ ہے جہاں بڑے بڑے زرعی بندات ہیں۔

زرآپک (Zirapk): میدانی علاقہ اور معاون ندی ہے۔

زروگر (Zaru Gar): ایک چھوٹا سا ندی ہے۔

روتک (Ruteck):

سبزکوہ (Sabz Koh): یہ ایک وسیع پہاڑی سلسلہ جو پنجگور کو خاران اور واشک سے جدا کرتی ہے۔ یہ یونین کونسل کلگ میں واقع ہے۔

سورگ (Sorag): یونین کونسل عیسیٰ کا قدیم علاقہ جواب غیر آباد ہے۔

سیدان (Sidan): ایک پہاڑی اور غیر ہموار علاقہ ہے۔

سنگی قلات (Sangi Kallat): گوارگو میں واقع ایک گاؤں ہے۔

سہتہ کنر (Suhta Kunar): گوارگو میں واقع زرعی اور منتشر آبادی والا علاقہ ہے۔

سندے سر (Sanday Sar): عیسیٰ میں واقع ایک علاقہ ہے۔

سرآپ (Sar Aap): یونین کونسل گوارگو کے آخری علاقہ ہے۔

سرگوز (Sar Goaz): یونین کانسل گچک کا ایک زرعی علاقہ ہے۔

ساکائی قلات (Sakai Kallat): ساکائی قلات (قلعہ) گچک میں واقع۔ جہاں ساکازئی قبیلہ کے سربراہ کا قدیم قلعہ ہے۔

سردارچاہ (Sardar e Chah): وشبود میں واقع ایک دیہاتی علاقہ ہے۔

سورآپ (Sorap): کلگ کے مغربی طرف واقع ایک گاؤں بھی ہے۔ پنجگور مین روڈ پر واقع ہے۔ جس میں ایک مشہور ڈیم بھی ہے۔

سبز آپ(Sabzap): وشبود میں واقع علاقہ ہے۔ جو پنجگور کو ضلع واشک سے ملاتی ہے۔

سنگیں قلات(Singee Kalat): ایک چھوٹا سا دیہاتی علاقہ ہے۔

سیدءِ کور(Sayad-e-Kore): یونین کونسل گوار گو میں واقع معاون دریا ہے جو جنوب میں دریائے رخشان میں آ کر شامل ہوتی ہے۔

سولنگی(Solangi): گھنے جنگلات والا علاقہ ہے۔

سولی(Solee): جنگلات کے علاوہ ندی نالوں پر مشتمل علاقہ ہے۔

سوروشاں(Sorwashan): شمال مشرقی جانب واقع جنگلات پر مبنی علاقہ ہے جو کہ دریائے رخشان کا معاون دریا ہے۔

سلاری(Silari): ایک زرعی علاقہ ہے جو یونین کونسل گچک کے حدود میں واقع ہے۔

شکر چب(Shakar Chib): یہ اہم دریائے شمال مشرق سے کوہ سیاہان کے مختلف ندی نالوں کو ملا کر دریائے رخشان میں شامل ہو جاتی ہے۔

شیرو کاسگ(Shero Kasag): دریا پاردان کے شمال میں واقع ایک تفریحی مقام ہے۔

فتح علی بازار(Fateh Ali Bazar): گوار گو میں واقع ایک گنجان آبادی والا علاقہ ہے۔

کاشی(Kashi): کاشی ءِ کور مشہور علاقہ ہے جو اسی ندی کے نام پر منسوب ہے۔

کاٹاگری(Katagari): قومی شاہراہ کے مغرب میں یونین کونسل گوار گو کا مرکزی علاقہ ہے۔

کانیان(Kaniyan): ایک پہاڑی دامن چھوٹا ندی و پکنک پوائنٹ و تفریحی مقام ہے۔

کڈکی(kadakee): ایک چھوٹا معاون دریا ہے۔

کلری(Kalaree): یونین کونسل کچک کا بلند ترین مقام ہے اس کے دامن کچک ڈیم بھی ہے۔

کنگر(Kungur): ایک ندی نما دریا ہے۔

کلاتک(Kalatuk): یہ معاون ندی ہے جو دریائے رخشان میں آ کر شامل ہوتی ہے۔

کھوردان(Kahur Dan): گھنے جنگلات والا دور آفتادہ علاقہ ہے۔

کمبری(Qambari): دریائے رخشان میں شامل ہونے والا معاون ندی ہے۔

گینگان(Genagan): یہ مختلف پہاڑوں کے بارانی پانیوں کو ملا کر شمال جنوب میں دریائے رخشان میں شامل ہوتی ہے۔

گلی(Gilee): دریائے رخشان کے شمال میں ایک معاون دریا ہے جو یونین کونسل وشبود کے حدود میں واقع ہے۔

گونکی(Guwanakee): شمال کی جانب ایک علاقہ ہے جو اسی ندی کے نام پر منسوب ہے۔

گورکادان(Gurkadan)

گوئی(Gaie): شمال میں واقع ندی ہے جو وشبود کے آبادی کے درمیان میں واقع ہے۔

گزی(Gazee): اس ندی کے ارد گرد وسیع جنگلات ہیں۔

گینگو(Ginago): مشہور پہاڑی علاقہ ہے یہ شمال میں دریائے رخشان کا معاون ندی ہے۔

گیتانی(Getani): مشہور پہاڑی علاقہ ہے یہ شمال میں دریائے رخشان کا معاون ندی ہے۔

گلوکان(Galukan): ایک چھوٹا سا ندی اور اس کے ارد گرد کے جنگلات میں پیش کونر وغیرہ زیادہ پائے جاتے ہیں۔

گرانڈی(Gurandi): شمال کی جانب دریائے رخشان کا معاون ندی ہے۔

گری(Gari): ایک چھوٹا ندی ہے۔

مورتان(Murtan): بی بی مورتی کے نام پر گوارگو کے حدود میں واقع علاقہ ہے۔

مکوءِ ڈن(Maku-e-Dan): ایک میدانی اور بلندی پر واقع علاقہ ہے۔

میرانی شیپ(Mirani Shep): مختلف بارانی پانیوں کے ساتھ لے کر رخشان میں شامل ہوتی ہے۔

مک(Mak): دریائے گچک کے شمال مشرق میں شامل ہونے والا ندی ہے۔

میاکاشی(Miyakashi): ایک چھوٹا سا دریا ہے جو گچک کا معاون ندی ہے۔

نرمگ(Narmag): گوارگو میں واقع ندی ہے جو شمال جنوب دریائے رخشان میں شامل ہوتی ہے۔

سوراپ(Surap): سوراپ دریا پر ڈیم تعمیر کی گئی ہے۔ کوہ سیاہان کی چھوٹی بڑی دریاؤں ندی نالوں کی بارانی پانی جنوب میں دریائے رخشان میں شامل ہوتے ہیں اور شمال میں پلنتاک و پودکاش کے دریاؤں میں گرتے ہیں۔

بندکین(Bandkain): یونین کونسل پروم میں واقع ایک قدیم گاؤں ہے۔

برشونکی(Barshonki): یہ ایک دیہاتی علاقہ ہے جو دشت شہباز میں واقع ہے۔

بیراندر(Birandar): یونیں کونسل سوردو کے حدود میں واقع ہے۔

پیشی دپ(Peshi Dap): گوارگو میں واقع ایک گاؤں کا نام ہے۔

پنچی(Panchi): تسپ مغربی میں واقع گنجان آبادی والا علاقہ ہے۔

پیرعمر(Peer Umar): یہ پنجگور کا اہم علاقہ ہے جس میں مشہور بزرگ پیر عمر کا مقبرہ موجود ہے۔

تاسے ڈن(Tasay Dan): تحصیل گوارگو میں واقع ایک زرعی علاقہ ہے۔

جا ئین(Jaheen): یونین کونسل پروم کا اہم وقدیم مرکزی گاؤں ہے۔

چب(Chib): کچک کے آخری دہانے پر واقع پنجگور کو ضلع آواران سے ملاتی ہے

دز پروم(Diz Paroom): پروم میں واقع اہم گنجان آبادی والا و مرکزی گاؤں ہے۔

درگ ءِ دپ(Darag e Dap): دریائے گوار گو کے کنارے پر واقع ہے۔

دازی(Dazi): بونستان کا دیہی علاقہ ہے۔

دز ناپ(Duznap): یونین کونسل عیسیٰ کا گاؤں ہے۔

دملی(Damli): کچک میں واقع ہے۔

ڈمب (Damb): پنجگور کا ایک مشہور دور آفتادہ علاقہ جو یونین کونسل تسپ مغربی میں واقع ہے۔

ریش پیش(Reesh Peesh): پروم میں واقع ایک کم آبادی والے علاقے کا نام ہے۔

راہی نگور(Rahi Nigor): ایک مشہور گاؤں کا نام ہے۔

زنڈیں داز(Zandain Daz): یونین کونسل وشبود میں واقع ایک زرعی وتفریحی مقام ہے۔

شے حسن(Shay Hassan): کلگ کے علاقے میں واقع ایک بزرگ شے حسن کے نام پر ایک گاؤں ہے۔

شاپاتان(Sapatan): یونین کونسل چتکان میں واقع ایک گنجان آبادی والا علاقہ ہے۔

شکرک(Shakruk): کچک میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

فیل کوہ(Feel Koah): ایران کے ساتھ منسلک ایک دیہی علاقہ ہے۔

کلہ کور(Kalla Kore): پروم میں واقع ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔

کلاں(Kullan): گوارگو میں واقع ایک زرعی ومیدانی علاقہ ہے۔

کرک ءِڈل(Kark e Dal): گچک میں واقع ایک زرعی ومیدانی علاقہ ہے۔

گروگ:(Grawag): یہ دریائے ماشکیل کے کنارے واقع ایک خوبصورت وادی ہے۔

گواش:(Guwash) پروم میں واقع ایک چھوٹا سا دیہی علاقہ ہے۔

گونی:(Guni): دریائے گچک کے ساتھ واقع تحصیل گوارگو کا علاقہ ہے۔

گوران:(Gurane): پہاڑی ودشوار گزار علاقہ جو دریائے گچک کے ساتھ واقع ہے۔

گومازی:(Gumazi): بالگتر میں واقع ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔

لوہڑی:(Lohri): گچک میں واقع ایک زرعی علاقہ ہے۔

لکی:(Luky): ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

مرگ آپ:(Murgap): سوردو یونین کونسل کی حدود میں واقع ایک تفریحی شکارگاہ ہے۔

مکہ:(Makka): یونین کونسل کیلکور میں واقع ایک علاقہ ہے۔

مجبورآباد:(Majbur abad): بونستان میں واقع ایک نئی آبادی ہے۔

مژدالو:(Mazdalu): پنجگور فارم ٹو مارکیٹ روڈ کے ساتھ واقع گوارگو کا اہم علاقہ ہے۔

نکر:(Nukur): ایران کے ساتھ ایک سرحدی علاقہ ہے۔

نگور:(Niguore): ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔

ہتک:(Hatak): گوارگو میں واقع علاقہ ہے۔

جڑی بوٹیاں

ازگند(Izzgind): سینہ کا درد، زکام وغیرہ میں چائے کی طرح ابال کر استعمال کرتے ہیں۔

اپوتک(Aputaq) عام وقتوں میں صحت کو برقرار رکھنے کیلیئے استعمال کی جاتی ہے۔

اپرز(Apurz): بچوں کے خسرہ کا علاج

ایژرک(Isherk): دوائے چشم آشوب

ازبوتک(Izbothk): اسہال کے علاج کیلیئے مفید درددل کی دوا

اسپنتان(Ispantan): اس کے بیجوں کو آگ میں ڈال کر بھوت پریت کا انسداد کرتے ہیں۔

پنیرباد(Paner Bad): دست اور معدے کیلیئے مفید دوا ہے۔

ترات(Trath): جسم پر دانے نکلنے اور الرجی کیلیئے مفید دوا ہے۔

تلاری زامر(Talari Zamur):

سموک(Seemsok): سانپ کے کاٹے کا علاج

کلپورگ(Kalporag): درددل کی دوا

گندر(Gindar): ملیریا یا بخار کی دوا

ہلجور(Haljor): آنکھ کے زخم وغیرہ کی دوا

بوئے مادران(Boh e Madran): بوئے مادران (مور) برائے سکون مزاج

ترشپک(Tarshpuk): سردی لگنے سے بیمار ہونے کی دوا وٹامن بی سے ذائقے کی حامل ہے۔

درنہ(Darana): بچوں میں پیٹ درد و گیس کیلئے مفید ہے۔

سورگو(Suragu):ان کے پتے اونٹوں اور بکریوں کے چارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

کریچ(Kerach): معدے کے علاج اور لکڑی کے طور پر جلانے کیلئے استعمال ہوتی ہے۔

گُردر(Gurder): بخار اور خاص کر ملیریا کے دوا کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

گواتگ(Gawatag): بچوں میں گیس کیلئے مفید ہے۔

گلگل(Gulgul): دانت میں درد اور دانوں کے علاج کیلئے مفید ہے۔

مورپڑو(Morpuzo): یہ بچوں میں دست کے دوا کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

نریان بند(Naryan Band) ذیابیطیس اور یرقان کے علاج کیلئے دوا ہے۔

کجھور کے اقسام

مزاتی: (Muzati) یہ ایک مشہور وذائقہ دار کجھور کی قسم ہے۔ یہ کالے رنگ اور بڑے دانہ دار ہوتا ہے۔

جان سہر: (Jansur) سب سے پہلے پکنے اور تیار ہونے والا کجھور ہے۔ سب امتیاز یہ ہے کہ پنجگور کے علاوہ اس قسم کی کجھور کہیں نہیں ہوتا۔

سبزو: (Sabzo) یہ زرد رنگ کا کجھور ہے جو آدھا کچہ اور آدھا پکہ ہونے کی صورت بہت ہی لذیذ وذائقہ دار ہوتا ہے۔ اور پانی میں ابھال کرا سے خشک کیا جاتا ہے۔ جسے بلوچی میں ہارک کہتے ہیں۔

کلوت: (Kalute) زرد، اور بڑے دانہ دار اور لذیذ ذائقہ دار ہوتی ہے۔

ہلینی: (Halini) یہ زرد رنگ کے ہوتے ہیں اسے ذائقہ اور لذیز ہونے پ کچا ہی کھایا جاتا ہے۔

کہربا: (Kahraba) کہربا کجھور اس علاقے کی ایک خاص پہچان وشناخت ہیں اور کہربا ہی سے شیرگی جس کا تذکرہ قدیم زمانے میں لافید کے نام سے کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ شیرگی سے موزاتی کی ایک خاص ذائقہ دار مشہور قسم ہنسی تیار کی جاتی ہے۔

ربی: (Rabai) ایک نازک قسم کی کجھور بہت ذائقہ دار اور پکنے کے بعد جلد ہی ختم ہوجاتی ہے۔

وش کلونٹ: (Washklunte) زردی مائل سفید، نایاب لذیز ذائقہ

ھش کنچ: (Hushkinch) یہ درخت پکتے ہی خشک ہوجاتا ہے۔ پائیدار کجھور کی قسم ہے جس پر کسی بھی آب ہوا اثر نہیں کرتی۔

بیگم جنگی(Begam Jangi): پھل آپ دندان کی طرح، لیکن اسے زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔

پوستو(Posto): زرد، پیش ناہ جیسا، بدزائقہ نایاب

پپو(Papu): رنگ زرد، پنجگور میں پیداوار زیادہ دیتا ہے۔

پیش ناہ(Pesh Nah): زرد، جب پختہ ہوتا ہے تو سرخ، یہ سب سے پہلے پک کر تیار ہوتا ہے۔اس لئے اسے پیش ناہ (پڑ ناہ) بھی کہتے ہیں۔

پش پاگ(Pesh Pag): پھل زرد، نایاب کھجوروں سے نئی نسل، رنگ گہرا چھوٹا اور گول (بلوری ساخت) جنک ریپ

جوان زرد(Johan Zard): زرد رنگ کا خوش ذائقہ کھجور ہے، جو کافی مشہور ہے۔

جوزو(Jozo): روگنی جیسا نایاب، ذائقے میں پست

حلینی (Haleeni): آپ دندان کی طرح لیکن سائیز میں چھوٹا ہوتا ہے۔

دشتیاری(Dashtiyari): زرد آپ دندان سے چھوٹا، لیکن گھٹلی کافی موٹی ہوتی ہے۔

ڈنڈاری(Dandari): پھل زرد رنگ کا، آپ دندان سے مشابہت، لیکن سائیز میں لمبا اور پتلا اور گھٹلی بہت ہی چھوٹی ہوتی ہے۔اسے تازہ کھانے کے علاوہ سکھایا جاتا ہے۔

روگنی(Rogani): روگنی ایک قسم ہے۔، پھل روگنی سے چھوٹا

سیاہ کرز(sia Karz): پھل گونزلی نما، لیکن کم شیریں۔

شپگو (Shapgu): زرد پھل موٹائی میں چنگلی کے برابر ہوتا ہے۔اپنے نام کی طرح شپیگ کی طرح ہوتا ہے۔

شکری زرد(Shakari Zard): پھل زرد، مٹھاس بھری کھجور کی قسم ہے۔

شکری سرخ(Shakari Surkh): نام سے نمایاں سرخ رنگ، کافی مٹھاس بھری

ہے۔
شہری(Sheri): پھل ھارگی اور شنگش کند کی طرح اور زردی مائل سفید
کروچ(Kuroch): پھل زرد، سرخ، سرخی مائل زرد عام پایا جاتا ہے۔
حسینی(Hussani): جسامت میں کنگی جیسا، لیکن پتلا، زرد، ذائقہ میں پست
اس کے درخت کے تنے کو گھروں کی شہتیر کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔
کلوت(Kalute): زرد ، اور بڑے جسامت کا لذیذ پنجگور میں وافر مقدار میں پایا
جاتا ہے۔
کنرو(Kunro): زرد، گوزلی جیسا نایاب
کروچ سیاہ(Kuroch Siah): پھل زرد، سرخ، سرخی مائل، زرد عام پایا جاتا ہے۔
کلگی زرد(Kallagi Zard): انتہائی نایاب قسم ہے پھل بیگم جنگی کی طرح لیکن اس
سے بڑا ہوتا ہے۔
گوزلی(Gozali): پھل سیاہی مائل (ناسی) گول (بلوری) کثیر تعداد میں پایا جاتا ہے۔
لنگو(Lango): کروچ نسل، بدذائقہ
موزاتی(Mozati): سرخ، بش میں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچتا، جس کے متعلق یہ خیال
کیا جاتا ہے کہ موصل (عراق) سے لایا گیا ہے۔
وش کلونٹ(Wash Kulunt): زردی مائل سفید، نایاب، لذیذ ذائقہ
ہش کینچ(Hushkinch): پنجگور کے علاوہ ایرانی بلوچستان کے علاقے دزک میں
بھی پایا جاتا ہے یہ درخت پر ہی پکنے کے بعد خشک ہو جاتا ہے۔

موسم

جمل ءِ پل ءِ چلگ: اس موسم کا دورانیہ چالیس دنوں پر مشتمل ہوتا ہے جو یکم مارچ سے 10 اپریل تک ہوتا ہے۔

پاگ ءِ چلگ: یہ موسم گرما کے 11 اپریل سے 20 مئی تک کا ہوتا ہے۔

لیوار: یہ موسم گرما میں 21 مئی سے 30 جون تک گرم ہواؤں کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے۔

تیر بند: موسم خزان میں یکم جولائی تا 20 جولائی کو 20 ایام کا ہوتا ہے۔

سہیل: 11 اگست تا 20 ستمبر 40 ایام پر مشتمل ہوتی ہے۔

خشکیں چلگ: موسم سرما میں یکم نومبر سے 10 دسمبر تک 40 ایام کا ہے۔

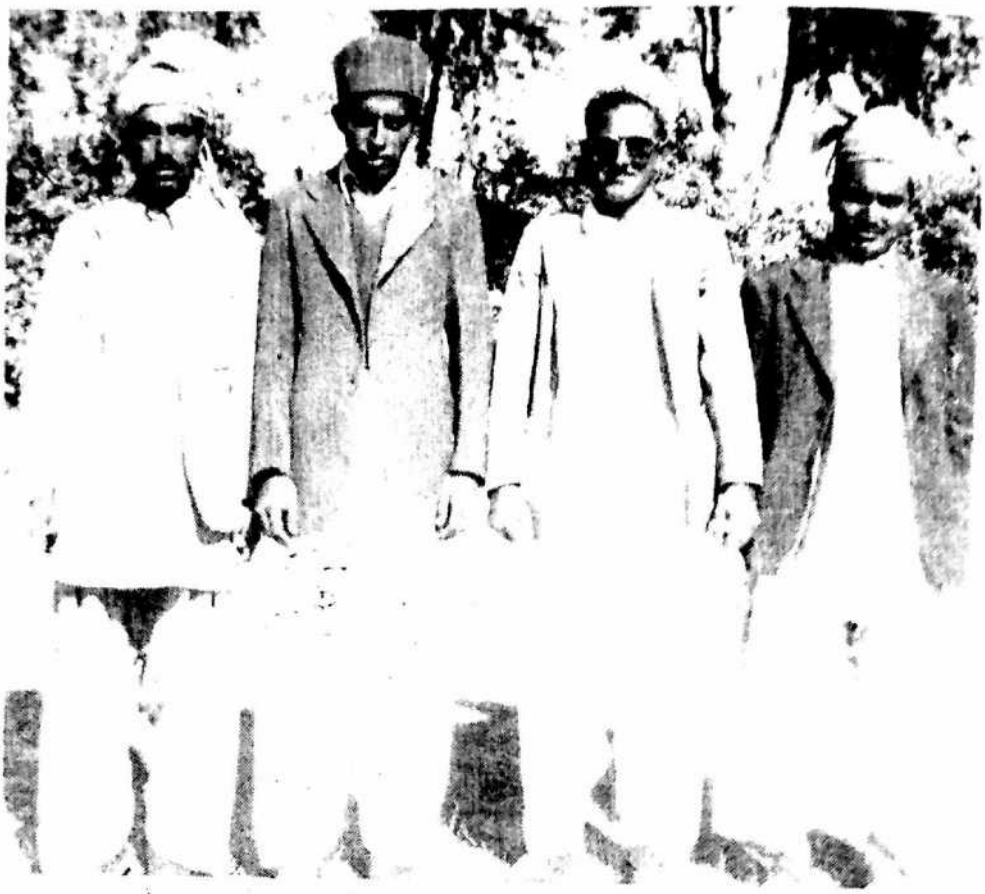
تریں چلگ: موسم سرما میں 11 دسمبر تا 20 جنوری تک ہوتی ہے۔

سیاہیں چلگ: 21 جنوری تا 30 فروری تک 40 ایام پر مشتمل ہوتی ہے۔

☆☆☆



مشہور شاعر فردوسی کا تہران میں واقعہ ایک خوبصورت مجسمہ



سید بہار شاہ آغا نصیر خان سردار سربلند گچکی حاجی محمد حسین مہماندار



سردار سربلند خان گچکی میر گل خان نصیر ملک فیض محمد میر غلام رسول گچکی میر غوث بخش بزنجو



کمسن محمد جان گچکی کا میر عنایت اللہ گچکی کے ساتھ ایک یادگار تصور



خالد بلوچ 1976 میں بلوچستان کے مردم خیز علاقے پنجگور (وشبود) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے ہی سے حاصل کی۔ گورنمنٹ ڈگری کالج پنجگور سے ایف ایس سی اور بی ایس سی کی اور بلوچستان یونیورسٹی سے انٹرنیشنل ریلیشن (آئی آر) اور سیاسیات (Political Science) میں ایم اے کی اور ایل ایل بی (LLB) کی ڈگری بھی حاصل کی۔

خالد بلوچ زمانہ طالب علمی ہی سے سیاست میں متحرک و فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

خالد بلوچ نے ایسے سماج میں آنکھ کھولی جہاں پر قومی احساس محرومی، نابرابری، بے بسی نمایاں اور ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔

انہوں نے سماجی نابرابری، قومی جبر و استحصال اور ظلم بربریت کے خلاف سیاسی وسماجی اور شعوری جدوجہد کیلئے قلم کا بھرپور سہارا لیکر ہمیشہ لڑنے کو ترجیح دی۔ اور اپنا الگ ومنفرد سوچ وفکر رکھتے ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے اسی راستے پر گامزن ہیں۔

خالد بلوچ مختلف اخبارات، جرائد ورسائل میں بلوچ سیاست، ادب وثقافت پر لکھتے رہے ہیں۔ اردو کے علاوہ بلوچی زبان کے بھی منفرد لکھاری ہیں۔ بلوچی ادب میں نثر کے علاوہ ان افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنا ایک الگ ومنفرد، جداو یکتاء اسلوب رکھتے ہیں۔

عزت اکیڈمی پنجگور

ISBN: 978-969-9812-00-2